مٹی کا بیٹا

کے اشرف

ضابطہ

ISBN: **978-1-4276-5026-9**

کتاب : مٹی کا بیٹا

مصنف : کے اشرف

سرورق : چارلس کینٹز

مطبع : سی ڈبلیو پرنٹرز

قیمت : 20 یو ایس ڈالرز

سی ڈبلیو پرنٹرز، 1375 یونیورسٹی ایونیو، برکلے، کیلیفورنیا

انتساب

زندگی کے نام

اظہار تشکر

نسل سوختہ کی طرح مٹی کا بیٹا بھی رائٹرز فورم اور سی آر ڈی پی فورم پر اقساط کی شکل میں تحریر کی گئی۔ میں دونوں فورموں کے تمام ممبران کا تہہ دل سے مشکور ہوں جن کی نظر نوازی اور مفید مشوروں سے یہ کہانی اپنی تکمیل کو پہنچی۔ میں اس کے لیے رائٹرز فورم کے ماڈریٹر منیر سامی اور سی آر ڈی پی کے ماڈریٹرز ڈاکٹر محمد تقی اور ڈاکٹر ناصر گوندل کا ممنون و مشکور ہوں۔ ان کے مسلسل تعاون کے باعث "مٹی کا بیٹا" نے تکمیل کے مراحل طے کئے۔

مٹی کا بیٹا کی مختلف قسطیں پڑھ کر جناب محسن نقوی، اے راہی، اور اعجاز سید صاحب نے جو مشورے دیے ان کے لیے میں ان کا تہہ دل سے ممنوں ہوں۔

آخر میں، میں ضروری خیال کرتا ہوں کہ اپنے انتہائی پیارے دوست کہانی نگار، ناول نگار، کالم نگار اور ڈرامہ نگار محمد منشا یاد کا شکریہ ادا کروں۔ ان کی مدد کے بغیر شاید یہ کتاب آپ کے ہاتھوں تک نہ پہنچتی۔

پیش گفتار

زندگی ہر حال میں جاری رہتی ہے۔ ازل سے ابد تک پھیلا زندگی کا یہ سلسلہ کبھی رکنے نہیں پاتا۔ اگر کبھی اس کی ایک شکل مٹتی ہے تو یہ دوسری شکل میں نمودار ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس وسیع وبسیط کائنات میں کسی ایک سیارے پر کسی کائناتی حادثے کے نتیجے میں اس کی راہیں مسدود ہو جائیں تو یہ کسی اور سیارے پر ہجرت کر جاتی ہے۔ ٹائم اور سپیس اس کی دو قلمرویں ہیں جن کے ذریعے یہ اپنی رنگارنگی اور بوقلمونی کا سلسلہ جاری رکھتی ہے۔

معاشرہ، رسم ورواج، کاروبار، مذہب، ثقافت، ادب، آرٹ، تہذیب، سیاست اور ریاست زندگی کے اس عمل کے شاہکار ہیں۔

مزدور، کسان، فقیر، امیر، سرمایہ دار، دوکاندار، ڈاکٹر، انجنیر، ولی، پیغمبر، سیاست دان اور کہانی نگار اس کے چند کردار ہیں۔

ان کرداروں کے آنسو، آہیں، تڑپنا، سسکنا، دکھ جھیلنا، اپنے مقاصد کے لیے جدوجہد کرنا، ناکامیوں پر آنسو بہانا اور کامیابیوں پر خوشی سے قہقھے لگانا یا شادیانے بجانا اس کے وہ مظاہر ہیں جس سے اس کا سلسلہ بہر حال رواں دواں رہتا ہے۔

ہم انسان کبھی مذہب کے نام پر، کبھی سیاست کے نام پر، کبھی آرٹ کے نام پر اور کبھی ریاست کے نام پر زندگی کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں اور اس طرح اس کا جس طرح حلیہ بگاڑتے ہیں اور زندگی کے بڑے مقاصد سے روگردانی کرتے ہیں مٹی کا بیٹا انہی آویزشوں کی داستان ہے۔

اس داستان میں زندگی پاکستان کے ایک عام سے گاؤں سے لیکر امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں جس طرح اپنی جلوہ گری کرتی ہے اس کے کئی مناظر قاری کو پڑھنے اور چشم تصور سے دیکھنے میں مدد ملتی ہے۔ "

مٹی کا بیٹا" میں پیش کئے گئے ان مناظر سے وہ زندگی کے سماجی پہلوؤں کو اس کے ارتقا کی دو سطحوں پر بیک وقت دیکھ اور سمجھ سکتا ہے۔

ایک معاشرہ زندگی کی ایسی ارتقائی منزل پر ہے جہاں مذہب اور مذہبی اقدار زندگی کی اہم حقیقتیں ہیں۔ جہاں انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک زندہ رہنے کا حق صرف اسے ملتا ہے جو مذہبی اقدار کی پیروی کرتا ہے۔

دوسرا معاشرہ مذہب اور مذہبی اقدار سے مکمل طور پر آزاد ہو چکا ہے۔ وہاں مذہبی اقدار اہم نہیں۔ تاہم اس معاشرے کے اپنے مسائل ہیں جن سے اس معاشرے میں زندگی کرنے والوں کو بہر صورت نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

اگر "مٹی کا بیٹا" پڑھنے کے بعد میری یہ کاوش آپ کو پسند آئے تو ازراہ کرم مجھے اپنی رائے سے ضرور نوازیں۔

کے اشرف
1375 یونیورسٹی ایونیو
برکلے، سی اے، 94702
یو ایس اے
Email: kashraf@ix.netcom.com
28 مئی 2010

فصل 1

شیر و کمہار کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہ بہت خوش تھا۔ حلوائی کی دوکان سے مٹھائی منگوا کر گھر کے دروازے کے باہر چارپائی ڈال کر بیٹھا ہر آنے جانے والے کو مٹھائی کھلا تا اور پھر سینہ پھلا کر انہیں بتاتا کہ اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔

"ارے شیر و شادی کے دس سال بعد ایک بیٹا پیدا کر کے تم نے کیا تیر مارا ہے۔ کرنا ہی تھا تو دو چار بیٹے ایک ساتھ پیدا کرتا تو کوئی بات بھی تھی۔" چوہدری نثار نے لڈو منہ میں ڈالتے ہوئے شیر و پر ٹانٹ کی۔

"چوہدری میری جورو عورت ہے کوئی سانڈھنی نہیں جو دو چار بچوں کو ایک ساتھ جنم دیتی۔"

"سانڈھنیاں تو ایک وقت میں ایک ہی بچے کو جنم دیتی ہیں البتہ عورتیں اگر ان کے مرد تنگڑے ہوں تو بعض اوقات دو دو بچوں کو جنم دیتی ہیں۔ اگر تیری جورو دس سال بعد بچہ جننے پر آئی تھی تو دو تین جن دیتی تو کیا برائی تھی؟"

"چوہدری میں اسی میں خوش ہوں۔ میں تو سوچتا تھا پرائے کندھوں پر قبرستان جاؤں گا۔ اب بیٹا پیدا ہوا ہے تو مجھے لگ رہا ہے میرا بھی کوئی وارث ہے۔"

"تیرے پاس ہے کیا۔ چند گدھے، مٹی کے برتن بنانے والا ایک چاک، اور ایک مرلے کا یہ کچا مکان۔"

"چوہدری تم نے کونسا یہ سب زمینیں خود خریدی ہیں۔ اپنے آباواجداد کی دولت پر چوہدری بنے پھرتے ہو اگر خود اپنی محنت سے زمین دار بنتے تو کوئی بات بھی ہوتی۔"

شیر و کمہار اور چوہدری نثار بچپن کے ان دنوں سے ایک دوسرے کے دوست تھے جب نہ شیر و کو کمہار کا بیٹا ہونے کا شعور تھا اور نہ چوہدری نثار کو گاؤں کے چوہدری کا۔

وقت کے ساتھ ساتھ دونوں کو اپنے خاندانوں کے سماجی مرتبے کے فرق کا احساس ہونے لگا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ شعور کی اس سطح تک پہنچتے ان میں دوستی کا ایک رشتہ قائم ہو چکا تھا۔

شروع شروع میں جب شیرو کمہار اور چوہدری نثار اکٹھے گھومتے پھرتے تو دونوں کے والدین انہیں دبے لفظوں میں ان کے سماجی اور معاشی مرتبے کا فرق سمجھانے کی کوشش کرتے۔

شیرو کمہار کا باپ محمدو کمہار اسے کہتا:

"شیرو تم اپنے جیسے بچوں کے ساتھ گھوما پھرا کرو۔ چوہدریوں کے لڑکے کے ساتھ تمہارا گھومنا ٹھیک نہیں۔ وہ بڑے لوگ ہیں۔ ہمیں ان سے دور رہنا چاہیے۔"

"باپو لیکن نسرے نے تو کبھی ایسا کچھ نہیں کہا جس سے دکھے کہ وہ بڑا آدمی ہے۔ اور پھر بڑے آدمی کون ہوتے ہیں۔ نسرے کی دو آنکھیں، دو کان، دو ہاتھ، دو ٹانگیں اور ان سب کے اوپر ایک سر ہے۔ اور میں بھی ایسا ہی ہوں۔ میری بھی دو آنکھیں، دو کان، دو ہاتھ اور دو ٹانگیں اور اس سب کے اوپر ایک سر ہے۔ پھر وہ بڑا آدمی کیسے اور میں چھوٹا کیسے ہوں؟"

محمدو کمہار اپنے بیٹے کی ایسی باتوں سے زچ آجاتا تو اسے ڈانٹ دیتا۔

"تم وہ کرو جو میں کہتا ہوں۔ میرے ساتھ اس طرح کج بحثی مت کیا کرو۔"

"اچھا باپو۔ اب نسرا آیا تو میں اسے کہہ دوں گا کہ وہ بڑا آدمی ہے اور میں اس کے ساتھ کہیں نہیں جا سکتا۔"

"نہیں اس طرح نہیں کہنا۔ وہ برا مان جائے گا۔ یا بڑے صاحب سے کہہ دے گا تو مشکل پیدا ہو جائے گی۔"

"تو پھر کیسے کہوں کہ میں اس کے ساتھ گھومنے نہیں جا سکتا؟" شیرو پریشاں ہو کر پوچھتا۔

"تم کہنا تمہاری طبعیت ٹھیک نہیں۔ ایک دوبار بہانہ کرو گے تو وہ خود سمجھ جائے گا اور پھر تمیں کبھی ملنے نہیں آئے گا۔"

"بابو یہ نہیں ہو گا۔ ایک تو میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ دوسرے اگر میں نے اسے کہامیری طبعیت خراب ہے تو وہ اور زیادہ آئے گا۔ پھر میں اتنا عرصہ بیمار رہنے کا بہانہ کیسے کروں گا؟"

اپنے بیٹے کی بات سن کر محمد و کمہار اور پریشان ہو جاتا۔ اسے سمجھ نہ آتی کہ وہ اسے کیسے سمجھائے۔

دوسری طرف چوہدری نثار کے والد کا بھی یہی حال تھا۔ بڑے چوہدری صاحب گاؤں کے نمبر دار تھے۔ بڑے بڑے لوگوں کا ان کے ہاں آنا جانا تھا۔

بچپن میں تو اور بات تھی لیکن اب نثار سیانا ہونے لگا تھا اور انہیں اس کا شیر و کمہار کے ساتھ گھومنا پھرنا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ انہوں نے اسے سمجھایا کہ وہ شیر و کمہار سے دوستی ختم کر دے لیکن ان دونوں میں کچھ ایسا انس تھا کہ جتنا ان کے والدین انہیں منع کرتے وہ دونوں اتنا زیادہ اکٹھے وقت گزارتے۔

دونوں میں کوئی ایسی مشترکہ بات بھی نہیں تھی۔ بس روزانہ ملنا ان کی عادت تھی اور اگر ایک بار عادت ہو جائے، اچھی یا بری، تو اس سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ شیر و کمہار چوہدری نثار کی عادت تھا اور چوہدری نثار شیر و کمہار کی۔ دونوں کے باپ چاہتے تھے کہ ان کو ایک دوسرے کی عادت نہ رہے لیکن عادت جاتے جاتے جاتی ہے۔

صرف یہی نہیں کہ دونوں میں سماجی اور معاشی طور پر بہت فرق تھا وقت کے ساتھ ساتھ دونوں کی زندگی کے دائروں میں بھی فرق آنے لگا تھا۔

شیر و کمہار صبح اٹھ کر پہلے گدھوں کو چارہ ڈالتا۔ اس کے بعد برتن بنانے کے لیے مٹی گوندھنے میں باپ کی مدد کرتا۔ پھر باپ کے لیے مٹی کے بوتے بناتا۔

اس کا باپ اس کے بنائے ہوئے بوتے چاک پر چڑھا کر چاک چلاتا تو بوتے برتنوں کی شکل میں ڈھلنے لگتے۔

شیر و کمہار کو اپنے باپ کا مٹی کے بوتوں سے برتن بنانا اتنا اچھا لگتا کہ بعض اوقات تھکاوٹ کے باوجود اس کا جی چاہتا کہ اس کا باپ چاک چلاتا رہے اور وہ مٹی کے بوتوں کو کبھی ہنڈیا، کبھی صراحی اور کبھی گھڑے کی شکل اختیار کرتے دیکھتا رہے۔
زندگی اسی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔ وقت کے ساتھ چوہدری نثار پڑھ لکھ کر وکیل بن چکا تھا اور شیر و کمہار اپنے باپ محمد و کمہار کے فوت ہونے کے بعد اپنے باپ کی جگہ بیٹھ کر مٹی کے بوتوں سے برتن بناتا جسے منڈی سے تاجر آ کر خرید لے جاتے جس سے اس کی زندگی کا کاروبار باآسانی چل رہا تھا۔ اس سے پہلے اس کا باپ اور اس کے باپ سے پہلے اس کا دادا بھی یہی کرتا تھا۔
شیر و اپنے کام اور سماجی حیثیت پر خاصہ مطمئن تھا۔ اس کی زندگی اس کے چھوٹے سے گھر کے گرد گھومتی تھی۔ کبھی کبھار کوئی اسے چھوٹی موٹی مزدوری کے لیے کہہ دیتا تو وہ بخوشی وہ کام کر دیتا جس کے عوض اسے کچھ رقم مل جاتی ورنہ اپنے روزمرہ کے معاملات میں مشغول رہتا۔
چوہدری نثار نے لاء میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد شہر میں لاء کی پریکٹس شروع کر رکھی تھی۔
اس کا معمول تھا وہ صبح اٹھ کر کچہری جاتا۔ دن بھر عدالتوں کے چکر کاٹتا اور دوپہر کے بعد گھر واپس آ کر ستانے کے بعد پیدل چلتا شیر و کمہار کے گھر جاتا اور اسے ساتھ لے کر پچھلے پہر چہل قدمی کے لیے نکل جاتا۔
گاؤں کے ساتھ ساتھ ایک ندیا بہتی تھی جو کہ نہر تک چلی جاتی تھی۔ دونوں ندیا کے کنارے چلتے دو تین میل دور واقع نہر تک جاتے اور پھر واپس لوٹ آتے۔
چہل قدمی کے دوران وہ دونوں اپنے بچپن کے دنوں کو یاد کرتے۔ گاؤں میں رونما ہونے والے روزمرہ کے واقعات کی تفصیل ایک دوسرے کو بتاتے۔
چوہدری نثار اپنے کیسوں کے بارے میں شیر و کمہار کو بتاتا کہ آج کس کیس کے سلسلے میں وہ کس جج کے سامنے پیش ہوا تھا اور جج کے ساتھ اس کا کیا مکالمہ ہوا تھا۔

چوہدری نثار کی قانون سے متعلق گفتگو سن کر شیر و کمہار ان پڑھ ہونے کے باوجود آدھا وکیل بن چکا تھا۔ اس کی دیہاتی دانش مندی بعض اوقات چوہدری نثار کو حیران کر دیتی۔ وہ جس سادگی کے ساتھ بڑے بڑے قانونی نقاط کی تشریح کرتا چوہدری نثار اس پر دنگ رہ جاتا۔

ایسے موقعوں پر وہ اکثر شیر و کمہار سے کہتا:

"یار شیر و تم سارا دن گدھوں کے ساتھ گدھوں کی طرح کام کرتے ہو یا چاک پر بیٹھے برتن بناتے رہتے ہو لیکن ایسی قانونی موشگافیاں کرتے ہو کہ میں وکیل ہو کر پریشان ہو جاتا ہوں۔"

جواب میں شیر و کمہار اسے کہتا:

"چوہدری لوگ سمجھتے ہیں کہ گدھا بیوقوف جانور ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ گدھا کتنا سیانا جانور ہے۔ باقی رہا قانون، جب تم نے لاَسکول جانا شروع کیا تھا روزانہ مجھے دن بھر کی کہانیاں سناتے تھے اور اب جب عدالت جاتے ہو تو اپنے کیسوں کی تفصیل بتاتے ہو اگر میں اب بھی قانونی باتیں نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا؟"

چوہدری نثار اس کی بات سن کر اسے چھیڑتا۔

" شیر و شکر ہے کہ تم اسکول نہیں گئے۔ اگر پڑھ لکھ جاتے تو پوری دنیا کو تگنی کا ناچ نچاتے۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ میں اسکول نہیں گیا۔ مجھے لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ لیکن کچھ پڑھائی میں نے بھی کی ہے۔"

" وہ کونسی پڑھائی ہے۔ مجھے بھی تو پتہ چلے۔" چوہدری نثار شیر و کو تنگ کرنے کے لیے پوچھتا۔

"کچھ پڑھائی تو میں نے گدھوں کے ساتھ وقت گزار کر کی ہے۔ میں نے گدھوں سے سیکھا ہے کہ صبر کیسے کیا جاتا ہے۔ گدھے بہت صابر ہوتے ہیں۔ میں نے گدھوں سے سیکھا ہے مستقل مزاجی کیا ہے۔ گدھے بہت مستقل مزاج ہوتے ہیں۔

دوسری پڑھائی میں نے بچپن میں اپنے والد سے برتن بنانے کا ہنر سیکھ کر کی تھی۔

چوہدری تم نہیں جانتے۔ جب میں مٹی کے بوتے کو چاک پر رکھتا ہوں تو اس کے ساتھ میرا مکالمہ شروع ہو جاتا ہے۔ بچپن میں جب میں اپنے باپ کے لیے مٹی کے بوتے بناتا تھا تو میرا باپ انہیں چاک پر رکھ کر جب کسی شکل میں ڈھالنے لگتا تو اس بوتے سے گفتگو شروع کر دیتا۔ اب میں بوتا بنا کر چاک پر رکھتا ہوں تو میرا اس کے ساتھ مکالمہ شروع ہو جاتا ہے۔

مکالمہ علم کی بنیاد ہے۔ اور وہ مکالمہ جو چاک پر رکھے اس مٹی کے بوتے کے ساتھ ہو جسے کوئی بھی شکل عطا کرنا میری منشا پر منحصر ہو اس میں جو دانش چھپی ہوتی ہے اس کا مقابلہ تو دنیا کا کوئی عالم نہں کر سکتا۔"

ایسی باتیں کرتے ان کی شام کی سیر مکمل ہوتی۔ ادھر سورج مغربی افق پر آخری کرنیں بکھیر تارات کی گود میں اترتا ادھر وہ سیر سے لوٹ کر گاؤں کی حدود میں واپس لوٹ آتے۔ اور اگلے دن دوبارہ شام کی سیر کے لیے ملنے کا وعدہ کر کے اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔

فصل 2

جمال پور پنجاب کے وسط میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ شیر و کمہار اور چوہدری نثار دونوں اسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ دونوں کے آباواجداد صدیوں سے اسی گاؤں میں اکٹھے رہ رہے تھے۔

جمال پور برصغیر کے روایتی گاؤں کی مکمل مثال تھا۔ ہر چیز میں خود کفیل۔ گاؤں کے ہر مکین کی زندگی کا ایک محدود دائرہ تھا جس میں ہر کوئی جی رہا تھا۔

فیکو موچی صبح اٹھ کر گاؤں کے چھوٹے سے بازار کے وسط میں آکر بیٹھ جاتا۔ بعد دوپہر تک وہاں بیٹھا ہر آنے جانے والے کے جوتے گانٹھتا۔ کوئی دو آنے کوئی چار آنے دے جاتا۔ پانچ چھ گھنٹوں بعد چند روپے جمع ہو جاتے تو وہ اپنی چھوٹی سی صندوقچی اٹھا کر بیٹھنے والی چوکی بغل میں دبائے گھر چلا جاتا۔

فیکو موچی سے تھوڑی دور منیر انائی ایک ایستادہ آئینے والی ٹیبل کے سامنے کرسی رکھے لوگوں کے بال کاٹتا، داڑھی بناتا، کبھی کبھار کسی نومولود لڑکے کی کھلو تراش کر اسے مسلمان بناتا اور گاہے بگاہے گاؤں میں منعقد ہونے والی شادیوں میں دیگیں چڑھا کر باراتیوں اور لڑکی والوں کے مہمانوں کے لیے کھانا تیار کرتا۔

بازار میں دو دوکانیں کریانے کی تھیں جن سے سارا گاؤں گھر کے لیے سودا سلف خریدتا۔ ایک حلوائی اور ایک قصاب کی دوکان تھی جن سے لوگ دودھ دہی اور گوشت خریدتے۔

ایک دوکان حکیم صاحب کی تھی۔ وہ بھی صبح سویرے دوکان پر آتے دوپہر تک وہاں رہتے پھر دوکان بند کر کے ظہر کی نماز ادا کرنے مسجد جاتے۔ نماز کے بعد دوپہر کا کھانا کھانے اور چند ساعتیں ستانے کے لیے گھر چلے جاتے اور پھر پچھلے پہر دو ڈھائی گھنٹے کے لیے دوکان کھول کر آنے والے مریضوں کو دوائیاں دیتے۔ مغرب کی اذان سے گھڑی بھر پہلے دوکان بند کر کے مسجد جا کر مغرب کی نماز ادا کرتے اور اس طرح ان کے دن بھر کے معمولات انجام کو پہنچتے۔ رات میں اگر گاؤں میں کوئی بیمار ہو جاتا تو وہ

مریض کو دیکھنے اس کے گھر چلے جاتے۔ مناسب دوا دیتے۔ جب مریض کو افاقہ محسوس ہوتا واپس گھر چلے جاتے۔

بازار میں پنساریوں کی دونوں دوکانیں اور حلوائی کی دوکان عشا کے بعد تک کھلی رہتیں۔ گاؤں میں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے سارے دوکان دار لالٹین کی بجائے گیس والا لمپ جلاتے جس میں مٹی کا تیل ڈالا جاتا۔ پھر اس میں لگے چھوٹے سے پمپ سے ہوا بھری جاتی جس سے مٹی کا تیل گیس میں تبدیل ہو کر لمپ کے اندر لگے ریشمی بلب کو تھوڑی سی آگ دکھانے سے روشن ہو جاتا اور لالٹین سے کہیں زیادہ روشنی دیتا۔

گاؤں کے زیادہ تر بچے اندھیرا چھانے کے بعد حلوائی اور پنساریوں کی دوکانوں کے آس پاس جمع ہو جاتے۔ اور تب تک کھیلتے رہتے جب تک پنساری اور حلوائی دوکان بند کر کے گھر جانے کے لیے تیار نہ ہو جاتے تھے۔

کبھی کبھار شیر و کمہار اور چوہدری نثار بھی کھانے کے بعد بازار آ جاتے اور حلوائی کی دوکان پر کھڑے ہو کر گرم دودھ میں جلیبیاں ڈال کر کھاتے۔

حلوائی کی دوکان پر شام کے بعد لوگوں کا جمگھٹا لگ جاتا۔ سیفو حلوائی نے ہائی اسکول میں پڑھائی ترک کر کے اپنے باپ کی دوکان سنبھالی تھی۔ ابھی وہ درجہ نہم میں تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ سیفو گھر میں سب سے بڑا تھا۔ چنانچہ دوکان اور گھر چلانے کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر آن پڑی تھی۔

سیفو کا باپ آزادی کے بعد مشرقی پنجاب سے اپنے بچوں کے ساتھ ہجرت کر کے وسطی پنجاب کے اس گاؤں جمال پور میں آ کر آباد ہوا تھا۔ وہ ذات کا شیخ تھا۔ مشرقی پنجاب میں فیروز پور میں اس کی حلوائی کی دوکان تھی۔ جمال پور آ کر بھی اس نے حلوائی کی دوکان کھولی اور بہت جلد گاؤں کے مقامی لوگوں میں گھل مل گیا۔

اسے شعر و شاعری کا بہت شوق تھا۔ خود بھی مزاحیہ شاعری لکھتا۔ اس کا اصل نام کوئی نہیں جانتا تھا۔ جھٹ پٹ تخلص کرتا تھا۔ سب اسے جھٹ پٹ کے نام سے جانتے تھے۔

اچھی مزاحیہ شاعری کے علاوہ مٹھائی بھی کمال کی بناتا۔ برفی، لڈو، جلیبیاں ایسی بناتا کہ لوگ دور دور سے خریدنے آتے۔

شام کے وقت جب ریوڑیاں بناتا سارے گاؤں کے بچے اس کے گرد اکٹھا ہونا شروع ہو جاتے جب وہ چینی کا گاڑا شیرا دیوار پر لگی ایک بڑی سی کیل پر لٹکا کر اسے کھینچ کر پھینٹتا اور پھر دوبارہ لپیٹ کر کیل پر لٹکاتا تو بچوں کی ریوڑیوں کے لیے رال ٹپکنے لگتی۔

جھٹ پٹ خاصے بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا۔ بچوں کا اس وقت ہنس ہنس کر برا حال ہو جاتا جب چینی کا شیرہ پھینٹتے ہوئے اس کا بڑا سا پیٹ اوپر نیچے حرکت کرتا۔

جب چینی کے شیرے میں سفیدی آنے لگتی اور وہ سختی اختیار کرنے لگتا تو اس کو کھینچ کھینچ کر گٹا بناتا جو ساتھ ساتھ بکتا جاتا۔ کچھ گٹے پر تل لگا کر اسے ساتھ رکھے ایک بڑے سے تھال میں رکھے جاتا۔ جب تلوں والا گٹا ٹھنڈا ہو جاتا وہ اسے کاٹ کر ریوڑیوں میں بدل دیتا۔

سیفو کو حلوائی کی دوکان کے علاوہ شعر و شاعری کا چسکا اپنے والد شیخ جھٹ پٹ سے ملا تھا۔ اگرچہ اس نے اپنے والد کی وفات کے بعد ہائی سکول میں اپنی تعلیم اُدھوری چھوڑ کر دوکان سنبھال لی تھی لیکن اسے اردو کے ہزاروں اشعار ازبر تھے۔ اس کا شعر پڑھنے کا انداز بھی اپنے والد جیسا تھا۔

شام کے وقت اس کی دوکان پر لگنے والے جھمگٹوں میں اس کی شاعری کے ذوق کا دخل بھی تھا۔

چند پڑھے لکھے بندے جنہیں شعر و شاعری کا شوق تھا سرِ شام اس کی دوکان پر رکھے لکڑی کے دو بنچوں پر آ کر بیٹھ جاتے تو وہاں شعر و شاعری کا دور شروع ہو جاتا۔ عشا کی نماز کے بعد مولوی صاحب بھی بلاناغہ وہاں چلے آتے۔

گرمیوں میں سیون اپ ملا ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم دودھ مولوی صاحب کا پسندیدہ مشروب تھا۔

مولوی صاحب جب بھی وہاں آتے ان سے عقیدت رکھنے والا کوئی نہ کوئی شخص انہیں موسم کے مطابق ٹھنڈے یا گرم دودھ کی دعوت دیتا تو ان کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک پیدا ہوتی اور چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل جاتی اور وہ بغیر کچھ کہے داڑھی اور پیٹ پر ہاتھ پھیر کر دودھ پینے کا عندیہ دے دیتے۔
مولوی صاحب سیفو کی دوکان پر آتے تو شاعری کا دائرہ اردو سے پھیل کر فارسی اور عربی شاعری کی حدود میں داخل ہو جاتا۔ مولوی صاحب فارسی اور عربی کے شعر سناتے اور ساتھ ان کا ترجمہ کرتے تو وہاں بیٹھے صاحبان ذوق عش عش کر اٹھتے۔
شیر و کمہار اور چوہدری نثار بھی اپنی شامیں اکثر سیفو حلوائی کی دوکان پر رکھے لکڑی کے بنچوں پر بیٹھ کر گزارتے۔
شیر و کمہار مولوی صاحب سے عربی فارسی کے شعر سنتا تو فوراً جواب میں کبھی بلھے شاہ، کبھی میاں محمد بخش اور کبھی شاہ حسین کا کوئی شعر پیش کر دیتا۔
شیر و کمہار کا ترنم بھی کمال کا تھا۔ وہ پنجابی کا کوئی شعر سناتا تو ترنم سے شعر پڑھنے کی فرمائش شروع ہو جاتی۔ لوگ مولوی صاحب کے عربی فارسی کے شعر بھول کر شیر و کمہار کے پنجابی کے باترنم شعروں کے سحر میں کھو جاتے۔ ایسا سماں بندھتا کہ حلوائی کی دوکان کسی صوفیٔ باصفا کی محفل میں ڈھل جاتی۔
مولوی صاحب شیر و کمہار کا صوفیانہ کلام سنتے تو جھومنے لگتے۔ اور اکثر اس کو مسجد میں آنے اور نماز ادا کرنے کی تلقین کرتے۔ ایسے میں شیر و کمہار ہمیشہ انہیں ایک ہی بات کہتا:
"مولوی صاحب آخرت میں نمازیں آدمی کے لیے دیدار الٰہی سے محرومی کا سبب بنیں گی۔"
مولوی صاحب تعجب سے پوچھتے وہ کیسے:
"وہ ایسے کہ نماز پڑھنے والے نیک لوگ ہیں۔ انہیں اللہ میاں قیامت کے دن ان کی نمازوں کی وجہ سے بغیر حساب کتاب جنت میں بھیج دے گا۔ اس طرح وہ دیدارِ الٰہی سے محروم رہیں گے۔ ہم گناہگار

زنجیروں میں جکڑے حساب کتاب کے لیے خدا کے سامنے پیش کیے جائیں گے تو ہم دیدار الٰہی سے فیض یاب ہوں گے۔ دیدار الٰہی کے بعد جنت جہنم کی کسے فکر ہو گی۔"

مولوی صاحب زچ ہو کر شیر و کمہار کو اسی کی منطق میں جواب دیتے: "جیسے نمازی بغیر حساب کتاب جنت میں جائیں گے۔ اسی طرح بے نمازی بغیر حساب کتاب جہنم میں جائیں گے۔ پھر کیسا دیدار۔ جہنم کی لپٹیں ہو گی اور بے نمازیوں کی چیخیں۔"

"مولوی صاحب چلیں یوں ہی سہی۔ ہم یہاں بھی اہل فراق ہیں۔ آہ و بکا ہمارا طریق ہے۔ اگر وہاں بھی یہی کرنا پڑا تو کر لیں گے۔ لیکن آپ سے جب جنت کی حوریں چھیڑ چھاڑ کریں گی تو آپ کیا کریں گے؟ کیا وہاں بھی وہی کریں گے جو یہاں کرتے ہیں؟" شیر و کمہار کی ایسی باتوں پر لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑتے اور مولوی صاحب لاحول پڑھتے وہاں سے رخصت ہو جاتے۔

یہ تھا جمال پور جہاں شیر و کمہار اور چوہدری نثار ایک ساتھ پل کر جوان ہوئے تھے۔ سارا جمال پور شیر و کمہار اور چوہدری نثار کی انوکھی دوستی کی مثال دیتا۔

جمال پور کے کئی باسی شیر و کمہار اور چوہدری نثار کی دوستی کو استحسان کی نظروں سے دیکھتے اور کئی ایک کے سینوں پر ان کی دوستی سانپ بن کر لوٹتی۔

چھوٹے لوگ ان کی دوستی پر خوش ہوتے جبکہ بڑی ذاتوں والے چوہدری نثار سے کنی کتراتے۔ جب بھی انہیں موقع ملتا طعنہ زنی کرتے اور چوہدری نثار کو مشورہ دیتے کہ وہ کبھی کبھار شیر و کمہار سے کچھ وقت بچا کر انہیں بھی مل لیا کرے۔

لیکن چوہدری نثار شیر و کمہار سے اپنی دوستی کو زندگی سے دوستی قرار دیتا۔

وہ ایسے طعنہ زنوں کو ہمیشہ یہی جواب دیتا کہ شیر و کے ساتھ گھوم پھر کر اسے لگتا ہے کہ اس کا رشتہ زندگی کے ساتھ جڑا ہے۔ اور وہ اس رشتے کو توڑنے کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔

فصل 3

جس طرح سال میں چار موسم ہوتے ہیں جمال پور کے بھی چار موسم تھے: بہار، گرمیاں، خزاں اور سردیاں۔

بہار آتی تو جمال پور دلہن کی طرح سج جاتا۔ گاؤں کے چاروں طرف پھیلے آموں، مالٹوں، امرودوں اور جامنوں کے درختوں پر پھول کھلتے تو سارے گاؤں میں خوشبو پھیل جاتی۔ جمال پور میں سانس لینے والا ہر ذی روح فضا میں پھیلی خوشبو سے مخمور ہو جاتا۔

انسان تو انسان جانور خوشبو سے مسحور ہونے لگتے۔ گائیں، بھینسیں، گھوڑے اور گدھے خوشی سے جھوم اٹھتے۔ ان کی چال میں ایک عجیب بانکپن پیدا ہو جاتا۔

یہاں تک کہ برتن بنانے کے لیے چاک کے پاس رکھے مٹی کے بوتوں سے ایسی سوندھی سوندھی خوشبو آتی کہ شیرو کمہار کا بیٹا دیوانوں کی طرح مٹی کو سونگھنے اور چومنے لگتا۔

شیرو کمہار اس طرح اپنے بیٹے رجو کو مٹی کو سونگھتے اور چومتے دیکھتا تو پیار سے اسے چمکارتا:

"رجو تم میرے نہیں مٹی کے بیٹے ہو۔ تمہار دادا بھی اس مٹی کا بیٹا تھا۔ میں بھی اس مٹی کا بیٹا ہوں-اور تم بھی اس مٹی کے بیٹے ہو۔ اگر زندگی بھر اس مٹی کو اسی طرح چاہو گے تو کبھی کوئی دکھ تمہاری روح کو گھائل نہیں کرے گا۔ ہمیشہ سکھی رہو گے۔ لیکن اگر کبھی اس مٹی کی محبت تمہارے دل سے چلی گئی تو کبھی خوش نہیں رہو گے۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم عمر بھر اس مٹی سے ایسے ہی محبت کرتے رہو گے۔"

چھ سات سالہ رجو کبھی باپ کی بات سمجھ پاتا اور کبھی نہ سمجھ پاتا۔ شیرو کمہار رجو کو اپنے ننھے منے ہاتھوں سے مٹی کے بوتے بناتے دیکھتا تو اسے اپنا بچپن یاد آ جاتا۔ اسے وہ دن یاد آ جاتے جب وہ اپنے باپ کے

پاس بیٹھ کر مٹی کے بوتے بناتا اور اس کا باپ ان بوتوں کو چاک پر رکھ کر کبھی ہنڈیا، کبھی صراحی، کبھی پیالے اور کبھی کنالی کی شکل دے دیتا۔

پھر اسے جمال پور میں گزرے اپنے بچپن کے وہ دن یاد آتے جب وہ باپ کی نظریں بچا کر نسرے کے ساتھ آموں کے باغوں میں کھیلنے کے لیے چلا جاتا۔

وہ دونوں گھنٹوں آموں کے باغوں میں آگے پیچھے بھاگتے کبھی امبیاں اکھٹی کرتے کبھی کسی بات پر آپس میں طاقت آزمائی کرتے اور کبھی درخت پر چڑھنے کا مقابلہ کرتے۔

خاص طور پر جب گاؤں کے اور بہت سے ہم عمر لڑکے اور لڑکیاں باغ میں چلے آتے تو پھر تو وہ دھما چوکڑی مچتی کہ باغ کے چوکیدار کو مداخلت کرنی پڑتی اور اسے ان کو باغ سے بھگانا پڑتا۔

انہی لڑکیوں میں سے ایک نگو بھی تھی۔ نگو شروع سے شیرو کمہار کو بہت اچھی لگتی تھی۔ کیوں اچھی لگتی تھی اس کا اسے بھی اندازہ نہیں تھا۔ بس اچھی لگتی تھی۔

نگو اس کے چچا کی بیٹی تھی۔ شیرو کمہار کے باپ محمدو اور اس کے بھائی رکھے کے تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔ اس لیے گھروں میں آنا جانا نہیں تھا۔

لیکن بچوں کے ملنے ملانے پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ وہ کبھی کبھار ایک دوسرے کے گھر میں بھی چلے جاتے لیکن دونوں بھائی محمدو اور رکھا ایک دوسرے سے ایک آنکھ بات نہیں کرتے تھے۔

دونوں میں بول چال بند ہونے کا کوئی خاص کارن نہیں تھا۔ جب محمدو اور رکھے کا باپ گُلا کمہار فوت ہوا تو اُس کے پانچ گدھے اور دو بیٹے تھے۔ اور ایک چھوٹا سا دو تین مرلے پر مبنی گھر تھا۔ ایک چند مرلوں پر مبنی احاطہ تھا۔

گُلا کمہار فوت ہوا تو گھر اور دو گدھے محمدو کے حصے میں آئے جبکہ دو گدھے اور احاطہ رکھے کو ملا۔ جھگڑا پانچویں گدھے پر ہوا۔ محمدو کا کہنا تھا کہ چونکہ احاطہ رکھے کو ملا تھا اس لیے پانچواں گدھا اسے ملنا چاہیے۔ جب کہ رکھے کا کہنا تھا چونکہ گھر محمدو کو ملا تھا اس لیے پانچواں گدھا اسے ملنا چاہیے۔

آخر کار برادری کی مداخلت سے فیصلہ رکھے کے حق میں ہوا اور وہ تین گدھوں اور اپنی بیوی کے ساتھ احاطے میں جا کر رہنے لگا جبکہ محمد و کمہار اپنی بیوی کے ساتھ اپنے آبائی گھر میں رہتا رہا۔

یہ سب باتیں شیر و کمہار کی پیدائش سے پہلے کی تھیں۔ لیکن اس چھوٹے سے جھگڑے کے اثرات اب بھی ان کی زندگیوں میں موجود تھے۔

شیر و اور نگو کے ملنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ شیر و اپنے چچا کے گھر چلا جاتا اور نگو اپنے تاؤ کے گھر چلی آتی۔ یوں شیر و اور نگو کی ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہتا۔ لیکن جب کبھی نگو دوسرے بچوں کے ساتھ آموں کے باغ میں چلی آتی شیر و کے اندر ایک اور شیر و جاگ اٹھتا جو اس شیر و سے مختلف ہوتا جس کا اپنے باپ سے چوری چچا رکھے کے ہاں آنا جانا ہوتا تھا۔

یہی حال نگو کا تھا۔ شیر و جب کبھی ان کے ہاں آتا وہ غیر شعوری طور پر اس کی آمد سے لاتعلق بنی رہتی لیکن کہیں بہت نیچے روح کی گہرائیوں کے اندر ہلکی سی سرسراہٹ ہوتی۔ اسے لگتا جیسے ہوا کا کوئی جھونکا اس کے دل میں اگی سرسبز گھاس کو سرسراتا ہوا گزر گیا ہے۔

باغ میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوے اسے شیر و سے ایک اُنسیت کا احساس ہوتا۔

وہ بھول جاتی کہ وہ اس کے تاؤ کا بیٹا ہے۔ وہ اسے کئی لحاظ سے گاؤں کے دوسرے بچوں کی طرح دکھتا اور کئی لحاظ سے دوسرے بچوں سے مختلف دکھائی دیتا۔

نسرا اسے چھیڑتا۔ دیکھو شیر و یہ تمہارے چچا کی بیٹی نگو تمیں کبھی کبھار عجیب نظروں سے دیکھتی ہے۔

شیر و اسے شَشکار دیتا۔

"دیکھو نسرے تم ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ نگو بھی باقی سب لڑکوں اور لڑکیوں کی طرح ہمارے ساتھ کھیلنے کے لیے آتی ہے۔ پتہ نہیں تمیں اس کی آنکھوں میں کیا دکھائی دیتا ہے۔ مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

کہنے کو تو وہ نسرے کو شَشکار دیتا لیکن دل کی گہرائیوں میں وہ بھی جانتا تھا کہ نگو اسے اچھی لگتی ہے اور وہ بھی اسے اچھا لگتا ہے۔ لیکن وہ کیوں ایک دوسرے کو اچھے لگتے ہیں اس کا ابھی انہیں پتہ نہیں تھا۔

شیر و محمد و کا اکیلا بیٹا تھا۔ اور نگو رکھے کی اکیلی بیٹی۔ ان دو بھائیوں کی اولاد جن میں پانچ گدھوں کی تقسیم پر جھگڑا ہوا تھا اور زندگی بھر کے لیے بول چال بند تھی۔

شیر و جب بھی اپنے باپ کے پاس بیٹھتا اور اسے تھوڑے اچھے موڈ میں دیکھتا تو ہمیشہ یہی کہتا:

"باپو تم چاچو رکھے سے کیوں نہیں بولتے ؟ "

اس کا باپ اسے ہمیشہ ڈانٹ دیتا:

"شیر و تم ابھی یہ باتیں نہیں سمجھ سکتے۔ اور شاید کبھی سمجھ بھی نہ سکو۔ کیونکہ نہ تمہارا کوئی اور بھائی ہے۔ اور نہ پانچ گدھے۔ ہمارے صرف دو گدھے ہیں۔ اور تم میرے اکیلے بیٹے ہو۔ اس لیے تم یہ بات کبھی نہیں سمجھو گے۔"

"لیکن باپو۔ کسی گدھے کو انسانوں کی زندگیوں پر مسلط نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ گدھے میں بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں لیکن وہ دو بھائیوں کو اس طرح ایک دوسرے سے جدا کر دے کہ وہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہ ہوں کوئی اچھی بات نہیں۔"

اس کے جواب میں جب محمد و بھی نسرے کی طرح اسے کہتا کہ اسے چچا رکھے کی فکر نہیں نگو کی فکر ہے تو وہ جھینپ جاتا۔

دوسری طرف نگو بھی اپنی ماں سے یہی سوال کرتی:

"اماں میرا باپو اور تاؤ ایک دوسرے سے کیوں نہیں بولتے۔ باپو اور تم تاؤ کے گھر کیوں نہیں جاتے۔ آخر باپو اور تاؤ میں کیا جھگڑا ہے۔"

جب نگو کے سوال حد سے بڑھ جاتے تو ماں اسے خفگی سے جواب دیتی:

"یہ باتیں تم اپنے باپو سے کیوں نہیں پوچھتی۔ وہ تمیں اس کا بہتر جواب دے سکتا ہے۔"

"باپو سے مجھے ڈر آتا ہے۔ دیکھتی نہیں وہ کبھی کبھار گدھوں کو کیسے ڈنڈے سے مارتا ہے۔ میں بھی گدھوں کی طرح باپو سے پٹنا نہیں چاہتی۔"

"نہیں تمہارا باپو کبھی تم پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔ گدھوں کو مارنا اور بات ہے۔ پر۔۔۔۔" اس کی ماں جملہ ادھورا چھوڑ دیتی۔

"باپو اور تاؤ آپس میں بات نہیں کرتے لیکن میں جب بھی تاؤ کے گھر جاتی ہوں وہ ہمیشہ مجھ سے بہت پیار سے بات کرتے ہیں۔ اور جب شیر و ہمارے ہاں آتا ہے باپو اسے ہمیشہ کھانا کھانے کے لیے پوچھتا ہے۔"

"شاید دونوں بھائیوں کے دل میں آپس میں بات چیت نہ ہونے کے باوجود کوئی بات ہو۔" نکو کی ماں اسے جواب دیتی۔

اور پھر جمال پور کی انہی بہاروں میں چند سالوں بعد آنے والے ایک بہار کے موسم میں شیر و اور نکو کے ایک دوسرے کے لیے جذبات دیکھتے ہوئے محمد و اور رکھے نے پانچویں گدھے کے قضیے کو بھلا کر دونوں کی شادی کر دی۔

نکو کے ساتھ شیر و کی شادی کیا ہوئی جمال پور کی طرح اس کی زندگی میں بھی بہار چلی آئی۔ نکو اس کی زندگی میں آئی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کئی برس پہلے اسے اچھی کیوں لگتی تھی۔ اب وہ اس کے چچا کی لڑکی نہیں اس کی جیون ساتھی اور اس کی محبت تھی۔

نو بیاہتا جوڑوں کی طرح زندگی اپنی تمام رعنائیوں سمیت شیر و اور نکو کے آنگن میں اتر آئی۔ زندگی کی توانائیوں سے بھرپور شیر و اور نکو نے شادی کے بعد کئی بہاروں تک اپنی سی بھرپور کوشش کی لیکن ان کے چمن مراد میں کوئی گل نہ کھل سکا۔

محمد و کمہار اور رکھا کمہار کئی سالوں بعد یکے بعد دیگرے دق اور سل کے مرض میں مبتلا ہو کر راہی ملک عدم ہوے۔

احاطہ اور پانچوں گدھے ایک بار پھر شیر و اور نکو کے ساتھ ایک گھر میں اکٹھے ہوئے۔ لیکن شیر و کمہار اور نکو کی زندگی کے صفحے پر نیا مشترکہ عکس بنانے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ شیر و سے زیادہ نکو کو اس بات کا دکھ تھا کہ ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہو رہا۔

اس دکھ سے رفتہ رفتہ اس کے دل کا گل مرجھانے لگا تو اس نے پہلے پہل امام مسجد کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔ مولوی صاحب نے اسے دو تعویذ لکھ کر دیئے۔ ایک تعویذ پانی میں گھول کر چالیس دن تک پینے کا مشورہ دیا اور دوسرا اپنے خاوند سے ہم بستری سے پہلے کمر سے باندھنے کی تلقین کی۔

جب مولوی صاحب کے تعویذوں سے بھی گل مراد نہ کھلا تو نگو نے حکیم صاحب سے رابطہ کیا۔ حکیم صاحب نے نگو کی نبض دیکھی تو کہا کہ وہ بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ انہوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اسے تقدیر الہٰی سمجھ کر صبر شکر کرے اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کرے۔ اگر وہ حضرت بی بی مریم کو بغیر شادی اور حضرت ابراہیم کی بیوی کو بڑھاپے میں اولاد عطا کر سکتا ہے تو اس جوانی میں اس کے دامن مراد کو بھرنا اس سے کیا بعید ہے۔

حکیم صاحب کے اس انکشاف کے بعد کہ وہ ماں بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اب فقط دعا سے اس کی تقدیر بدل سکتی ہے نگو نے گاؤں کے مزاروں پر جانا شروع کر دیا۔

انہی مزاروں میں سے جمال پور میں ایک پیر سائیں کا مزار بھی تھا۔ ایک سہ پہر وہ پیر سائیں کے مزار پر چڑھاوہ چڑھا کر مزار سے باہر آئی تو پیر سائیں کے گدی نشیں کی اس پر نظر پڑی۔ نگو کے کھلتے رنگ اور گدرائے بدن نے گدی نشیں کے جسم میں آگ لگا دی۔

گدی نشیں نے نگو سے پوچھا کہ وہ مزار پر کیسے آئی ہے۔ نگو نے کہا اس نے سنا ہے کہ پیر سائیں کے مزار پر چڑھاوہ چڑھانے سے عورتوں کے من کی مراد پوری ہوتی ہے اور ان کی گود ہری ہو جاتی ہے۔

گدی نشیں نے نگو کی بات سن کر کہا کہ اس نے ٹھیک سنا ہے۔ کئی بے اولاد عورتیں پیر سائیں کے مزار پر آئیں اور بامراد واپس لوٹیں۔ لیکن اس کے لیے انہیں گدی نشیں کے حجرے میں چلّہ کرنا پڑتا ہے۔ کئی بے اولادوں کی مراد فوراً پوری ہو جاتی ہے اور کئی ایک کو کئی ماہ لگ جاتے ہیں۔ نگو نے گدی نشیں کی بات سنی تو فوراً حجرے میں جا کر چلّہ شروع کرنے کا عندیہ دیا۔

حجرے میں گدی نشیں نے اسے تلقین کی کہ وہ آنکھیں بند کرکے یہ کہے کہ یا پیر سائیں مجھے بامراد کر۔ یا پیر سائیں مجھے بامراد کر۔ اور ساتھ ہی کہا کہ جب تک وہ اسے نہ روکیں وہ یہ کہتی رہے۔ اگر وہ اس کے روکنے سے پہلے رک گئی تو پھر کبھی اس کی گود ہری نہیں ہو سکے گی۔ اس چلے کے بعد نگو کو کسی مولوی، حکیم یا مزار پر جانے کی ضرورت نہ رہی۔

اس بات کو کئی سال ہو چکے تھے اور اب شیرو کا چھ سات سالہ بیٹا جب جمال پور میں اترنے والی بہار میں مٹی کے بوتوں سے آنے والی سوندھی سوندھی خوشبو سے مسحور ہو جاتا تو شیرو کو اپنے بچپن کی بہاریں اور آموں کے باغوں میں درختوں پر اترنا چڑھنا یاد آ جاتا۔ تو وہ اپنے بیٹے رجو سے مخاطب ہو کر کہتا کہ وہ مٹی کا بیٹا ہے۔ جب تک وہ اپنی مٹی سے جڑا رہے گا سکھی رہے گا۔ اور کوئی دکھ اس کی روح کو گھائل نہیں کر سکے گا۔

فصل 4

رجو کی سکول جانے کی عمر تھی۔ لیکن وہ سکول جانے کی بجائے گھر پر صبح اٹھ کر پہلے گدھوں کو چارہ ڈالتا۔ پانی پلاتا۔ پھر کبھی شیر و کے لیے مٹی کے بوتے بناتا اور کبھی اس کے ساتھ مل کر ریت یا مٹی لانے کے لیے چلا جاتا۔

چوہدری نثار کی جب بھی شیر و سے ملاقات ہوتی وہ ہمیشہ اسے کہتا کہ وہ رجو کو سکول داخل کروائے تا کہ اسے لکھنا پڑھنا آ سکے۔ شیر و ہمیشہ اسے ایک ہی جواب دیتا کہ بغیر پڑھے لکھے وہ اپنے کام سے کچھ پیسے کما سکے گا پڑھ لکھ گیا تو اس کام سے بھی جاتا رہے گا۔

ایک شام چوہدری نثار اور شیر و سیر کے لیے گئے تو ان کے درمیان رجو کے بارے میں گفتگو چھڑ گئی۔

"شیر و تم اپنے بیٹے سے ڈرتے ہو۔ اس لیے اسے اسکول نہیں بجھوانا چاہتے۔"

" نہیں میں رجو سے نہیں ڈرتا۔ میں بھلا اس سے کیوں ڈروں گا۔ اگر وہ تمہاری طرح پڑھ لکھ جائے تو کوئی بات ہے۔ لیکن اگر پانچ سات جماعتیں پڑھ کر پھر یہی کرے گا جو میں اور میرا باپ کرتے آ رہے ہیں تو ایسی پڑھائی کا کیا فائدہ؟"

"ہو سکتا ہے وہ پڑھائی لکھائی میں اچھا ثابت ہو اور مجھ سے بھی آگے نکل جائے۔"

"نہیں چوہدری۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ پڑھ لکھ گیا تو مٹی سے دور ہو جائے گا۔ اور پھر کہیں چین نہیں پائے گا۔ زندگی بھر بھٹکتا رہے گا۔ اور پھر کمہار کا بیٹا پڑھ لکھ گیا تو اس کی شادی کہاں ہو گی۔ کون دے گا اسے اپنی بیٹی؟"

" شیر و اگر تمہارا بیٹا پڑھ لکھ کر کامیاب انسان بن گیا تو بڑے بڑے لوگ اسے اپنی بیٹی دینے پر تیار ہو جائیں گے۔"

ایسی گفتگو سے چوہدری نثار نے شیر و کو ذہنی طور پر رجو کو سکول بھجوانے کے لیے تیار کر دیا۔ لیکن اس کے خدشات کبھی بھی حتمی طور پر ختم نہ ہوئے۔ رجو کی پڑھائی لکھائی پر اٹھنے والے اخراجات کا مسئلہ بھی اس کے پیش نظر تھا۔

انہی خدشات کی وجہ سے اس نے چوہدری نثار سے ہونے والی گفتگو کا رخ تعلیم پر اٹھنے والے متوقع اخراجات کی طرف موڑ دیا۔

"چوہدری۔ پرائمری اسکول تک تو ٹھیک ہے۔ تعلیم پر کچھ خرچ نہیں ہوتا لیکن میں نے سنا ہے ہائی سکول اور کالج کی پڑھائی کے لیے کافی رقم درکار ہوتی ہے۔"

"شیر و تم نے ٹھیک سنا ہے۔ لیکن بچہ قابل ہو تو کوئی نہ کوئی راستہ نکل آتا ہے۔ اگر بچہ نالائق ہو تو وہ ویسے بھی نہیں پڑھ پاتا۔ تم اللہ کا نام لے کر رجو کو اسکول جانے دو۔ پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔"

چوہدری نثار کے کہنے پر اگلے دن شیر و رجو کے ساتھ جمال پور پرائمری اسکول جا پہنچا۔ ہیڈ ماسٹر نے شیر و کو بھرنے کے لیے داخلہ فارم دیا تو وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا:

"ماشٹر جی۔ اگر مجھے فام بھرنا آتا تو میں اس حال میں ہوتا۔ یہ کام آپ خود ہی کر دیں۔ ہیڈ ماسٹر نے داخلہ فارم بھرنا شروع کیا تو اس نے پوچھا بچے کا نام:

"رجو۔" شیر و نے جواب دیا۔

"یہ کوئی نام نہیں ہے۔ ٹھیک نام بتاؤ۔"

"جی یہی ٹھیک نام ہے۔" شیر و نے جواب دیا۔

"نہیں وہ نام بتاؤ جو اس کی پیدائش کے وقت ٹاؤن کمیٹی میں لکھوایا تھا۔"

ہیڈ ماسٹر نے پوچھا۔

"جی۔ ٹاؤن کمیٹی والوں کو تو پتہ ہی نہیں کہ میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ نہ انہوں نے کبھی مجھ سے پوچھا۔ نہ میں نے کبھی انہیں بتایا۔"

"دیکھوشیرو، میرا ایک مشورہ ہے۔ اگر تم اتفاق کروتو میں رجو کی بجائے تمہارے بیٹے کا کوئی بہتر نام رجسٹر میں لکھ دیتا ہوں۔ یہ نام اس کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرے گا۔ اس لیے رجو کی بجائے میں چاہتا ہوں کہ سکول میں اس کو رضوان کے نام سے داخل کروں۔ اور اس کے خاندانی نام کے خانے میں اس کا نام انجم لکھوں۔ اس طرح اسکول میں اس کا نام ہو گا رضوان انجم۔ اب اگر تم اسے رجو بھی کہو گے تو یہ چلے گا۔"

"ٹھیک ہے ماشٹر جی اگر آپ اس کا سکول کا نام رضوان انجم رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ نہ میرا باپ اسکول گیا نہ دادا۔ ہمیں ایسی باتوں کا کیا پتہ۔ بس آپ جو اس کے لیے بہتر سمجھتے ہیں کریں۔ یہ آج سے ہمارا نہیں آپ کا بیٹا ہے۔"

شیرو نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو جواب دیا۔

شیرو کے جواب سے مطمئن ہو کر ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسکول کے رجسٹر میں رجو کا نام رضوان انجم لکھا۔

اس طرح جمال پور کے پرائمری اسکول میں رجو رضوان کے نام سے تعلیم حاصل کرنے لگا۔

رجو کو اپنا نیا نام رضوان انجم اس قدر پسند آیا کہ اب جو بھی اسے رجو کہہ کا پکارتا وہ اس کو اس وقت تک جواب نہ دیتا جب تک وہ اسے رضوان کہہ کر مخاطب نہ کرتا۔

سکول میں تو ساتھی طالب علم اور استاد اسے رضوان کے نام سے پکارتے تھے لیکن اب گھر میں بھی اس نے وطیرہ بنالیا تھا کہ اگر شیرو یا نگو اس کو رجو کہہ کر بلاتے تو وہ فوراان کی تصحیح کرتا کہ اس کا نام رجو نہیں رضوان ہے۔

رضوان کو اپنی پرائمری اسکول کی یونیفارم بھی بہت اچھی لگتی تھی۔ گرمیوں میں نیلے رنگ کی نیکر اور سفید قمیض اور سردیوں میں نیلے رنگ کی پینٹ اور سفید قمیض اور اوپر پینٹ سے ملتے نیوی بلیو رنگ کا سویٹر اس کی زندگی کا اس طرح حصہ بن گئے کہ وہ اسکول کے باہر بھی زیادہ تر انہی کپڑوں میں ملبوس رہتا۔

جب سے اس نے اسکول جانا شروع کیا تھا وہ حسب معمول صبح اٹھ کر گدھوں کو چارہ وغیرہ تو ڈال دیتا تھا لیکن شیرو کے ساتھ بیٹھ کر اس نے چاک پر چڑھانے کے لیے مٹی کے بوتے بنانے بند کر دیئے تھے۔

اس کی کوشش ہوتی کہ صبح اٹھنے کے بعد جتنی جلدی ہو سکے وہ نہا دھو کر ناشتہ کرے اور اسکول جائے۔

نگو بھی پوری تن دہی سے کوشش کرتی کہ اس کا اسکول جانے کا معمول ٹوٹنے نہ پائے۔

چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ ٹائم سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ پہلے اسکول پہنچ جاتا اور کلاس شروع ہونے سے پہلے اگر کوئی ماسٹر صاحب اسے فارغ مل جاتے تو وہ ان سے کتابوں میں پیش آنے والی مشکلات کے بارے میں پوچھتا۔ماسٹر صاحب خوش دلی سے اس کی مدد کرتے۔

اس کی اس عادت کی وجہ سے اپنی کلاس کے ماسٹروں کے علاوہ تقریباً اسکول کے سبھی ماسٹر اسے پہچاننے لگے تھے۔

یوں پرائمری اسکول میں رضوان کی شخصیت اس کے اپنے کلاس روم سے باہر اسکول کی سطح پر نمایاں ہونے لگی تھی۔

امتحانات میں بھی وہ بہت اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ زیادہ تر اسکول ٹیچروں کا خیال تھا کہ وہ بڑا ہو کر ایک کامیاب انسان ثابت ہو گا۔ بعض ٹیچر اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے کہ اتنی اچھی صلاحیتوں کے مالک بچے کا تعلق اتنے معمولی خاندان سے تھا۔ چنانچہ وہ سمجھتے تھے کہ اچھی صلاحیتوں کے باوجود وہ زندگی میں زیادہ دور تک آگے نہیں بڑھ سکے گا اور رفتہ رفتہ گاؤں کے دوسرے غریب بچوں کی طرح اسی گاؤں میں خاک ہو رہے گا۔

ان سب باتوں کے باوجود رضوان نے اسکول میں داخل ہونے کے ساتھ ہی جو اچھی عادتیں اپنا لی تھیں ان کی وجہ سے روز بروز اس کی شخصیت میں نکھار پیدا ہو رہا تھا۔ اس کے بات چیت کرنے کا انداز بدل رہا تھا۔ وہ بڑوں کو جس ادب کے ساتھ مخاطب کرتا اس سے ان کا دل خود بخود اس کے لیے موم ہو جاتا۔ وہ اس کی بھولی صورت اور ذہین آنکھوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔

خود شیر و اپنے بیٹے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر دل ہی دل میں بہت خوش تھا۔ اگر کبھی سرِ راہ اس کی رضوان کے کسی اسکول ٹیچر سے ملاقات ہو جاتی اور وہ ٹیچر شیر و کو محض اس وجہ سے انتہائی عزت کے ساتھ بلاتا کہ وہ رضوان کا باپ ہے تو شیر و کا سینہ خوشی سے چار انچ پھول جاتا۔

شام کے وقت جب وہ چوہدری نثار کے ساتھ سیر کے لیے جاتا تو سارا راستہ رضوان کی باتیں کرتا رہتا۔

سیفو حلوائی کی دوکان پر رات گئے محفل سجتی تو وہاں بھی سب کو رضوان کی کہانیاں سناتا۔

اگر کوئی اس کے بیٹے کو رجو کہہ کر بلاتا تو ناراض ہو جاتا۔ اور سرزنش کے انداز میں کہتا اب اس کا نام رجو نہیں رضوان ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کا کہنا ہے کہ اسے رجو نہ کہا جائے بلکہ رضوان انجم کے نام سے پکارا جائے۔ پھر بھی کوئی اسے رجو کہنے پر اصرار کرتا تو شیر و اس سے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا۔

رضوان میں وہ ساری صفات رفتہ رفتہ عیاں ہو رہی تھیں جو غیر معمولی طور پر ذہین بچوں میں ہوتی ہیں۔ چیزوں کو سمجھنے کی اس میں بلا کی صلاحیت تھی۔ اس کی یاداشت بھی غیر معمولی تھی۔ ایک بار چیز پڑھ لیتا یا ماسٹر صاحب سے سن لیتا تو اسے من و عن دہرا دیتا۔

جتنے نئے الفاظ سنتا ان کو مختلف صوتی شکلیں دے کر دیکھتا کہ ممکنہ طور پر ان سے اور کتنے نئے لفظ بنا سکتا ہے۔

پھر اسکول کے ٹیچروں سے پوچھتا اگر اس لفظ کا یہ مفہوم ہے تو اس کو اس طرح بدل کر بننے والے لفظ کے کیا معنی ہیں۔ لفظوں کو مختلف اتار چڑھاؤ کے ساتھ ادا کر کے ان کے تاثر کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا۔ پھر ان کی ادائیگی کے مختلف اندازوں سے معنی کی تبدیلی کے بارے میں اپنے ٹیچروں سے استفسار کرتا تو وہ اس کے ادق سوالات سے پریشان ہو جاتے۔

اسکول میں ایک استاد ہفتے میں ایک بار وائلن سکھانے آتا تھا۔ رضوان نے اس سے وائلن سیکھنی شروع کی۔ وائلن ٹیچر کا کہنا تھا جس تیزی سے رضوان وائلن کے اسرار و رموز سیکھ رہا تھا وہ اس کے لیے حیرت

ناک بات تھی۔ آج تک اس نے کوئی بچہ نہیں دیکھا تھا جو اتنی تیزی کے ساتھ وائلن کی دھنیں سیکھتا اور بجاتا۔

رضوان پڑھائی لکھائی اور موسیقی میں تو کمالِ تیزی کی ساتھ ترقی کر رہا تھا کھیلوں میں بھی اس کی استعداد حیرت انگیز تھی۔ اسکول کی ہاکی ٹیم میں شامل ہوا تو بہت جلد سنٹر فارورڈ پوزیشن حاصل کر لی۔ دوسرے اسکولوں کی ہاکی ٹیموں کے ساتھ میچ ہوتے تو اس کی وجہ سے جمال پور اسکول کی ٹیم کی کامیابی یقینی ہو جاتی۔

شب وروز کے اس سفر میں رجو سے رضوان انجم بننے کے بعد میٹرک کے امتحانات میں بیٹھنے تک رضوان کی شخصیت کے خدوخال تقریباً نمایاں ہو چکے تھے۔

وہ ایک دلکش شخصیت کا مالک نوجوان تھا جس کے انگ انگ سے زندگی اپنی بھرپور توانائیوں کے ساتھ جھلکتی تھی۔

میٹرک کے نتائج کا اعلان کیا گیا تو رضوان انجم پورے پنجاب میں فرسٹ پوزیشن لے کر کامیاب ہوا۔

اس کی کامیابی کی خبر سن کر سارا گاؤں شیرو اور نکو کو مبارک باد دینے ان کے چھوٹے سے گھر پر امڈ آیا۔

چوہدری نثار اور شیرو چارپائی پر گھر سے باہر بیٹھے ہر آنے جانے والے سے مبارک بادیں وصول کر رہے تھے۔

جب بھی کوئی شیرو کو رضوان کی کامیابی کی مبارک باد دیتا وہ کہتا اس کی کامیابی کا سہرا چوہدری نثار کے سر ہے۔ وہ کہتا اگر چوہدری نثار اسے مجبور نہ کرتا تو وہ رضوان کو کبھی اسکول میں داخل نہ کرواتا اور اسے کبھی اتنی بڑی کامیابی حاصل نہ ہوتی۔

پرائمری اسکول کے ٹیچروں نے رضوان کی کامیابی کی خبر سنی تو اسکول بند ہونے کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب کے ساتھ شیرو اور رضوان کو مبارک باد دینے چلے آئے۔

شیر و ہیڈ ماسٹر صاحب کو دیکھتے ہی چارپائی سے اٹھ کر ان کے پیروں میں گر گیا۔ اور تر آنکھوں سے کہنے لگا: "ہیڈ ماسٹر جی میں کسی طرح آپ کا احسان ادا نہیں کر سکتا۔ اگر آپ رجو کو رضوان انجم نہ بناتے تو یہ آج بھی رجو ہوتا اور میرے ساتھ بیٹھ کر مٹی کے بوتے بنا رہا ہوتا۔"

رضوان کی کامیابی کی خبر سنتے ہی سلطان ڈھولچی بھی شیر و کمہار کے گھر کے باہر "آئی بیساکھی گئی بیساکھی" کی دھن پر ڈھول بجاتا چلا آیا- شیر و اور چوہدری نثار نے گھر کے باہر جمع ہونے والے بچوں کے ساتھ ڈھول کی تھاپ پر ناچنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ احاطے میں بندھے گدھوں کے پاوں بھی ڈھول کی تھاپ پر اوپر نیچے اٹھنے لگے۔

'آئی بیساکھی گئی بیساکھی" کی دھن سے سارا جمال پور گونج اٹھا۔

فصل 5

شیرو کے گھر کے باہر ڈھول کی تھاپ پر رقص ابھی جاری تھا کہ پاکستان کے تمام اخباروں کے رپورٹر رضوان انجم کی تصویر بنانے اور بیان لینے کے لیے آ پہنچے۔

رضوان نے انہیں تصویر بنانے سے پہلے انتظار کرنے کے لیے کہا۔ پھر وہ گھر کے اندر گیا اور ایک گدھے پر بڑا سا سائن آویزاں کر کے لے آیا۔ سائن پر لکھا تھا: I love my donkey

پھر گدھے کے ساتھ کھڑا ہو کر رپورٹروں سے بولا کہ وہ اپنے اخباروں کے لیے اس کی تصویر بنائیں۔

رپورٹروں نے کوشش کی کہ وہ گدھے سے ہٹ کر تصویر بنوائے لیکن اس نے سب رپورٹروں سے کہا کہ اس کی کامیابی کی تصویر چھپے گی تو اس کے گدھے کے ساتھ ورنہ وہ تصویر نہیں بنوائے گا۔

چوہدری نثار اور شیرو نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ انہیں گدھوں کی وجہ سے کسی احساس کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

پھر رپورٹروں سے مخاطب ہو کر بولا کہ تمام ذی روح مخلوقات زندگی کے مظاہر ہیں۔ ان کا بھی زندگی پر ویسا ہی حق ہے جیسا انسانوں کا۔ ہم سب زندگی کا حصہ ہیں۔ اور ان تمام مخلوقات کے ساتھ زمین ہم سب کی ماں ہے۔ یہ سب مخلوقات اپنے اپنے دائرے میں زندگی کے عمل کو جاری رکھنے کے لیے اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ کسی مخلوق کو کمتر یا برتر سمجھنا زندگی کی توہین ہے۔

اگلے دن پورے پنجاب میں میٹرک کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے رضوان انجم کی تصویر چھپی تو اس گدھے کے ساتھ جس پر لکھا تھا آئی لو مائی ڈنکی۔

اگلے دن پاکستان کے تمام اخباروں نے رضوان انجم کی گدھے کے ساتھ تصویر نمایاں انداز میں شائع کی۔ تصویر کے ساتھ پنجاب بھر کے اسکولوں میں اس کے فرسٹ آنے کی خبر چھاپی۔ خبر میں اس کے

خاندانی پس منظر اور زندگی کے بارے میں اس کے نظریات کی تفصیل شائع کی۔

اس کے منصوبوں کے بارے میں لکھا کہ وہ مستقبل میں ڈاکٹر بن کر انسانیت کی خدمت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اخباروں میں رضوان کی نمایاں کامیابی کی خبر چھپی تو پاکستان کے مختلف کالجوں کی طرف سے اسے مالی امداد کے ساتھ داخلے کی دعوتیں آنا شروع ہو گئیں۔

چوہدری نثار مختلف کالجوں کی طرف سے ملنے والی دعوتوں کا رضوان کے ساتھ مل کر جائزہ لیتا۔ آخر کار فیصلہ ہوا کہ وہ گورنمنٹ کالج میں پری میڈیکل میں داخلہ لے کر میڈیکل کالج جانے کے بنیادی لوازمات کی تکمیل کرے گا۔ اور اس کے بعد فیصلہ ہو گا کہ اسے کونسے میڈیکل کالج جانا۔ جمال پور سے گورنمنٹ کالج منتقلی رضوان انجم کے لیے زندگی کا ایک نیا تجربہ تھا۔

کہاں چھوٹا سا گاؤں جمال پور جہاں سارے لوگ، چھوٹے بڑے، امیر غریب، ایک خاندان کی طرح زندگی گزارتے تھے اور کہاں گورنمنٹ کالج جہاں پاکستان بھر کے امیر کبیر لوگوں کے بچے ایک دوسرے سے الگ تھلگ اپنے تعلیمی مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔

لیکن گورنمنٹ کالج میں رضوان کا آنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اخبارات میں گدھے کے ساتھ چھپنے والی اس کی تصویر اور اس کے خاندانی پس منظر کی تفصیلات تقریباً گورنمنٹ کالج کے ہر استاد اور ہر طالب علم کو معلوم تھی۔

چند طالب علموں نے اس تصویر اور اس کے خاندانی پس منظر کے حوالے سے اس کو تضحیک کا نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن جلد ہی اس کی شخصیت سے امڈنے والی زندگی اور ذہانت کی انرجی نے انہیں پسپائی پر مجبور کر دیا۔

وہ اس کی شخصی دلکشی اور جاذبیت کے سامنے بے دم ہو کر رہ گئے۔ اور کوشاں ہوے کہ اس کے ساتھ ان کی دوستی ہو جائے۔ لیکن رضوان ایک ایسا آفتاب تھا جس کی دھوپ کی شدت ہر کوئی محسوس کرتا ہے لیکن پاس جانے سے جان جانے کے خدشات سے چھاؤں میں جانے کی کوشش کرتا ہے۔

چند ماہ میں جمال پور کے تعلیمی اداروں کی طرح رضوان گورنمنٹ کالج میں بھی زندگی کی روحِ رواں بن گیا۔

گورنمنٹ کالج میں وہ پری میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کا طالب علم تھا لیکن اس کی شخصیت پری میڈیکل سے باہر دوسرے ڈیپارٹمنٹوں میں بھی اپنا رنگ جما رہی تھی۔ پری میڈیکل کے سارے اساتذہ اس کی شخصیت کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ بیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ ڈاکٹر نذیر احمد خاص طور پر رضوان سے بہت متاثر تھے۔

ان کا خیال تھا رضوان ڈاکٹر بنے گا تو غیر معمولی ڈاکٹر ثابت ہو گا۔ ڈاکٹری میں خوب نام کمائے گا۔ اور اس کے کام سے دنیا بھر کے مریض فیض یاب ہوں گے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ وہ میڈیکل ریسرچ میں کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام دے۔ اور کسی ایسے لاعلاج مرض کا علاج دریافت کرے جس سے انسانیت کو اجتماعی طور پر فائدہ پہنچے۔

کیمسٹری کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ڈاکٹر بدر کے رضوان کے بارے میں خیالات ڈاکٹر نذیر سے بھی آگے کے تھے۔ ڈاکٹر بدر کا خیال تھ رضوان کیمسٹری کے صدیوں پرانے مسائل حل کرئے گا۔ یا نئے ایسے عناصر دریافت کرئے گا جو ابھی تک انسانیت کے احاطۂ علم میں نہیں۔

رضوان ان سب باتوں سے بے نیاز گورنمنٹ کالج میں تیزی کے ساتھ علمی منازل طے کر رہا تھا جبکہ طالب علموں میں اس کی ہر دلعزیزی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔

گورنمنٹ کالج سے راوی کے نام سے ایک میگزین شائع ہوتا تھا جس میں طالب علموں کی نگارشات شائع ہوتی تھیں۔

راوی میں اس کے چند مضامین کی اشاعت کے بعد نہ صرف اسے راوی کی مجلس ادارت میں شامل کر لیا گیا بلکہ انعام کے طور پر اس کو رہائش کے لیے کالج ہاسٹل میں رہنے کے لیے وہ کمرہ دیا گیا جس میں علامہ اقبال اپنے زمانہ طالب علمی میں رہائش پذیر تھے۔ اقبال والے کمرے میں رہائش پذیر ہونے پر رضوان بہت خوش تھا۔

اگرچہ وہ پری میڈیکل کا طالب علم تھا لیکن ادبیات سے بھی اسے خاص دلچسپی تھی۔

اس لیے علامہ اقبال والے کمرے میں رہائش پذیر ہونا وہ اپنے لیے ایک بہت بڑے اعزاز اورافتخار کی بات سمجھتا تھا۔

رات کی تنہائی میں جب وہ اپنے علمی مشاغل سے فارغ ہو جاتا تو وہ وائلن کی پریکٹس شروع کر دیتا۔

اس کے آس پاس رہنے والے طالب علم اس کے کمرے سے آتی وائلن کی دھنیں سنتے تو اس کے دروازے کے باہر اس وقت تک کھڑے رہتے جب تک وہ کمرے میں بند وائلن بجاتا رہتا۔

رفتہ رفتہ اس کے وائلن بجانے کی خبریں ہاسٹل سے اس کے کلاس روم اور پھر کلاس روم سے پورے کالج میں پھیل گئیں۔

ایک دن بیالوجی کی کلاس میں ڈاکٹر نذیر احمد ضمنی طور پر درختوں پر موسیقی کے اثرات کا ذکر کر رہے تھے کہ چند طالب علموں نے انہیں رات کی تنہائی میں رضوان انجم کی وائلن بجانے کے بارے میں بتایا۔

ڈاکٹر نذیر نے خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کے اور اپنے ہم جماعتوں کے لیے وائلن بجائے۔

ڈاکٹر نذیر صاحب کی خواہش کے احترام میں وہ ہاسٹل جا کر اپنی وائلن اٹھالایا اور پھر ہم جماعتوں کے سامنے کھڑے ہو کر وائلن بجانے لگا۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی دھنیں بجائیں۔ ایک کے بعد دوسری دھن پہلی سے زیادہ سحر انگیز تھی۔

جب وہ اپنے کلاس روم میں اپنے ہم جماعتوں اور ڈاکٹر نذیر کے لیے وائلن بجا رہا تھا کمرے کے باہر کئی طالب علم اور کالج کے دیگر اساتذہ کھڑے ہو کر اس کی وائلن سن رہے تھے۔

اس واقعہ کے بعد گورنمنٹ کالج میں اسے کبھی خود کو کسی سے متعارت کروانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ سب جانتے تھے کہ وہ کون ہے اور سب دل کی گہرائیوں سے اس کا احترام کرتے تھے۔

گورنمٹ کالج میں بھی اس نے اپنی بچپن کی عادت جاری رکھی۔ وہ اپنے اساتذہ سے اپنے پری میڈیکل مضامین کے مختلف تصورات کے بارے میں نت نئے سوال کرتا رہتا تھا لیکن ساتھ ہی دوسرے علوم کے اساتذہ سے بھی مستقل ان کے مضامین کے بنیادی تصورات اور نظریات کی تفہیم کے لیے سرگرم عمل رہتا۔

علم کے حصول کے لیے اس کی یہ غیر نصابی تعلیمی سرگرمیاں لاشعوری طور پر بچپن میں شروع ہوئیں لیکن بعد میں علم کے بارے میں باقاعدہ اس کے اس نقطہ ء نظر کا باعث بنیں کہ علم بنیادی طور پر ایک ہے۔ جو وقت کے ساتھ ارتقا کی منزلوں سے گزرتا متبادل حصوں میں بٹتا اور ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ علم کے ایک ڈسپلن کے اندر کئی ڈسپلن پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے علم کی مکمل تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ انسان تمام علوم کے مبادی تصورات کا یہاں تک فہم حاصل کرے کہ وہ مختلف علوم کے دھاروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا دیکھ سکے۔

رضوان کی جب بھی اپنے اساتذہ میں سے کسی کے ساتھ ان کے سبجیکٹ پر بات ہوتی اس کے سوالات اور طریقہ استدلال سے متاثر ہو کر ان کی خواہش ہوتی کہ وہ ان کے ساتھ گفتگو جاری رکھے۔

گورنمنٹ کالج میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ جب کہ ارد گرد کے دوسرے کالجوں میں یہ صورت حال نہیں تھی۔ اس وجہ سے دوسرے کالجوں کے طالب علموں کی عادت تھی کہ وہ بھی اکثر اوقات گورنمنٹ کالج میں اپنا وقت گزارتے۔

گورنمنٹ کالج کی ٹاک شاپ گورنمنٹ کالج اور دوسرے کالجوں سے آنے والے طالب علموں کی سوشلائزیشن کا بہترین مقام تصور ہوتا تھا۔ گورنمنٹ کالج دنیا کے اندر ایک ایسی دنیا تھی جس میں پاکستان بھر سے آنے والے طالب علم اور طالبات اسے آزادی کے ایک جزیرے سے تعبیر کرتے تھے۔

شہر کے دوسرے کالجوں سے گورنمنٹ کالج آنے والے طالب علموں کی وجہ سے رضوان انجم کی شہرت گورنمنٹ کالج سے نکل کر دوسرے کالجوں میں بھی پہنچ رہی تھی۔

علی کا تعلق ایک انتہائی معمولی گھرانے سے تھا۔ لیکن اس کے باوجود بڑے بڑے خاندانوں کے لڑکوں کی خواہش تھی کہ کاش وہ بھی رضوان بن سکتے۔

لیکن فطرت بھی عجیب چیز ہے۔ وہ ہر چیز کی تخلیق میں ایک جیسا مواد استعمال کرتی ہے لیکن ہر چیز کو اسی نوع کی دوسری چیز سے اس طرح ممیز کرتی ہے کہ اس کی انفرادیت اس کی پہچان بن جاتی ہے۔

عام خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود رضوان انجم کی اپنی ایک پہچان تھی۔ اور دوسرا کوئی چاہتا بھی تو اس سے اس کی پہچان نہیں چھین سکتا تھا۔

رضوان انجم کی ہر دلعزیزی صرف کالج کے لڑکوں تک محدود نہیں تھی۔ کالج کی کئی لڑکیوں نے بھی گدھے کے ساتھ اخبار میں چھپنے والی اس کی تصویر اپنے کمروں میں لگا رکھی تھی۔ اس کی کئی ہم جماعت اور سینیر لڑکیوں میں اس کا قرب پانے اور اس سے دوستی کے لیے مقابلہ چل رہا تھا۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے کوشش کرتیں کہ کسی طرح انہیں اس کے ساتھ چند لمحے گزارنے کا موقع ملے لیکن رضوان زندگی کے اس مرحلے پر ابھی کسی ایسی ریلیشن شپ کے لیے تیار نہیں تھا۔

میٹرک کے امتحان میں نمایاں کامیابی کے موقع پر اس نے گدھے کے ساتھ کھڑے ہو کر جو تصویر بنوائی تھی گورنمنٹ کالج کی لڑکیوں کو اس میں ہالی ووڈ کے کلینٹ ایسٹ ووڈ کی شباہت دکھائی دیتی تھی۔ بلکہ کئی لڑکیاں شوخی کے موڈ میں ایک دوسرے کو یہ کہہ کر چھیڑتی تھیں کہ تمہارے کلینٹ ایسٹ ووڈ کا کیا حال ہے۔

لیکن رضواں انجم فقط رضوان انجم تھا۔ کلینٹ ایسٹ ووڈ نہیں تھا۔ اور نہ ابھی زندگی میں وہ کلینٹ ایسٹ ووڈ بننا چاہتا تھا۔

اس لیے وہ کالج کی لڑکیوں کی ایسی سب ترغیبات کو ایک نگاہِ غلط انداز سے ایسے طریقے سے طرح دے جاتا کہ لڑکیوں کی آتشِ شوق اور بھڑک اٹھتی اور ان کے درمیان اس کی قربت حاصل کرنے کے مقابلے میں مزید شدت آجاتی۔ یہاں تک کہ انہیں رضوان کے ساتھ کھڑے اس گدھے پر رشک آنے لگتا جس پر لکھا تھا: آئی لومائی ڈنکی۔ اوران میں سے ہر ایک لڑکی دل ہی دل میں یہ سوچنے لگتی کاش اس گدھے کی جگہ وہ کھڑی ہوتی اور رضوان نے ہاتھ میں سائن پکڑا ہوتا کہ آئی لومائی۔۔۔۔۔۔ اور آگے ہر لڑکی اپنا نام جوڑ لیتی۔ لیکن رضوان اپنی زندگی گورنمنٹ کالج سے بہت آگے دیکھ رہا تھا۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ اس کی منزل کہاں ہے اور اسے کہاں جانا ہے۔ گورنمنٹ کالج کی دلچسپیاں اس کے لیے نشانِ راہ ضرور تھیں لیکن منزل نہیں تھیں۔

فصل 6

جمال پور میں بہار شباب پر پہنچنے کے بعد بھرپور گرمیوں کی طرف اپنا سفر شروع کرتی تو لُو کی تمازت سے ہر چیز جلنے لگتی۔ سارے میں پہلا سبز رنگ رفتہ رفتہ روپہلے رنگ میں ڈھلنے لگتا۔

گرمی کی تمازت سے درختوں کے پتوں کے رنگ زرد ہونا شروع ہو جاتے اور پھر آندھیاں انہیں شاخوں سے جدا کر کے سارے علاقے میں پھیلا دیتیں۔

چمکتا آفتاب پانی کے ان چھوٹے چھوٹے جوہڑوں کو خشک کر دیتا جن میں گاؤں کے جانور پانی پیتے اور بچے نہاتے تھے۔ خشک ہوتے جوہڑوں میں مچھلیاں تڑپ تڑپ کر مر جاتیں اور مینڈک بہت نیچے بچ جانے والی نمی میں اس وقت تک چھپے رہتے جب تک آسمانی برجوں پر حکمرانی کرنے والے آفتاب کا غصہ ماند نہ پڑ جاتا۔

پھر شمال کی طرف سے ہلکی ہلکی خنک ہواؤں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ان ہواؤں کے دوش پر سوار بادل پورے پنجاب پر اس طرح چھا جاتے جیسے ایک ہی بار دھرتی کی ساری پیاس بجھا دینا چاہتے ہوں۔ آخر کار پانی سے بھرے ہوئے بادلوں میں برسنے کا مقابلہ شروع ہو جاتا۔ اور جمال پور کی سوکھی دھرتی دوبارہ جل تھل ہو جاتی۔

نمی میں چھپے مینڈک اچانک اپنی خاموشی توڑتے اور پھر ان کا بے انت راگ شروع ہو جاتا۔ وہ ساری رات اس طرح ٹراتے کہ ان کی آواز کا اتار چڑھاؤ جمال پور کے باسیوں کے لیے ماؤں کی لوریوں میں بدل جاتا۔

سارے جوہڑ پانی سے دوبارہ بھر جاتے۔ مینڈکوں کی اچھل کود بچوں کو کھیل کود کے نئے مواقع فراہم کرتی۔ بچے مینڈکوں کے پیچھے بھاگتے لیکن مینڈک لمبی چھلانگیں لگا کر ان کی دسترس سے دور نکل

جاتے۔ کبھی کبھار کوئی مینڈک بچوں کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ پر تجسس انداز میں کبھی اس کی ٹانگیں پھیلاتے کبھی اس کا منہ کھول کر اس کے ٹرانے کے میکنزم کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔

رضوان نے بھی بچپن میں کئی بار مینڈک پکڑے اور پھر ان کی ٹانگیں پھیلا کر ان کا مشاہدہ کیا۔ وہ جب بھی مینڈک کی ٹانگیں پھیلاتا اسے لگتا کہ مینڈک بالکل اس جیسا ہے۔

اس خیال کے آتے ہی وہ مینڈک کو چھوڑ دیتا تب مینڈک چھلانگیں لگاتا جوہڑ میں غائب ہو جاتا۔ جب فزیالوجی کی کلاس میں ڈاکٹر نذیر نے مینڈک کا ذکر چھیڑا تو اسے جمال پور کے مینڈک یاد آ گئے۔ سیاہی مائل سبز مینڈک، زرد رنگ کے مینڈک، چھوٹے اور بڑے مینڈک، اور جوہڑ میں تیرتے ان کے چھوٹے چھوٹے بچے اور پھر مچھلی کے بچوں اور مینڈکوں کے بچوں میں تمیز کرنے کے لیے انہیں اٹھانا اور پھر پانی میں واپس چھوڑ دینا۔

ڈاکٹر نذیر نے مینڈکوں کے بارے میں اپنے لیکچر کے آغاز میں کہا کہ ہم آئندہ چند دنوں میں لیبارٹری میں مینڈک کے جسم کو کھول کر اس کے حصے بخرے کریں گے۔ ہم دیکھیں گے مینڈک اور انسانوں کے اعضا میں کتنی مماثلت ہے۔

ہم مینڈک کی جلد کھولیں گے۔ اس کے اندرونی اعضا کا مطالعہ کریں گے، اس کا جگر دیکھیں گے، اس کا دل دیکھیں گے، اس کی ہڈیاں دیکھیں گے، اس کے پھیپھڑے دیکھیں گے، اس کا معدہ دیکھیں گے، اس کے گردے دیکھیں گے، اور نر اور مادہ مینڈک کے جنسی اعضاء کا جائزہ لیں گے تاکہ اس کے جنسی میکنزم کو سمجھ سکیں کہ وہ کس طرح اپنی نسل کو جاری رکھتا ہے۔

ڈاکٹر نذیر صاحب مینڈک کے اعضاء کے بارے میں بول رہے تھے اور طالب علموں اور طالبات کے چہروں پر ابھرنے والے تاثرات ان کی اندرونی کیفیات کا اظہار کر رہے تھے۔ حیرت اور تجسس کی ملی جلی کیفیت مسلسل ان کے چہروں پر رقصاں تھی۔

ڈاکٹر نذیر انہیں بتا رہے تھے کہ مینڈک کے جسمانی اعضاء کا مطالعہ ہم انسانی اعضا کو سمجھنے کے لیے کرتے ہیں۔ مینڈک کی چیر پھاڑ سے آپ کے ڈاکٹر بننے کے سفر کا آغاز ہو گا۔ یہاں آپ مینڈک کے جسم کی چیر پھاڑ کریں گے لیکن میڈیکل کالج میں آپ کو انسانی جسموں کی چیر پھاڑ کا موقع ملے گا۔

ڈاکٹر نذیر اپنے لیکچر میں آج بہت سے ان سوالوں کا جواب فراہم کر رہے تھے جو رضوان کے ذہن میں بچپن میں مینڈک کو دیکھ کر اٹھتے تھے۔ بچپن میں وہ صرف مینڈکوں کی ٹانگیں پھیلا کر انسانوں کے ساتھ ان کی مشابہت کے بارے میں سوچتا تھا اب وہ ان کے اندرونی میکنزم کے بارے میں تفصیلات سن کر حیران ہو رہا تھا کہ مینڈکوں کے بارے میں بچپن میں اس کی سطحی سوچ کس قدر حقیقت کے قریب تھی۔ وہ بے تابی سے اس دن کا منتظر تھا جب اسے لیبارٹری میں واقعتاً مینڈک کی چیر پھاڑ کرنے کا موقع ملے گا۔

وہ مینڈک کے دل و جگر کے ذریعے اپنے دل و جگر کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

زندگی کے عمل سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ وہ بچپن میں جب شیرو کے چاک کے لیے مٹی کے بوتے بناتا تو اس کا ذہن زندگی کی مختلف صورتوں کے بارے میں بھٹکتا رہتا۔

اسے لگتا کہ انسانوں کو انسانی شکل ملنے سے پہلے ان کا بھی بوتا بنتا ہے اور پھر کسی چاک پر انہیں انسانی شکل دے دی جاتی ہے۔ کسی کو مرد بنا دیا جاتا ہے کسی کو عورت۔

پھر اس کا ذہن زندگی کی دوسری صورتوں کی طرف چلا جاتا۔ وہ مچھلیوں کے بارے میں سوچتا، پرندوں کے بارے میں سوچتا، جانوروں کے بارے میں سوچتا۔ زندگی کی مختلف صورتوں سے الجھا اس کا معصوم ذہن گھوم پھر کر گدھوں، گھوڑوں اور بیلوں کی طرف لوٹ آتا۔ اسے ان کی آنکھوں میں شعور کی جھلک دکھائی دیتی۔ اسے لگتا کہ وہ بھی اسے ویسے ہی دیکھتے ہیں جیسے وہ انہیں دیکھتا ہے۔ اور شاید ان کے بھی ایسے ہی جذبات ہیں جیسے اس کے جذبات ہیں۔ لیکن جذبات کے سوال پر اس کا ذہن کچھ الجھ سا جاتا۔ شاید جانوروں میں جذبات نہیں ہوتے۔ وہ سوچتا۔ اگر جذبات نہیں ہوتے تو پھر جانور اپنے بچوں سے

محبت کیوں کرتے ہیں۔ خطرے کی صورت میں ان کی حفاظت کیوں کرتے ہیں کیا وہ یہ سب کچھ بغیر جذبات کے جبلتی سطح پر ایسا کرتے ہیں۔ یا واقعتاً انسانوں کی طرح ان کے بھی احساسات وجذبات ہوتے ہیں۔

وہ چاہتا تھا کہ دل وجگر کی حیاتیاتی سطح سے اٹھ کر نفسیاتی سطح پر ان کے فنکشن کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

پھر بھی وہ سمجھتا تھا کہ یہ ایک اچھا آغاز ہے۔ اگر وہ وجود کی حیاتیاتی فطرت و نوعیت کی تفہیم حاصل کرلے تو اس کے بعد وہ وجود سے ماورا نفسیاتی، جذباتی، شعوری اور روحانی وجود کی تفہیم کی طرف سفر جاری رکھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر نذیر صوفی منش انسان تھے۔ سارا کالج ایک صوفی کی طرح ان کی عزت کرتا تھا۔ انہوں نے یورپ کی کسی یونیورسٹی سے بیالوجی میں پی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔

پی ایچ ڈی کرنے سے پہلے وہ ایک بھڑکیلے نوجوان تھے۔ ان میں ایک خاص طرح کی رعونت پائی جاتی تھی۔ جس کی شکائت ان کا ہر ملنے والا کرتا تھا۔

لیکن یورپ میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ان کی شخصیت سے بھڑکیلا پن بالکل ختم ہو چکا تھا۔ لباس کے بارے میں بھی وہ تقریبا بے نیاز ہو چکے تھے۔

اب بھی صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے لیکن پہناوے میں وہ اہتمام نہیں تھا جو پی ایچ ڈی کرنے سے پہلے ہوتا تھا۔

ان کو مل کر ان پر ایک ایسے پھلدار درخت کا احساس ہوتا تھا جس کا پھل شیریں، چھاؤں گھنیری اور فرحت آور ہو۔

اگر کوئی اس کایاپلٹ کی وجہ پوچھتا تو کہتے کہ یورپ میں پی ایچ ڈی ان کے لیے غار حرا کا تجربہ تھا۔ جہاں انہوں نے زندگی کے ایسے رنگ وروپ دیکھے کہ اس کے چہرے پر چڑھے سارے مصنوعی نقاب اتر گئے۔

وہ رضوان کے لیے ایک آئیڈیل استاد تھے۔ اس کی زندگی سے انہیں مکمل آگاہی حاصل تھی۔ وہ جانتے تھے کہ رضوان جمال پور کے ایک بہت ہی معمولی خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ انہیں اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کا بھی بخوبی اندازہ تھا۔ اس لیے انہوں نے اس پر خصوصی توجہ دینی شروع کر دی۔

وہ چاہتے تھے کہ میڈیکل کالج جانے سے پہلے گورنمنٹ کالج میں اس کے گزرنے والے دو تعلیمی سال اسے ایک ایسی شخصیت میں ڈھال دیں جس کی کامیابیوں اور کامرانیوں کے امکانات لا محدود ہوں۔ انہیں یہ بھی خوب اندازہ تھا کہ ایسی شخصیت کی تعمیر کے لیے انسان کو کن لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ مینڈک کی حیاتیاتی ساخت پر لیکچر ختم ہوا تو انہوں نے رضوان کو کلاس روم میں روک لیا۔ پھر اسے کہنے لگے کہ وہ اس کی وائلن بجانے کی صلاحیت سے بہت متاثر ہیں۔

وہ چاہتے ہیں کہ کسی شام کالج کے اوپن ایر تھیٹر میں وہ پورے کالج کے طالب علموں کے لیے وائلن بجائے۔ بلکہ اگر ہو سکے تو ارد گرد کے دوسرے کالجوں میں بھی اس کے کنسرٹ کی تشہیر کی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ طالب علم اس میں شامل ہو سکیں۔

رضوان کے اوکے کرنے پر انہوں نے کالج کی میوزیکل کمیٹی کے ارکان سے کہا کہ وہ اس کے وائلن کنسرٹ کا اہتمام کریں۔

ڈاکٹر نذیر کی درخواست پر میوزیکل کمیٹی نے چند ہفتوں کے بعد کنسرٹ کی تاریخ مقرر کر کے شہر کے سب کالجوں میں اس کی تشہیر شروع کر دی۔

رضوان کے کنسرٹ کی خبر سے گورنمنٹ کالج کے تمام طلبا اور طالبات میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دوسرے کالجوں میں بھی طالب علموں نے کنسرٹ میں شمولیت کے لیے بڑی تعداد میں ٹکٹ خریدے۔ پہلے وہ گورنمنٹ کالج کی طالبات سے آنکھ مٹکّے کے لیے وہاں آتے تھے اور اب ان کے پاس گورنمنٹ کالج میں ایک اچھی شام گزارنے کی بہترین وجہ موجود تھی۔

میوزیکل کمیٹی نے کنسرٹ کو فائنل شکل دینے کے لیے آخری بار ڈاکٹر نذیر اور رضوان سے میٹنگ کی اور انہیں اس سلسلے میں کئے گئے اقدامات کی اطلاع دی۔

پھر انہوں نے رضوان سے پوچھا کہ اگر اس کے ذہن میں کوئی خاص بات ہو تو وہ اس کا بندوبست کر سکتے ہیں۔

رضوان نے کہا کہ وہ چاہتا ہے کہ جب وہ کنسرٹ کے لیے پنڈال سجائیں تو اسٹیج کے اوپر اس کی گدھے کے ساتھ کھینچی گئی تصویر کو بڑا کرواکے ضرور سجائیں۔

رضوان کی خواہش جان کر ڈاکٹر نذیر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے رضوان زندگی میں جہاں جہاں جائے گا جمال پور ہمیشہ اس کے ساتھ جائے گا۔ کوئی اس کو جمال پور سے کبھی جدا نہیں کر پائے گا۔

فصل 7

رضوان جمال پور سے جدا ہوتا بھی تو کیسے۔ اس کا وجود جمال پور کی مٹی سے بنا تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھا جمال پور کی وجہ سے تھا۔ بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ چاک کے پاس بیٹھ کر مٹی کے بوتے بنانے سے لے کر پاکستان کے بہترین تعلیمی ادارے گورنمنٹ کالج تک کے سفر میں اس کی زندگی کے ہر لمحے پر جمال پور کی مہر لگی تھی۔ جمال پور کے کھلے ماحول نے اسے اتنا کچھ دیا تھا کہ وہ ساری زندگی با آسانی جمال پور کی اس دین کے سہارے گزار سکتا تھا۔

میٹرک کے امتحان میں نمایاں کامیابی کے بعد اس نے ان جانے میں معصومیت سے گدھے کے ساتھ جو تصویر بنوائی تھی وہ رفتہ رفتہ اس کا ٹریڈ مارک بنتی جا رہی تھی۔ اور گدھے پر لگا "آئی لو مائی ڈنکی" کا سائن ملک کی کئی چھوٹی موٹی کمپنیوں کو اس تصویر کو اپنی کمپنی کی پروموشن کے لیے استعمال کرنے پر اکسا رہا تھا۔

اس سلسلے میں کئی کمپنیوں نے اس کے ساتھ رابطہ قائم کیا کہ وہ اس تصویر کے حقوق انہیں بیچ دے۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ تصویر اس کے لیے اتنی قیمتی ہے کہ وہ اس کے استعمال کے حقوق کسی کمپنی کو بیچنے کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہے۔ وہ کہتا اس تصویر میں اس کا ماضی، حال اور مستقبل پنہاں ہے۔ وہ کس طرح اپنے ماضی، حال اور مستقبل کو ایک ساتھ بیچ سکتا ہے۔ ماضی وہ ہے جو گزر چکا ہے۔ حال وہ ہے جو گزر رہا ہے۔ اور مستقبل وہ ہے جو ابھی اپنی تمام کامرانیوں کے ساتھ اس کا منتظر ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا ماضی، حال اور مستقبل چند سکوں کے لیے کسی کمپنی کا رہن بن جائے اور وہ اسے اپنی مصنوعات کی پروموشن کے لیے استعمال کرتے رہیں۔

گورنمنٹ کالج کی میوزیکل کمیٹی نے چند دنوں میں رضوان کے وائلن کے کنسرٹ کو اتنا مشتہر کیا کہ گورنمنٹ کالج کے طالب علموں کے علاوہ شہر کے دیگر کالجوں کے طالب علموں میں بھی اس کنسرٹ میں شمولیت کے لیے ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ انہوں نے کنسرٹ کی ٹکٹیں اس طرح دھڑا دھڑ خریدیں جیسے ملک کا کوئی بہت نامور موسیقار اپنے فن کا مظاہرہ کرنے جارہا ہو۔

پاکستان میں موسیقی کی محفلیں پہلے بھی ہوتی تھیں لیکن اس محفل کی بات ہی کچھ اور تھی۔ پہلے لوگ چھوٹی چھوٹی محفلوں میں گلوکاروں سے گیت سنتے اور موسیقی کا لطف اٹھاتے تھے لیکن اتنے بڑے پیمانے پر موسیقی کا کنسرٹ شاید پہلی بار ہونے جارہا تھا۔

گورنمنٹ کالج کی میوزیکل کمیٹی گاہے بگاہے کالج کی سطح پر گائیکی کے پروگراموں کا اہتمام کرتی رہتی تھی اور کبھی کبھار ملک کے نامور گائیک وہاں آکر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور داد پاتے تھے لیکن کالج کے ایک طالب علم کا اتنا بڑا کنسرٹ گورنمنٹ کالج کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔

بیالوجی کی کلاس میں رضوان کی ایک پرفارمنس نے جو سماں باندھا تھا اور جس طرح برآمدے میں کھڑے ہو کر کلاس روم کے باہر دیگر طالب علموں اور اساتذہ نے اس کی پرفارمنس سے لطف اٹھایا تھا وہ کسی کو بھولا نہیں تھا۔ اب اس کے وہی ساتھی طالب علم اور اساتذہ اس کے کنسرٹ کی تشہیر میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے اور سب کو بتا رہے تھے کہ ایک بہت بڑے مگر تاحال انجانے فنکار کے فن سے لطف اندوز ہونے کا یہ موقع انہیں کسی صورت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

یہ موسم بہار کی ایک خوبصورت شام تھی۔ گورنمنٹ کالج کے سارے لان خوشبودار پھولوں کی خوشبو سے مہک رہے تھے۔ سارے کالج کی فضا پر ایک عجیب بے خودی طاری تھی۔

یہ وائلن کے کنسرٹ کے لیے ایک پرفیکٹ شام تھی۔ گورنمنٹ کالج کا اوپن ایر تھیٹر لڑکوں اور لڑکیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اسٹیج کے پیچھے رضوان کی خواہش کے مطابق میوزیکل کمیٹی کے ممبران نے اس کی گدھے کے ساتھ کھنچی ہوئی تصویر بہت بڑے کینوس پر بنوا کر آویزاں کر رکھی تھی۔ بڑے کینوس پر

پر منتقل ہونے کے بعد تصویر کی جاذبیت میں اور بھی اضافہ ہو چکا تھا۔

ایسے لگتا تھا جیسے ہالی ووڈ کا کوئی بہت بڑا ایکٹر گدھے کے ساتھ کسی طویل سفر پر جا رہا ہو اور چند لمحوں کے لیے رک کر اپنے راستے کا تعین کر رہا ہو۔

تصویر میں گدھے کے تاثرات بھی قیامت ڈھا رہے تھے۔ جس طرح تصویر میں وہ گدھا گردن کو ہلکا سا خم دے کر بیک وقت رضوان اور راستے کو دیکھ رہا تھا اس سے لگتا تھا کہ اس میں اور رضوان میں گہرا تعلق ہے۔ وہ دونوں زندگی کے راستے کے مسافر ہیں۔ اور زندگی کی اس راہ پر ایک ساتھ چل رہے ہیں اور یونہی ساتھ ساتھ چلنے کا عزم رکھتے ہیں۔

اوپن ایر تھیٹر کے پاس اوول میں لگے درختوں کی اوٹ میں گہرا نیلا کھلا آسمان ماحول کو اور بھی سحر انگیز بنا رہا تھا۔

ایسے میں ڈاکٹر نذیر اور رضوان آہستہ آہستہ چلتے اسٹیج پر آئے تو تھیٹر میں موجود لڑکے اور لڑکیوں نے اس طرح سیٹیوں، تالیوں اور ہاو ہو سے ان کا استقبال کیا کے گورنمنٹ کالج کے اوپن ایر تھیٹر نے پہلے کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔

ڈاکٹر نذیر اسٹیج پر آکر اسپیکر کے سامنے کھڑے ہوئے اور رضوان ان سے چند قدم پیچھے وائلن بائیں کندھے اور بازو پر رکھے دایں ہاتھ میں وائلن کی باو پکڑے اس طرح کھڑا ہوا کہ سارا منظر اسٹیج پر آویزاں تصویر کا حصہ بن گیا۔

ڈاکٹر نذیر نے انتہائی انکساری کے ساتھ اوپن ایر تھیٹر میں بیٹھے حاضریں سے مخاطب ہو کر کہا:

"عزیز بچو آج میرے لیے بہت مسرت کا دن ہے۔ میں کالج کے مختلف فنکشنوں میں کئی بار اس اسٹیج پر کھڑا ہو کر اپنے طالب علموں سے مخاطب ہو چکا ہوں لیکن آج مجھے یہاں کھڑے ہو کر جو خوشی محسوس ہو رہی ہے اس کا اظہار کرنے کے لیے میرے پاس حقیقی معنوں میں کوئی الفاظ نہیں۔

میں نے اپنی زندگی کی کئی سال یورپ میں گزارے ہیں۔ وہاں میں موسیقی کے بہت سے کنسرٹ دیکھے ہیں لیکن آج آپ موسیقی کے حوالے سے جو تجربہ کرنے جارہے ہیں میں گارنٹی سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ اسے کبھی نہیں بھول پائیں گے۔

رضوان پری میڈیکل سائنس کا طالب علم ہے لیکن اسے وائلن بجانے میں جو کمال حاصل ہے میں نے وہ کسی اور وائلنسٹ میں نہیں دیکھا۔ میں نے کچھ طالب علموں سے سنا تھا کہ وہ رات کے وقت تنہائی میں اپنے کمرے میں وائلن بجاتا ہے اور وہ اس وقت تک بر آمدے میں کھڑے رہتے ہیں جب تک وہ وائلن بجاتا رہتا ہے۔

اس کے وائلن بجانے کا مظاہرہ میں نے چند دن پہلے اپنے کلاس روم میں دیکھا تھا۔ لیکچر کے دوران موسیقی کے پودوں پر اثرات پر بات ہو رہی تھی کہ کسی طالب علم نے رضوان کے وائلن بجانے کے بارے میں انکشاف کیا۔

میری خواہش اور درخواست پر رضوان نے ہمارے لیے وائلن بجائی تو ہمیں پتہ چلا کہ ہمیں اپنے درمیان ایک کتنے بڑے وائلنسٹ کی موجودگی کی سعادت حاصل ہے۔

گورنمنٹ کالج کی تاریخ بہت عظیم ہے۔ علم وادب کے کتنے بڑے بڑے نام اس کالج کی تاریخ کا حصہ رہے ہیں۔ ان بڑے ناموں میں سے کئی یہاں طالب علم کی حثیت سے آئے اور چلے گئے اور کئی ایک نے یہاں بطور استاد خدمات سرانجام دیں۔ لیکن موسیقی کے حوالے سے رضوان سے پہلے کوئی اتنا بڑا فنکار یہاں بطور طالب علم نہیں آیا اور میں نہیں سمجھتا کہ شاید اس کے بعد بھی کوئی آئے۔

رضوان نے وائلن ہائی اسکول کے ابتدائی سالوں میں اسکول کے میوزک ٹیچر سے شوقیہ سیکھنا شروع کیا تھا اور پھر مسلسل محنت اور مشقت اور اپنی تخلیقی قوت سے اس طرح اس کے اسرار و رموز پر عبور حاصل کیا ہے کوئی اور اس کا جواب پیش نہیں کر سکتا۔

میں رضوان سے پہلے اتنی باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اگر میں یہ سب باتیں نہ کہتا تو شاید اس کے ساتھ ناانصافی ہوتی۔ اور پھر ویسے بھی آپ کے سامنے رضوان کو بطور وائلنسٹ پیش کرتے ہوئے مجھے جو خوشی ہو رہی ہے اگر میں اس کا اظہار نہ کرتا تو شاید میرے لیے خوشی کے ان جذبات کو پراسس کرنا مشکل ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رضوان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ آپ کو اپنے فن سے محظوظ کرے۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر نذیر صاحب نے اسپیکر رضوان کے وائلن کے سامنے ایڈجسٹ کر دیا۔ رضوان نے اسی طرح وائلن بائیں کندھے اور بازو پر رکھے اور اپنی انگلیاں وائلن کے نچلے حصے پر جماتے ہوئے دائیں بازو سے باو کو وائلن کی تاروں پر چند سر بجائے اور پھر اوپن ایر تھیٹر میں بیٹھے لڑکوں اور لڑکیوں سے بولا:

"موسیقی اور انسان کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ انسان آغاز تہذیب سے مختلف طریقوں سے موسیقی تخلیق کرتا اور اس سے لطف اندوز ہوتا آ رہا ہے۔ استادِ محترم ڈاکٹر نذیر صاحب نے میرے بارے میں جو ریمارکس دیئے ہیں میں ان کے لیے ان کا شکر گزار ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے وائلن بجانے کا معیار کیا ہے۔ میں نے کبھی کسی کنسرٹ میں حصہ نہیں لیا۔ میں نے وائلن کے اپنے استاد کے علاوہ کسی دوسرے استاد کے سامنے کبھی وائلن نہیں بجائی۔ اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کیسی وائلن بجاتا ہوں۔

لیکن میں آپ سب سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ میں جب وائلن بجاؤں تو اپ اپنے ذہنوں اور جسموں کو آزاد چھوڑ دیں۔ انہیں میری وائلن کے سروں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس خوبصورت ماحول میں آج کی خوبصورت شام آپ کے لیے اور بھی خوبصورت ہو جائے گی۔ کیونکہ میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وائلن میں انسانی موڈ کی مختلف کیفیتوں کو اپنے ساتھ بہالے جانے کی کتنی زبردست طاقت پنہاں ہے۔"

یہ کہہ کر رضوان نے وائلن پر دھیرے دھیرے حاضرین کو سنجیدہ بنانے کے لیے ڈیو شنل ٹیونز بجانا شروع کیں تو سارے پنڈال میں مکمل سکوت چھا گیا۔ پنڈال میں بیٹھے ہوئے انسان تو انسان آس پاس کے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے تک خاموش ہو گئے۔

وہ کوئی پندرہ منٹ تک اسی طرح وائلن پر خواب آور دھنیں بجاتا رہا۔ جن سے سارا مجمع ذہنی طور پر شعور اور لاشعور کی درمیانی حالت میں تیر تا رہا۔ پھر اس نے آہستگی کے ساتھ جیسے کوئی سوئے ہوئے فرد کو جگاتا ہے خواب آور دھنوں کے ساتھ مکس کر کے خوشی کی دھنیں بجانا شروع کر دیں۔ سارا مجمع چند ثانیوں میں شعور و لاشعور کی حالت سے نکل آیا اور سب حاضرین کے چہروں پر خوشی ساون بھادوں کی دھوپ چھاؤں کی طرح آنے اور جانے لگی۔ لحظہ بھر ان کے چہروں پر مسرت پھیل جاتی پھر سنجید گی آ جاتی۔ کافی دیر تک اس نے سارے مجمع پر وائلن کی دھنوں سے سنجید گی اور مسرت کا یہ موڈ طاری رکھا۔ دھن شروع ہوتی تو سب مسکرا اٹھتے دھن ختم ہوتی تو سب سنجیدہ ہو جاتے۔ وہ دیر تک حاضرین کو موڈ کے ادل بدل کے اس جھولے میں جھلا تا رہا۔ پھر حاضرین کو ذہنی طور پر ایک عجیب کیفیت میں لا کر اس نے غم کی دھنیں بجانا شروع کر دیں۔

غم کی دھنوں سے سارا مجمع غم کی کیفیت میں ڈوب گیا۔ سب سر جھکا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ سب پر اس طرح کی کیفیت طاری تھی جیسے پانی میں بیٹھے ہیں اور پانی رفتہ رفتہ ان کے جسموں کے گرد بلند ہو تا جارہا ہے۔ اور عنقریب پانی ان کے سروں سے اوپر چلا جائے گا اور وہ سب اس میں ڈوب جائیں گے۔

وہ شام یقینا رضوان وائلنسٹ کی شام تھی جس نے اپنی وائلن کی دھنوں سے اوپن ایر تھیٹر میں بیٹھے ہزاروں لڑکوں اور لڑکیوں کے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

ایک اچھے آرٹسٹ کی طرح وہ جانتا تھا کہ شام کا اختتام غم واندوہ کی ایسی کیفیت پر نہیں ہونا چاہیئے کہ اس کے سننے والے دکھی حالت میں وہاں سے اٹھیں اور اپنے گھروں کو جائیں۔ لہذا اس نے غم کی دھنوں

کو رفتہ رفتہ رومانس کی دھنوں میں بدل دیا۔ سارا مجمع غم کے دریا سے بھیگے بدنوں کے ساتھ باہر نکل آیا اور سب پر عشق و محبت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے انہیں اگلے دس پندرہ منٹ تک عشق و محبت کی کیفیت میں رکھا اور پھر یہ سوچ کر کہ عشق محبت کا انجام عشق کی کامیابی پر ہونا چاہیے اس نے پارٹی دھنیں بجانا شروع کر دیں۔

پارٹی کی دھنیں کیا بجنا شروع ہوئیں پنڈال میں بیٹھے سب لڑکے لڑکیاں اپنی جگہوں پر اٹھ کر رقص کرنا شروع ہو گئے۔ جب وہ ناچتے ناچتے تھکنے لگے تو رضوان نے وائلن پر باو کو دو تین جھٹکے دیئے اور پھر وائلن بجانا روک کر ایک پیشہ ور فنکار کی طرح اسٹیج پر ان کے سامنے آدھا جھک گیا۔

سارا پنڈال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ اس نے اگلی سیٹ پر بیٹھے ڈاکٹر نذیر کو دیکھا ان کی آنکھوں میں آنسو تھے جنہیں وہ رومال سے پونچھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

فصل 8

اوپن ایر تھیٹر میں کنسرٹ رضوان کی پہلی عوامی پرفارمنس تھی۔ اس پرفارمنس کی شاندار کامیابی سے اسے ایک نیا اعتماد ملا۔ خاص طور پر اگلے دن جب اخبارات نے گورنمنٹ کالج میں ہونے والے اس کنسرٹ پر اپنے تبصروں میں رضوان کو زبردست خراج تحسین پیش کیا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

کئی برسوں سے اس کے اندر جو فنکار اپنی تراش خراش اور نشوونما میں مصروف تھا اس پرفارمنس سے عوام کی نظروں میں آ چکا تھا۔ اخبارات میں رپورٹوں اور تبصروں کے بعد بہت سے کمرشیل گروپوں نے اس سے رابطہ کیا کہ وہ تجارتی بنیادوں پر اپنی موسیقی کی صلاحیتوں کی ترویج و اشاعت کرے۔ خود بھی پیسے بنائے اور ان کے بھی بنوائے۔ لیکن فنکار بننا رضوان کی منزل نہیں تھی۔ اس کو زندگی کے اسرار و رموز سے زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ چاہتا تھا پہلے وہ ڈاکٹر بنے اور اس کے بعد میڈیسن کی پریکٹس کے علاوہ حیاتیات میں ریسرچ کا عمل جاری رکھے۔

کنسرٹ سے جتنی رقم جمع ہوئی اس نے گورنمنٹ کالج کی میوزیکل سوسائٹی کو دے دی تا کہ وہ فنون لطیفہ کی طرف زیادہ سے زیادہ طالب علموں کو مائل کریں۔ اس کا کہنا تھا کہ موسیقی انسان کی ذہنی بالیدگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔

موسیقی سیکھنے سے انسان کا حافظہ مضبوط ہوتا ہے۔ چیزوں کے افہام کی استعداد بڑھ جاتی ہے اور انسان کا خود پر اور زندگی پر اعتماد بڑھ جاتا ہے۔

چوہدری نثار نے اپنے چیمبر میں اس دن کے اخبارات میں رضوان کی گدھے کے ساتھ بڑی سی تصویر کے پیش منظر میں اسٹیج پر اس کی وائلن بجاتے ہوئے تصویر دیکھی اور ساتھ اسکی پرفارمنس کے بارے میں

زبردست قسم کے تبصرے دیکھے تو اس دن وہ جلدی چھٹی کر کے بغل میں اخبار دبائے شیرو کے گھر جا پہنچا۔

شیرو حسب معمول اپنے روزمرہ کے کاموں سے فارغ ہو کر گھر کے باہر چارپائی بچھائے بیٹھا تھا۔ چوہدری نثار نے اخبار کھول کر شیرو کے سامنے رکھ دی۔ شیرو کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا تھا لیکن اخبار میں رضوان کی تصویر دیکھتے ہی اس نے اپنی بیوی نگو کو آواز دی۔

"نگو آؤ دیکھو اخبار میں ہمارے رجو کی تصویر چھپی ہے۔" خوشی کے امڈتے ہوئے جذبات میں وہ بھول گیا تھا کہ اب اس کے بیٹے کا نام رجو نہیں رضوان تھا۔ حالانکہ جب سے پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسے رضوان نام دیا تھا اگر کوئی غلطی سے اسے رجو کہتا تو وہ اس سے لڑ پڑتا۔ آج جذبات سے مغلوب ہو کر وہ خود اسے رجو کہہ کر پکار رہا تھا۔

نگو شیرو کی آواز سن کر بھاگتی ہوئی گھر سے باہر آئی۔ وہ شام کا کھانا بنانے کے لیے سبزی کاٹ رہی تھی۔ سبزی کے کچھ ریشے ابھی تک اس کی ہاتھوں پر دکھائی دے رہے تھے۔

گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہی پہلے اس نے شیرو کو ڈانٹ پلائی: "شیرو تم بھول رہے ہو۔ ہمارے بیٹے کا نام رجو نہیں رضوان ہے۔" پھر اخبار پر اپنے بیٹے کی تصویر دیکھ کر اس نے اخبار اٹھا کر تصویر کو چوم لیا۔ پھر وہ رونے لگی۔ چوہدری نثار نے اسے تسلی دی۔

"بھابی تمیں تو خوش ہونا چاہیئے۔ اس اخبار میں لکھا ہے کہ رضوان نے ہزاروں طالب علموں کے سامنے وائلن بجا کر ان سب کو بے خود کر دیا۔"

"لیکن وہ تو ڈاکٹر بننے گیا تھا۔ کیا اب میرا بیٹا ڈاکٹر نہیں بنے گا؟" نگو نے چوہدری نثار سے پوچھا۔ "اخبار میں لکھا ہے کہ وہ اب بھی اپنا دھیان ڈاکٹری میں لگائے گا۔ اس لیے انہیں فکر مند نہیں ہونا چاہیئے۔" چوہدری نثار نے جواب دیا۔

" اور یہ گدھے والی تصویر ہر وقت کیوں ساتھ اٹھائے رکھتا ہے۔ کیا پوری دنیا کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ ایک کمہار کا بیٹا ہے؟"

"نہیں بھابی وہ دنیا کو بتانا چاہتا ہے کہ کسی دھوبی، تیلی، نائی، موچی یا کمہار کا بیٹا ہونے میں کوئی برائی نہیں۔ اور یہ کہ اگر دل لگا کر محنت کریں تو ان کے بیٹے بیٹیاں بھی زندگی میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔"

آس پاس محلے میں کھیلتے بچوں نے شیرو، نگو اور چوہدری نثار کو اس اشتیاق سے اخبار دیکھتے دیکھا تو وہ بھی چارپائی کے گرد جمع ہو گئے۔

اخبار میں رضوان کی تصویر دیکھ کر انہوں نے شور سے سارا محلہ سر پر اٹھالیا کہ رضوان بھائی کی اخبار میں تصویر چھپی ہے۔ محلے کے مردوں اور عورتوں نے بغیر پوچھے کہ اخبار میں رضوان کی تصویر کیوں چھپی ہے شیرو اور نگو کو مبارک باد دی کہ ان کا بیٹا شہر میں نمایاں کامیابیاں حاصل کر رہا ہے۔

ادھر گورنمنٹ کالج اور شہر کے دیگر کالجوں میں بھی طالب علموں نے رضوان کی کنسرٹ کی تفصیلات کو خصوصی دلچسپی سے پڑھا۔ وہ اس کنسرٹ کی وجہ سے شہر کی تعلیمی زندگی کا ہیرو بن چکا تھا۔ وہ جہاں جاتا سب طالب علم جانتے کہ وہ کون ہے۔

گورنمنٹ کالج کی لڑکیوں میں رضوان کا قرب پانے کے لیے مقابلہ مجادلے کی شکل اختیار کرنے لگا تھا۔ کئی لڑکیوں نے سہیلیوں کو جلانے کے لیے یونہی کہانیاں گھڑنی شروع کر دیں۔

کوئی کہتی کہ رضوان نے آج اسے ٹک شاپ پر چائے کی دعوت دی ہے۔ کوئی کہتی کہ رضوان نے اس کے ساتھ آج لارڈز پر ڈنر کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ کوئی کہتی اس نے رضوان سے وائلن سکھانے کی لیے درخواست کی تھی اور وہ تیار ہو گیا ہے کہ وہ اسے وائلن سکھائے گا۔ لیکن رضوان ان سب باتوں سے دور، ان سب کہانیوں سے پرے، اپنی پڑھائی کی طرف پورے انہماک سے متوجہ تھا۔

بیالوجی، فزکس اور کمسٹری کے اساتذہ کے ساتھ وہ زیادہ سے زیادہ اپنا وقت گزارتا۔ اسے غیر نامیاتی اور

نامیاتی مادے کی ساختیات میں خاص دلچسپی تھی۔ پھر مادے کے اندر چھپی قوتوں کے بارے میں وہ زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا۔ جس طرح وہ قوتیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی تھیں ان کے میکنزم کو سمجھنا چاہتا تھا۔ اور پھر کائناتی لیول پر ان کی جو شکل بنتی تھی اس کی تفہیم چاہتا تھا۔

اس حوالے سے اس کا بیالوجی، کمسٹری اور فزکس کے اساتذہ کے ساتھ ہمہ وقت مکالمہ جاری رہتا۔ کبھی کبھی فزکس اور کیمسٹری کے استاد اس کی تکرار سے تنگ آ جاتے لیکن پھر ڈاکٹر نذیر صاحب کے سمجھانے پر وہ دوبارہ اس کے ساتھ اسی طرح سلسلہ جنبانی شروع کر دیتے۔

رضوان بہت خوشگوار اور اچھی شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ وقت گزار کر اس سے ملنے والے خوشی محسوس کرتے۔ اس کے فزکس کیمسٹری کے اساتذہ بھی اس کی شخصیت سے بہت متاثر تھے لیکن وہ اس کے سوالوں سے پریشان ہوتے تھے کیونکہ کئی سوالوں کا ان کے پاس جواب نہیں ہوتا تھا۔ یا ان سوالوں میں اتنی گہرائی ہوتی تھی کہ اس کی وضاحت کے لیے خود انہیں اپنے اندر اترنا پڑتا تھا۔ اپنے علم کے سارے خزانے کو کھنگالنا پڑتا تھا۔ پھر بھی رضوان کی آنکھوں سے صاف نظر آنے والا اشتیاق اور ناآسودگی انہیں کھٹکتی۔ وہ محسوس کرتے کہ وہ اس کو مطمئن نہیں کر سکے۔

لیکن ڈاکٹر نذیر کی بات اور تھی۔ وہ ایک اچھے استاد کا مکمل نمونہ تھے۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت نے ان کے ادراک کو اتنا کشادہ کر دیا تھا کہ وہ جس قدر بیالوجی کو سمجھتے تھے اسی قدر زندگی کے دیگر عوامل میں بھی انہیں دسترس حاصل تھی۔

دراصل ڈاکٹر نذیر گورنمنٹ کالج کی ان چند ہستیوں میں شامل تھے جنہیں اپنی زندگی میں علم کے ان سرچشموں تک رسائی حاصل تھی جو انسان کو ادھورا عالم بنانے کی بجائے مکمل انسان بناتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا ہر طالب علم محسوس کرتا تھا کہ وہ صرف اسے بیالوجی کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ زندگی سے عشق کرنا سکھاتے ہیں۔

رضوان میں چھپی جاننے کی بے اتھاہ خواہش اور ڈاکٹر نذیر کی بہار کے بادل کی طرح برسنے کی عادت میں ایک خاص ملاپ پیدا ہو چکا تھا جس سے رضوان رفتہ رفتہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک طرف انہوں نے رضوان کو ایک کامیاب کنسرٹ کے ذریعے اس کے اندر چھپے رضوان سے ملایا تھا تو دوسری طرف بیالوجی کے تصوارات کو اس کے ذہن کا حصہ بنا کر اس کی ڈاکٹر بننے کی خواہش کی تکمیل کا سامان کر رہے تھے۔

ان کے دل میں رضوان کی خیر خواہی اور محبت اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب اس نے بڑی بڑی کمپنیوں کی اس کی گدھے کے ساتھ تصویر کے حقوق خریدنے کی پیشکش ٹھکرائی۔ پھر موسیقی کے گروپوں کی طرف سے اس کے وائلن کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی درخواست رد کی۔ اور پھر کنسرٹ کی ٹکٹوں سے جمع ہونے والے ہزاروں روپے یہ کہہ کر وصول کرنے سے انکار کیا کہ میوزیکل کمیٹی ان روپوں کو فنون لطیفہ کی ترویج کے لیے استعمال کرے۔

ڈاکٹر نذیر کو رضوان کی شکل میں آسمان پر ابھرتا ہوا ایک ایسا ستارہ واضح طور پور نظر آ رہا تھا جس سے انسانیت جائز طور پر بھلائی کی توقع رکھ سکتی تھی۔

اس لیے ان کی کوشش تھی کہ وہ گورنمنٹ کالج میں بھی اپنی میٹرک والی کامیابی کو دہرائے تاکہ اسے اچھے میڈیکل کالج میں داخلہ ملے۔ اور وہ ڈاکٹر بن کر اپنے لوگوں کی خدمت کر سکے۔

ڈاکٹر نذیر کو یہ بھی اندازہ تھا کہ رضوان کی شخصیت میں جتنا تجسس ہے وہ فقط ڈاکٹری کی تعلیم سے ختم نہیں ہو گا۔ اس کی افتاد طبع اسے نئے راستوں پر لے جائے گی۔ اس کے قدم ان منزلوں تک پہنچیں گے جن تک ابھی انسانی تصور رسائی حاصل نہیں کر سکا۔

لیکن رضوان ان تمام سوچوں سے بے نیاز تھا۔ اس میں ایک دُھن تھی جو اسے اکساتی تھی کہ زندگی کی تہہ تک پہنچنا ہے۔ اس مٹی تک رسائی حاصل کرنی ہے جس سے انسانوں کے بوتے بنتے ہیں۔ اس چاک کا مشاہدہ کرنا ہے جہاں ان بوتوں کو انسانی شکل دی جاتی ہے۔ اور اگر ہو سکے تو اس ذات تک رسائی حاصل

کرنی ہے جو اس چاک کو چلاتی ہے جس پر رکھے مٹی کے بوتے انسانوں کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں اور مردوں اور عورتوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر ان میں ایک کشش پیدا ہوتی ہے۔ کشش ایک شعلے کی صورت اختیار کرتی ہے اور اس طرح زندگی کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

وائلن سے اس کی محبت بھی اسی وجہ سے تھی۔ رات کی تنہائی میں جب پرندے اپنے گھونسلوں اور انسان اپنے بستروں میں سو جاتے وہ وائلن بجانا شروع ہو جاتا۔

اسے محسوس ہوتا کہ وائلن کی دھنوں کے ذریعے کائنات اس سے ہمکلام ہے اور رفتہ رفتہ اس پر اپنے اسرار کا انکشاف کر رہی ہے۔ چاند ستارے اس کے ہمسفر ہیں۔ اور ایک خاص قسم کی لامحدودیت اس کی منتظر ہے جہاں اس کے سوا کوئی نہیں۔

صرف وہ ہے اور اس کی وائلن۔ اور وائلن سے دھیرے دھیرے اٹھتی دھنیں۔ اور ایک ابدی مسرت کا احساس۔

فصل 9

گورنمنٹ کالج میں رضوان کے دو سال ایک خوشگوار خواب کی طرح گزر گئے۔ ان دو برسوں میں اس کے ذہن میں جمال پور کی معاشرتی اقدار کی جگہ رفتہ رفتہ شہری اقدار نے لے لی۔

پہلے اس کی زندگی میں جو کچھ بھی تھا فقط جمال پور تھا۔ اور جمال پور سے باہر کسی چیز کا کوئی مطلب اور مفہوم نہیں تھا۔ لیکن اب جمال پور دنیا کے نقشے پر نہ ہونے کے برابر تھا۔ بلکہ پاکستان بھی ایک غیر اہم ملک تھا جس کی بین الاقوامی دنیا میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ایک چھوٹا سا غیر اہم ملک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا۔ کبھی جینے کی امنگ سے آنکھیں کھولتا اور کبھی موت کے کرب سے آنکھیں موندتا۔

ایف ایس سی کے امتحان ہو چکے تھے اور جمال پور واپس جانے کی بجائے وہ وہیں ہاسٹل میں قیام پذیر امتحانات کے نتائج کا انتظار کر رہا تھا۔

اس کی عین توقع کے مطابق ایف ایس سی میں بھی اس نے پنجاب میں ٹاپ کیا تھا۔ بلکہ اس بار اس نے سارے پرانے ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔ آج تک کسی نے ایف ایس سی میں اتنے مارکس حاصل نہیں کئے تھے جتنے اس نے۔

سارا گورنمنٹ کالج اس کی کامیابی پر خوشی کے شادیانے بجا رہا تھا۔ خاص طور پر ڈاکٹر نذیر اور اس کے دوسرے سائنس ٹیچر اس کی بے مثال کامیابی پر بہت خوش تھے۔

جمال پور میں چوہدری نثار کے توسط سے شیرو اور نگو کو بھی ایف ایس سی میں رضوان کی شاندار کامیابی کی خبر مل چکی تھی۔ اخبار میں گورنمنٹ کالج کا طالب علم ہونے کے علاوہ ایک بار پھر اس کی فیملی ہسٹری دہرائی گئی تھی۔ جس میں اس کے ایک معمولی کمہار کا بیٹا اور جمال پور کا رہائشی ہونے کی تفصیل تھی۔ اس خبر سے چوہدری نثار، شیرو، اور نگو تو خوش تھے ہی باقی سارا جمال پور بھی خوش تھا۔ لیکن ساتھ ہی گاؤں

والوں میں رضوان کی کامیابیوں کی وجہ سے دبے دبے لفظوں میں ایک نئی بات چل نکلی تھی۔ گاہے بگاہے ادھر ادھر بیٹھے گاؤں کے سیانے اس بات پر اپنے شک کا اظہار کرنے لگے تھے کہ رضوان شیرو کا بیٹا ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ ایک کمہار کا بیٹا اتنا اسمارٹ نہیں ہو سکتا۔ وہ اس کے باپ دادا کو جانتے ہیں۔ نگو کے باپ دادا کو جانتے ہیں۔ وہ اسی گاؤں میں گدھوں پر مٹی ڈھوتے رہے ہیں۔ مٹی کے برتن بنا کر بیچتے رہے ہیں۔ ان کے بیٹے کی کامیابیوں کی خبر اس طرح اخباروں میں کیسے لگ سکتی ہے۔

اگر یہ شیرو اور نگو کا بیٹا ہوتا تو اس کی اخبار میں خبر چوری،ڈاکے یا کسی اور جرم کی وجہ سے لگتی۔ پڑھائی میں ایسی کامیابیوں کی اس کی خبر کیسے لگ سکتی ہے۔

انہی سیانوں میں سے کئی کا خیال تھا کہ دراصل رضوان چوہدری نثار کا بیٹا ہے۔ وہ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہتے کہ اس کی شکل بھی چوہدری نثار سے ملتی جلتی ہے۔ چوہدری نثار کا شیرو کے ہاں آنا جانا بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی تنہائی میں چوہدری نثار اور نگو نے ایک دوسرے کو چھو لیا ہو اور ان کے ملاپ سے رضوان کی پیدائش ہوئی ہو۔

اس بات پر کئی سیانے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کرتے اور ایسی باتیں کرنے والوں کی سرزنش کرتے۔ چوہدری نثار اور شیرو بچپن کے دوست ہیں۔ ان کی اس وقت سے دوستی ہے جب وہ دونوں نہیں جانتے تھے کہ عورت مرد کا رشتہ کیا ہوتا ہے۔ ان کے ماں باپ ان کی دوستی کے خلاف تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے نہ صرف اپنی دوستی قائم رکھی بلکہ آج تک دونوں سگے بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود سارا گاؤں خوش تھا کہ رضوان ڈاکٹر بننے جا رہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ رضوان ڈاکٹر بنے گا تو جمال پور میں ڈاکٹری کی دوکان کھولے گا۔ حکیم صاحب کی گولیوں سے لوگوں کی چھوٹی موٹی بیماریاں تو ٹھیک ہو جاتی ہیں لیکن جب کبھی کسی کو ٹھیک ٹھاک قسم کا خطرناک مرض لاحق ہوتا ہے

اسے علاج کے لیے شہر لے جانا پڑتا ہے جس سے اس کی اور اس کے گھر والوں کی زندگی کا سارا انظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اگر رضوان ڈاکٹر بن گیا تو پھر سب کا علاج یہیں جمال پور میں ہوا کرے گا۔

ادھر شہر میں امتحان کے نتائج آنے کے بعد مختلف میڈیکل کالجوں کی طرف سے اسے پیشکشیں وصول ہونا شروع ہو گئیں۔ پاکستان بھر کے میڈیکل کالج چاہتے تھے کہ وہ وہاں تعلیم پائے۔ اس دوڑ میں چند یورپی اور امریکی میڈیکل اسکول بھی شامل تھے۔ وہ یورپی اور امریکی ادارے جو پوری دنیا میں قابل ذہنوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں، رضوان ان کے ریڈار پر بہت پہلے آ چکا تھا۔ ان کی طرف سے اسے ہر طرح کی پیشکش کی گئی۔ اس کے ماں باپ کو بھی اس کے ساتھ نقل مکانی کے خواب دکھائے گئے۔ لیکن فی الحال رضوان کا پاکستان چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اگرچہ پاکستان کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ پھر بھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنی عمر کا یہ اہم دور وہ کسی پرائے مُلک میں گزارے۔ اس کی اطلاعات کے مطابق پاکستان میں اس وقت سب سے اچھا میڈیکل کالج کے ای تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کے ای میڈیکل کالج جائن کرے گا۔ ویسے بھی کے ای گورنمنٹ کالج سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے گزشتہ دو سال میں گورنمنٹ کالج میں جو دوستیاں قائم کی تھیں وہ انہیں جاری رکھنا چاہتا تھا۔ خاص طور پر ڈاکٹر نذیر کے ساتھ دوستی کو وہ بہت اہمیت دیتا تھا اور چاہتا تھا کہ ان سے ملنے ملانے کا سلسلہ چلتا رہے۔ زندگی میں وہ کل تین لوگوں سے متاثر ہوا تھا۔ دو پیچھے جمال پور میں رہ گئے تھے۔ اور تیسرے ڈاکٹر نذیر صاحب تھے۔

حکومت پاکستان اس کی قابلیت دیکھتے ہوئے اس کے سارے تعلیمی اخراجات پہلے سے برداشت کر رہی تھی۔ اب میڈیکل کالج میں حکومت نے تعلیمی اخراجات کے علاوہ اس کے لیے کچھ اور وظائف بھی مقرر کر دیئے تھے جس سے اس کی زندگی میں کچھ آسودگی آنے لگی تھی۔ اور وہ اپنا وقت زیادہ سے زیادہ پڑھائی لکھائی میں صرف کرنے لگا تھا۔ کے ای کالج میں داخلے سے پہلے کالج کے سارے اساتذہ، طلبا اور طالبات اسے جانتے تھے۔

کی ای میں روایت ہے کہ جب نئے طالب علم پہلے دن کالج آتے ہیں ان کے سنیئرز انہیں فول بناتے ہیں۔

چند طالبات کو رضوان کے کے ای کالج میں داخلے کی اطلاع مل چکی تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مل کر رضوان کو فول بنائیں گی۔ چنانچہ وہ ایک جگہ کھڑی اس کی منتظر رہیں۔ جیسے ہی انہیں رضوان دکھائی دیا انہوں نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ پھر کہنے لگیں کہ انہیں رجسٹرار نے بھجوایا ہے۔ رجسٹرار نے کہا کہ تم پہلے سال کے طالب علموں کی بجائے تیسرے سال کے طالب علموں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھائی شروع کرو۔ تمہارا شاندار تعلیمی ریکارڈ دیکھتے ہوئے انہوں نے تمہارے لیے پہلے دو برسوں کی پڑھائی کی چھوٹ دے دی ہے۔

خلاف توقع رضوان نے طالبات کی طرف مسکرا کر دیکھا اور پھر یہ کہا کہ وہ رجسٹرار صاحب کا شکریہ ادا کریں اور انہیں بتا دیں کہ میں پہلی دو سیڑھیاں چھوڑ کر چھلانگ لگا کر تیسری سیڑھی چڑھنے پر اعتقاد نہیں رکھتا۔

اس کے جواب پر سنیئر طالبات اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ اور وہ پروگرام کے مطابق اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف چل پڑا۔

میڈیکل کالج میں اکثر طالب علموں کو ایڈجسٹ ہوتے ہوئے کچھ وقت لگتا ہے۔ سال بھر تو وہ اس گومگو کا شکار رہتے ہیں کہ کالج میں داخلے کے باوجود وہ ڈاکٹر بن سکیں گے یا نہیں۔ لیکن گورنمنٹ کالج نے جس طرح رضوان کو میڈیکل پروفیشن کے لیے تیار کیا تھا اس نے کے ای میں پہلا قدم اس اعتماد کے ساتھ رکھا کہ اب اس کے ڈاکٹر بننے میں اسے کوئی مشکل حائل ہوتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اسے کے ای میں آنے کے بعد پہلے دن بطور ڈاکٹر اپنا مستقبل صاف نظر آ رہا تھا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گورنمنٹ کالج کی طرح کے ای میں بھی ایک نمایاں طالب علم کی طرح اپنا وقت گزارے گا۔ اور ڈاکٹر بننے کے بعد ان منزلوں کی طرف اپنا سفر جاری رکھے گا جہاں اسے محسوس ہو کہ بطور انسان اس نے زندگی کے عمل کو اور زیادہ بہتر بنانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔

اس احساس کی وجہ سے کے ای میں ابتدائی چند دنوں میں اس کا رویہ باقی نووارد طالب علموں سے خاصہ مختلف تھا۔ اس نے کالج اور کالج سے ملحقہ میو ہسپتال کے عملے کو زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ کے ای اور اس سے ملحقہ اداروں میں کام کرنے والے افراد کی شخصی صلاحیتوں اور خوبیوں کا جائزہ لے تا کہ میڈیکل پروفیشن کی بھول بھلیّوں میں اپنا راستہ زیادہ مہارت کے ساتھ بنا سکے۔

کے ای میں بھی تقریباً سب اساتذہ کے ساتھ اس کی دوستی ہو چکی تھی۔ تقریباً سبھی اساتذہ کے ساتھ کلاس روم سے باہر بھی اس کی گپ شپ رہتی۔

وہ کیفٹیریا میں بھی اپنا وقت صرف چائے پینے یا سموسے اور پکوڑے کھانے پر ضائع کرنے کی بجائے کوشش کرتا کہ اس کا وقت کسی کے ساتھ کسی نہ کسی موضوع پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے گزرے۔ اس کی گفتگو اکثر اس کے مضامین سے متعلقہ سطحی سوالات سے مضامین کے زیادہ گہرے سوالات سے متعلق ہوتی۔

وہ مضامین کے ظاہری معاملات کے پیچھے چھپے فلسفیانہ اور تصوراتی نقاط پر زیادہ توجہ دیتا۔ گورنمنٹ کالج میں اس نے مینڈک کے دل، جگر، گردوں، پھیپھڑوں، ہڈیوں، جنسی اعضا اور معدے کے بارے میں پڑھا تھا اب وہ انسانی اعضا اور ان کے افعال کے بارے میں پڑھ رہا تھا۔ ان کی ساخت اور ان کے میکنزم کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جمال پور منتظر تھا کہ وہ ڈاکٹر بن کر واپس آئے گا۔ لیکن اسے ابھی سے یو ایس اے کے بہترین میڈیکل کالجوں سے مسلسل آفریں وصول ہو رہی تھیں۔

اس کے ساتھی طالب علم رشک سے اس کی طرف دیکھتے اور اسے مشورہ دیتے کہ وہ یو ایس اے میں کسی ایک کالج میں چلا جائے۔ لیکن وہ پوری طرح یکسو تھا کہ پہلے کے ای سے ایم بی بی ایس کرے گا اور اس کے بعد جہاں بھی جانا ہو گا جائے گا۔

اس کی سوچ تھی کہ ایک بار وہ ایم بی بی ایس کر لے گا تو اس کے لیۓ اور بہت سے دروازے کھل جائیں گے اور وہ بہتر پوزیشن میں ہو گا کہ مزید ریسرچ کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔

گورنمنٹ کالج میں راوی سے وابستگی کے بعد رضوان نے لکھنے پڑھنے میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ کے ای میں مختلف موضوعات پر منعقد ہونے والی منی کانفرنسیں اور آڈیٹوریم میں ہونے والے بڑے اجتماعات اس کی خاص توجہ کے مرکز تھے۔

کے ای میں آنے کے فوراً بعد اس نے انگریزی میں ایک پیپر لکھا جس کا ٹائٹل تھا زندگی کی غیر نامیاتی مادے سے نامیاتی مادے تک جست۔ اس پیپر میں اس نے لکھا تھا کہ وہ کونسے عوامل ہوتے ہیں جن کے نتیجے میں غیر نامیاتی مادہ نامیاتی مادے میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس پیپر میں اس نے اس بات پر بھی بحث کی تھی کہ غیر نامیاتی مادے میں کونسے عناصر کس طریقے سے باہمی ارتباط کے عمل سے گزرتے ہیں جس کے نتیجے میں غیر نامیاتی مادہ نامیاتی مادے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

اس پیپر میں اہم ترین حصہ لیب میں ایسی ماحولیاتی شرائط کی فراہمی کا عمل تھا جس کے ذریعے غیر نامیاتی مادے کو نامیاتی مادے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

اس نے کے ای کالج کے آڈیٹوریم میں سینکڑوں طالب علموں، اساتذہ اور ریسرچ اسکالروں کے سامنے جب یہ پیپر پڑھا اس پر حاضرین نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

اس نے پیپر میں لکھے گئے نقاط کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے ان کی مزید وضاحت کی تو کے ای میں اس کی حیثیت ایک سنجیدہ، غیر معمولی، اور انتہائی قابل طالب علم کے طور پر مسلّم ہو گئی۔

اگلی اشاعت میں کے ای کے میگزین کیمکول نے رضوان کا آرٹیکل چھاپا تو کئی بین الاقوامی میڈیکل سائنس کے جریدوں نے اس آرٹیکل کو اپنے مستقبل کے ایڈیشنوں میں نمایاں طور پر شائع کیا۔ جس کے نتیجے میں کے ای کے سب طالب علم اور اساتذہ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔۔

اب تک انہوں نے صرف ادھر ادھر سے اس کی ذہانت و فطانت کے قصے سنے تھے۔ اب انہوں نے اس کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ لیا تھا۔ گورنمنٹ کالج کی طرح کے ای کی طالبات کے دلوں کی نرماہٹ میں دبکے بیٹھے مینڈکوں کو بہار کی پہلی بارش نے بیدار کر دیا اور وہ سب ایک ساتھ ٹرانے لگے۔ ان کے ٹرانے کے صدا گاہے بگاہے رضوان کے کانوں تک پہنچتی لیکن تاحال اس نے اپنی ساری توجہ پڑھائی اور لکھائی پر مرکوز رکھی۔

وہ کے ای کالج کے اولڈ ہاسٹل کی راتوں کی خاموشی میں بھی اپنی تنہائی سے اسی طرح اپنے وائلن کی دھنوں کے ذریعے ہم کلام ہوتا رہا جیسے وہ گورنمنٹ کالج کے اولڈ ہاسٹل میں ہوتا تھا۔ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ اس کے وائلن کی دھنوں میں دلوں کو پکڑنے کے سحر میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دن میں میڈیسن کی پڑھائی کے گورکھ دھندوں میں کھویا رضوان رات کی تنہائی میں صرف ایک وائلنسٹ بن جاتا اور اس وقت تک وائلن بجاتا رہتا جب آسمان پر چمکتے ستارے تھک کر سونے کی تیاریوں میں مصروف نہ ہو جاتے۔ تب وہ بھی بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیتا۔ اور نیند کی وادیوں میں کہیں دور نکل جاتا۔

فصل 10

موسم بہار میں کے ای کالج میں رضوان کی آمد کے بعد پہلے سپرنگ فیسٹیویل کی تیاریاں عروج پر تھیں۔

فیسٹیول کمیٹی سارا پروگرام ترتیب دے چکی تھی۔ حسب روایت موسیقی کے حصے پر کمیٹی کے اجلاس میں تبادلۂ خیال جاری تھا۔ سب ممبران کا خیال تھا اس سال رضوان کی کالج میں موجودگی کا فائدہ اٹھایا جائے اور پروگرام کا یہ حصہ اس کی وائلن کے لیے مختص کر دیا جائے۔ لیکن وائلن سے بے پناہ محبت کے باوجود رضوان نہیں چاہتا تھا کہ وہ سپرنگ فیسٹیول میں وائلن بجائے۔

دراصل گورنمنٹ کالج میں وائلن بجانے کے بعد اسے جو سلیبرٹی اسٹیٹس ملا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ کے ای کالج میں بھی وہی صورتِ حال ہو۔ کے ای میں وہ اپنا امیج ایک سنجیدہ طالب علم اور اسکالر کے طور پر نمایاں کرنا چاہتا تھا۔

ویسے بھی وہ وائلن اپنے ذاتی ذوق وشوق کے لیے بجاتا تھا۔ گورنمنٹ کالج میں وائلن شو کے بعد شہر کے کئی موسیقی گروپ اس کے پیچھے پڑ گئے تھے کہ وہ ان کے گروپ میں شامل ہو جائے یا وائلن کو اپنا پیشہ بنالے۔ اس نے جس مشکل کے ساتھ ان سے جان چھڑائی تھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ دوبارہ اس صورتِ حال سے دوچار ہو اور پڑھائی لکھائی سے اس کی توجہ ہٹے۔

لیکن کمیٹی کے ارکان بضد تھے کہ وہ سپرنگ فیسٹیول میں وائلن بجائے اور ساتھی طالب علموں کو اپنے فن سے محظوظ کرے۔

آخر کار وہ فیسٹیول کمیٹی کے ممبران کے اصرار پر آمادہ ہو گیا کہ وہ سپر نگ فیسٹیول میں اپنے فن کا مظاہرہ کرے گا۔ لیکن اس کے لیے اس نے شرط رکھی کہ وہ چار لڑکیاں جنہوں نے کے ای میں پہلے دن اسے فول بنانے کی کوشش کی تھی وہ اس سے درخواست کریں کہ وہ سپر نگ فیسٹیول میں وائلن بجائے۔

فیسٹیول کمیٹی ممبران نے اسے ان کے نام کے بارے میں پوچھا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان کے نام کیا تھے۔ پھر انہوں نے اس سے ان کا حلیہ پوچھا۔ ان میں سے دو تین لڑکیوں کا حلیہ اسے یاد تھا۔ خاص طور پر ان میں سے ایک لڑکی، نکلتے ہوئے قد، کھلتے رنگ، شرارتی آنکھوں اور شوخ لہجے کی مالک سمیرا تھی۔

سمیرا اس سے ایک سال سنیئر تھی اور پچھلے سال اسلام آباد گورنمنٹ کالج سے ایف ایس سی کرنے کے بعد کے ای میں میرٹ پر داخل ہوئی تھی۔

سمیرا کرنل اکرام کی بیٹی تھی۔ اس کے دو بھائی تھے جو پاکستان فوج میں میجر اور کیپٹن کے عہدوں پر فائز تھے۔

سمیرا کرنل اکرام کی اکیلی بیٹی اور دو بھائیوں کی اکیلی بہن تھی۔ انتہائی باتونی اور نقطہ سنج لڑکی تھی۔ سمیرا نام رضوان کے ذہن میں اٹک کر رہ گیا تھا کیونکہ وہ باقی لڑکیوں میں سب سے آگے تھی اور باقی لڑکیاں اسے سمیرا کہہ کر مخاطب کر رہی تھیں۔

فیسٹیول کمیٹی ممبران نے رضوان کی شرط سنی تو پریشان ہو گئے۔ وہ سب سمیرا کو جانتے تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ اسے اس بات پر تیار کرنا کہ وہ رضوان کو سالانہ سپر نگ فیسٹیول میں وائلن بجانے پر آمادہ کرے تھوڑا مشکل کام تھا۔

لیکن پھر بھی انہوں نے رضوان سے حامی بھر لی کہ وہ سمیرا سے درخواست کریں گے کہ وہ بنفس نفیس آئے اور اس سے وائلن بجانے کی درخواست کرے۔

شاید وہ رضوان سے سپرنگ فیسٹیول میں وائلن بجانے کے لیے بضد نہ ہوتے لیکن انہیں اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ تھا۔ وہ کے ای کا طالب علم ضرور تھا لیکن گورنمنٹ کالج میں کنسرٹ کے بعد اس کی اے کلاس وائلنسٹ کی طور پر شہرت اس کے کے ای میں وارد ہونے سے بہت پہلے پہنچ چکی تھی۔

دراصل کے ای کے کچھ طلبا اور طالبات نے گورنمنٹ کالج کے اس کنسرٹ میں شرکت کی تھی۔ جس طرح اس نے ہزاروں طالب علموں کو اپنی وائلن کی دھنوں سے مسحور کیا تھا موسیقی کا ایسا موثر تجربہ انہوں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اس لیے کی ای کے ان طلبا کی مرضی تھی کہ رضوان ایک بار کے ای میں بھی ویسا ہی ماحول پیدا کرے۔ اوراس کام کے لیے سپرنگ فیسٹیول سے بہتر کوئی اور موقع نہیں ہو سکتا تھا۔

وائلن کمیٹی کے ممبران نے جب اس سلسے میں سمیرا سے رابطہ کیا تو وہ خلاف معمول فوراً تیار ہو گئی کہ اگر اس کے کہنے سے رضوان وائلن بجانے پر آمادہ ہو تا ہے تو وہ ضرور اس سے مل کر درخواست کرے گی کہ وہ فیسٹیول میں حصہ لے اور وائلن بجا کر لوگوں کو اپنے فن سے محظوظ کرے۔

گورنمنٹ کالج میں بہت سی لڑکیوں نے کوشش کی تھی کہ رضوان کے ساتھ ان کی دوستی ہو۔ لیکن اس نے اپنے گرد ایک ایسا مصنوعی حصار کھڑا کر رکھا تھا کہ چاہنے کے باوجود کوئی لڑکی اس کے قریب نہیں آسکی تھی۔

کے ای میں بھی اس نے وہ حصار ٹوٹنے نہیں دیا تھا۔ کلاس روم، کانفرنس روم، یا کیفیٹیریا میں اس کی کوشش ہوتی تھی کہ ساتھی طالبات کے ساتھ اس کی گفتگو محدود رہے۔ اور ضرورت سے زیادہ کسی کے ساتھ میل جول نہ ہو۔ گاہے بگاہے اگر کسی ساتھی طالبہ کے ساتھ اس کی گفتگو ہوتی بھی تو زیادہ تر یس نو تک محدود رہتی۔ اور وہ کام کی بات کر کے آگے بڑھ جاتا۔

آج جب اس نے فیسٹیول کمیٹی کے ممبران کے سامنے یہ شرط رکھی تھی کہ کے ای میں پہلے دن فول بنانے والی لڑکیاں اس سے وائلن بجانے کی درخواست کریں تو وہ سپرنگ فیسٹیول میں وائلن بجائے گا یہ بات خود اس کے لیے حیران کن تھی۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ یا یہ کہ اسے یہ خیال کیوں آیا کہ وہ چاروں لڑکیاں اس سے وائلن بجانے کی درخواست کریں۔

شاید اس کے ذہن میں کہیں چھپا تھا کہ پہلے دن کے ای میں وارد ہونے پر انہوں نے اس کو فول بنانے کی کوشش کر کے اس کی توہین کی تھی اور اب جب کہ وہ کے ای کے ماحول میں خلاف توقع اتنی جلدی اس طرح ایڈجسٹ ہو چکا تھا تو وہ چاہتا تھا کہ وہ ان کے ساتھ حساب برابر کرے۔ لیکن رضوان ایسا نوجوان نہیں تھا جو ایسی باتوں کو توہین سمجھتا ہو یا یہ کہ مذاق کی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی سنجیدگی سے لے کہ حساب کتاب برابر کرنے پر اتر آئے۔

سپرنگ فیسٹیول کے بارے میں گفتگو کے دوران اس کے دل میں ابھرنے والی یہ امنگ اسے اعلان جنگ کا وہ طبل محسوس ہوئی جس کے بجنے کے بعد فوجیں میدان جنگ میں دشمنوں پر یلغار کرتی ہیں۔

فیسٹیول کمیٹی کے ممبران کے کہنے پر جب سمیرا اپنی انہی ساتھی طالبات کے ساتھ رضوان سے درخواست کرنے آئی کہ وہ سالانہ فیسٹیول میں وائلن بجائے تو رضوان نے اس کے سامنے ایک شرط رکھی۔ اس نے کہا کہ وہ وائلن ضرور بجائے گا لیکن اسے سپرنگ فیسٹیول میں مورنی کا روپ دھار کر اس کے ساتھ اسٹیج پر آنا پڑے گا۔ اگر وہ مورنی بن کر اسٹیج پر آنے کے لیے تیار ہو تو وہ وائلن بجائے گا ورنہ نہیں بجائے گا۔

رضوان کی شرط سن کر سمیرا جھینپ گئی۔ اور کہنے لگی نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ کبھی مورنی بن کر اسٹیج پر نہیں آئے گی۔ اگر وہ وائلن نہیں بجانا چاہتا تو نہ بجائے۔

سمیرا کی سہیلیوں نے رضوان کی تجویز سنی تو کہنے لگیں کہ یہ بہت اچھی تجویز ہے۔ بلکہ سمیرا کے ساتھ ہم بھی مورنیاں بنیں گی۔ لیکن رضوان کو بھی مور بن کر اسٹیج پر آنا چاہیۓ۔

سہیلیوں کی بات سن کر سمیرا تیار ہوگئی۔ رضوان بھی تیار ہو گیا کہ وہ سپرنگ فیسٹیول کے دن مور کا لباس پہنے گا اور ان کے ساتھ اسٹیج پر آکر وائلن بجائے گا۔

آپس میں فیصلہ کرنے کے بعد رضوان نے فیسٹیول کمیٹی کو مطلع کر دیا کہ وہ فیسٹیول میں حصہ لے گا اور وائلن بجائے گا۔ اس نے فیسٹیول کمیٹی سے درخواست کی کہ اس کی پرفارمنس فیسٹیول کا آخری آئٹم ہونا چاہیۓ۔ اس کی پرفارمنس کے بعد سپرنگ فیسٹیول ختم ہو جانا چاہیۓ۔ اس لیے فیسٹیول کے اختتام کے لیے جس نے جو رسمی باتیں کرنی ہوں اس کی پرفارمنس سے پہلے کر لے اور اس کی پرفارمنس کے بعد کسی کو اسٹیج پر نہیں آنا چاہیۓ۔

اس سال مارچ میں جب موسم بہار شباب پر پہنچا کے ای کالج کا سپرنگ فیسٹیول شروع ہوا۔ تین دن جاری رہنے والے اس فیسٹیول کا پہلا اور دوسرا دن کے ای میں مختلف تقریبات کے ساتھ گزرا اور تیسرے دن کی تقریبات بھی اختتام پذیر ہونے کو آئیں تو آخری آئٹم کے آغاز کا اعلان کی گیا۔

فیسٹیول کمیٹی کے صدر نے ان سب لوگوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے اس فیسٹیول کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف تقریبات میں حصہ لیا۔ اس کے بعد صدر نے فیسٹیول کی آخری تقریب کا اعلان کیا: "حاضرین اس سال کے سپرنگ فسٹیول کا آخری آئٹم پیش خدمت ہے۔ کے ای کالج کی سپرنگ فیسٹیول کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم بہت خوش قسمت ہیں کہ اس سال اس فیسٹیول کا اختتام ایک ایسے آئٹم پر کرنے جا رہے ہیں جسے ہمارا ساتھی طالب علم رضوان انجم اپنی ساتھیوں کے ساتھ پیش کرے گے۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی رضوان مور کا لباس پہنے وائلن کاندھے اور بائیں بازو پر تھامے اسٹیج پر نمودار ہوا۔

وہ چند لمحوں تک سمیرا اور اس کی سہیلیوں کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن انہیں مورنیاں بن کر نہ اسٹیج پر آنا تھا نہ آئیں۔

رضوان نے جب سمیرا کی درخواست پر مورنی بننے سے انکار کیا تھا تو اس کی سہیلیوں نے اس وقت ہاں کر کے بعد میں سمیرا کو بتا دیا تھا کہ وہ کالج کے پہلے دن رضوان کو فول بنانے میں ناکام رہیں تھی لیکن سپرنگ فیسٹیول میں اس کو فول بنائیں گی۔ وہ اکیلا مور بن کر اسٹیج پر آکر وائلن بجائے گا۔ ہمارے آنے کا انتظار کرے گا۔ پھر ہمارے نہ آنے سے شرمسار ہو کر اکیلا وائلن بجائے گا۔

جب چند لمحوں تک انتظار کے باوجود سمیرا اور اس کی سہیلیاں اسٹیج پر نہ آئیں تو رضوان نے دائیں ہاتھ میں پکڑی وائلن کی باو کو وائلن پر سیدھا کرتے ہوئے یہ کہہ کر وائلن بجانی شروع کی کہ آپ نے جنگل میں مور ناچنے کا محاورہ سنا ہو گا۔ لیکن یہ جنگل نہیں جہاں مور اکیلا ناچے گا اور کوئی نہیں دیکھے گا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنے ذہنوں اور جسموں کو آزاد چھوڑ دیں۔

اس نے آہستہ آہستہ وائلن بجانی شروع کی۔ جیسے جیسے وائلن کی دھنیں بلند ہونا شروع ہوئیں حاضرین دھنوں کے بہاؤ میں بہنے لگے ۔ یہاں تک کہ وائلن کی دھنیں اور ان کے ذہن ہم آہنگ ہو گئے۔ پھر رضوان نے بائیں کندھے اور بازو پر رکھی وائلن اور دائیں ہاتھ میں پکڑی باو کو عجیب انداز میں حرکت دینی شروع کی۔ چند لمحوں بعد سارے سامعین کے جسم اس کے وائلن والے بازو اور باو والے بازو کے ساتھ لہرانا شروع ہو گئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اسٹیج پر پیچھے ہٹنے لگا۔ جیسے جیسے وہ پیچھے ہٹا اس نے وائلن پر نر پرندوں کی مادہ پرندوں سے اختلاط کا تاثر دینے والی دھنیں بجانا شروع کر دیں۔ چند لمحوں بع کے ای کالج کی سب لڑکیاں اسٹیج کے سامنے آکر عجیب بے خودی سے جھومنے لگیں۔

اس کے وائلن کی دھنیں بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئیں ۔ سمیرا اور اس کی سہیلیاں بھی ان لڑکیوں کے ساتھ وائلن کی دھنوں پر جھوم رہی تھیں۔ پھر وہ اسی طرح وائلن بجاتے آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور

وائلن والے بازو کو ایک عجیب انداز میں لہراتے ہوئے دُھن تبدیل کی تو سب لڑکے بھی اپنی جگہوں سے اٹھ کر لڑکیوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔

کافی دیر تک وہ اسٹیج پر اور کے ای کے سب طلبا و طالبات اسٹیج کے ارد گرد اس کی وائلن کی دھنوں کے ساتھ جھومتے اور جھولتے رہے۔ طلبا و طالبات کی اسی بے خودی کی کیفیت میں اس نے غیر محسوس طریقے سے وائلن بجانا بند کی اور اسٹیج کی سیڑھیوں سے اتر کر ہاسٹل میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کافی دیر تک سب طلبا و طالبات اسی غیر مرئی دنیا میں رہنے کے بعد مرئی دنیا میں واپس آئے تو رضوان اسٹیج پر نہیں تھا۔ لیکن وہ سب خوشی سے چیخ رہے تھے اور تالیاں بجا رہے تھے۔

سمیرا اور اس کی سہیلیاں شرمندگی کے بوجھ تلے دبی کندھے جھکائے ساتھی طلبا و طالبات کی سیٹیوں اور تالیوں کے شور سے دور جا رہی تھیں۔

فصل 11

سمیرا اور اس کی سہیلیوں نے سوچا تو یہ تھا کہ رضوان کے ساتھ سپرنگ فیسٹیول میں مورنیاں بننے کا عہد کر کے اور پھر اسٹیج پر اسے تنہا چھوڑ کر وہ اس کی سبکی کا سبب بنیں گی لیکن جس طرح رضوان نے انتہائی خوبصورتی اور آسانی کے ساتھ اپنا فنکشن کیا تھا اس سے انہیں ہزیمت کا احساس ہو رہا تھا۔

انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وائلن کے ساتھ محبت اور مسلسل ریاض سے رضوان وائلن بجانے میں جو محیر العقول مہارت حاصل کر چکا ہے اسے اس طرح کے چھوٹے موٹے واقعات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ صرف ایک غیر معمولی طور پر ذہین طالب ہی نہیں تھا بلکہ پڑھائی لکھائی کے ساتھ اس نے وائلن بجانے میں جو ملکہ حاصل کیا تھا وہ اسے دنیا کی کسی بھی محفل میں نمایاں کرنے کے لیے کافی تھا۔

سمیرا اپنی سہیلیوں کے ساتھ اپ سیٹ تھی۔ "میں نے تو پہلے ہی اسے انکار کر دیا تھا کہ وہ فیسٹیول میں وائلن بجائے یا نہ بجائے وہ مورنی کا روپ دھار کر اسٹیج پر نہیں جائے گی۔ لیکن تم نے اس کے کالج میں پہلے دن فول نہ بننے کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ گیم کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن عملاً ہمارے سمیت سب طالبات وہاں مورنیوں کی طرح پیلیں ڈال رہی تھیں۔" وہ اپنی سہیلیوں پر برس رہی تھی۔

"ٹھیک ہے یار دل چھوٹا نہ کرو۔ ابھی تو وہ اور ہم کئی برس تک کے ای میں ہیں۔ اس کے ساتھ حساب کتاب کرنے کے کئی مواقع آئیں گے۔" سمیرا کی سہیلیاں اس کو تسلی دے رہی تھیں۔

"نہیں اس نے جس طرح ہماری سبکی کی ہے۔ اس سے مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ اور اب مجھے اس سے کچھ نہیں لینا دینا۔ ہم یہاں ڈاکٹری پڑھنے آئے ہیں۔ کسی سے دوستی یا دشمنی پالنے نہیں آئے۔"

کہنے کے تو سمیرا نے اپنی سہیلیوں سے یہ بات کہہ دی تھی لیکن اس کے دل کی گہرائیوں میں کوئی چور چھپا بیٹھا تھا جو اس کی سوچوں پر مسلسل قہقہے لگا رہا تھا۔

کرنل اکرام کی اکلوتی بیٹی، میجر آفتاب اور کیپٹن رشید کی چھوٹی بہن کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ کوئی اس طرح اس کی ہزیمت کرے۔ اور وہ بھی ایک کمہار کا بیٹا جس کی وجہِ شہرت محض گدھے کے ساتھ کھنچی ایک تصویر ہے جس میں اس نے ہالی ووڈ کا ہیرو نظر آنے کی کوشش کی ہے۔

سمیرا کی ان سوچوں پر اس کے دل کے اندر بیٹھے چور کے قہقہوں کی صدا بلند تر ہو کر اس کی زخمی انا پر مزید کچوکے لگا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے لیے پڑھائی لکھائی پر توجہ مرکوز رکھنا بھی مشکل ہونے لگا۔

دوسری طرف رضوان بالکل پرسکون تھا۔ ایک ہلکی سی لہر جس کے بہاو میں اس نے فیسٹیول کمیٹی کو کہہ کر سمیرا اور اس کی سہیلیوں سے فیسٹیول کی تقریب کے لیے رابطہ کیا تھا کب کی گزر چکی تھی۔ سمیرا اور اس کی سہیلیاں نہ پہلے اس کا مسئلہ تھیں نہ فیسٹیول کے بعد۔ اس کے معمولات بالکل اسی طرح جاری رہے جیسے پہلے تھے۔ وہ اسی طرح سارا دن ایک ڈیپارٹمنٹ سے دوسرے ڈیپارٹمنٹوں میں کلاسوں کے لیے جاتا، کانفرنسوں میں شامل ہوتا، ڈبیٹ سوسائٹی کی کاروائیوں میں حصہ لیتا، کیفیٹیریا میں بیٹھ کر ساتھی طالب علموں اور طالبات کے ساتھ معمول کی ہلکی پھلکی گپ شپ کرتا، اور رات کے وقت جب سب پرندے اپنے گھونسلوں میں اور انسان اپنے بستروں میں سو جاتے تو وائلن بجانا شروع ہو جاتا۔

کے ای کے ہاسٹل سے کبھی کبھار نکلتا تو گورنمنٹ کالج میں اپنے استاد ڈاکٹر نذیر سے ملاقات کے لیے مال پر واقع کسی ریسٹورانٹ میں چلا جاتا۔ جہاں ان سے علمی و ادبی موضوعات پر تبادلہ خیال کرتا۔ پھر نئے عزم اور جذبے سے سرشار ہو کر واپس اپنے ہاسٹل میں لوٹ آتا۔

اس کے خاندان میں کوئی تھا نہیں جو اس سے ملنے کے لیے آتا۔ اس کا ان پڑھ باپ اور ماں اپنی زندگی کے محدود دائرے میں اس طرح جکڑے تھے کہ ان کے لیے اس سے ملنے آنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے شہر چلے آنے کے بعد گدھوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی اس کے باپ پر آن پڑی تھی۔

اب اس کے باپ کو گدھوں کے لیے چارہ لانا پڑتا تھا۔ دن میں کئی بار کھر کھرے سے ان کے بدن کو کھر کھرانا پڑتا تھا۔ برتن بنانے کے لیے مٹی لانی پڑتی تھی۔ مٹی گوندھنی پڑتی تھی۔ مٹی کے بوتے بنانے پڑتے تھے۔ پھر چاک پر ان بوتوں سے برتن بنانے پڑتے تھے۔ اور آخر میں جب دھوپ میں رکھ کر برتن سوکھ جاتے تھے تو ان کو بھٹی میں پکانا پڑتا تھا۔

ان چیزوں میں کبھی کبھار شیرو کی بیوی نگو اس کی مدد کر دیتی تھی۔ لیکن اسے گھر کے سارے کام کاج کرنے ہوتے تھے۔ علی الصبح اٹھ کر چولہا چوکا چڑھانا اور اپنے لیے اور شیرو کے لیے ناشتہ بنانا۔ پھر برتن دھونا۔ رسوئی میں اور سارے صحن میں پوچا پھیرنا۔ کپڑے دھونا۔ پھر بازار جا کر سودا سلف لانا۔ پھر دوپہر اور شام کے کھانے کا اہتمام کرنا۔ اگر کسی ہمسایے نے کسی کام کے لیے کہہ رکھا ہو تو ان کے گھر جا کر چند سکوں کے لیے ان کے گھر کام کرنا اور پھر تھک ہار کر دن ڈوبنے کے بعد گھر آ کر سو جانا۔

شیرو اپنے کام کاج سے فارغ ہوتا تو چوہدری نثار عدالت سے آ کر آرام کرنے کے بعد اس کے ہاں آ جاتا پھر وہ ایک ساتھ نہر کی طرف سیر کرنے چلے جاتے۔

سیر سے واپس آتے تو اپنے گھر جا کر رات کا کھانا کھا کر سیفو حلوائی کی دوکان پر چلے آتے جہاں رات گئے تک ان کی باقی لوگوں کے ساتھ گپ شپ چلتی رہتی۔

یہ ایسے معمولات تھے جنہیں توڑنا ان میں سے کسی کے لیے ممکن نہیں تھا۔ شیرو، نگو، چوہدری نثار سب اپنے اپنے دائرے میں جمال پور میں اپنے شب و روز گزار رہے تھے۔

رضوان جب سے پڑھائی کے سلسلے میں گورنمنٹ کالج آیا تھا واپس جمال پور نہیں گیا تھا۔ لیکن اسے جمال پور کے بارے میں شہر آنے جانے والوں سے خبریں ملتی رہتی تھیں۔

سمیرا چند ثانیوں کے لیے اس کی توجہ کا مرکز بنی لیکن پھر جمال پور سے ملنے والی ایک خبر سے اٹھنے والے جذباتی گرد و غبار میں گم ہو گئی۔

اسے کسی سے پتہ چلا کہ چوہدری نثار قتل کے الزام میں جیل میں ہے اور اس کے خانوادے نے کسی بھی قسم کی قانونی پیروی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

چوہدری نثار سے اس کی جذباتی وابستگی بھی اپنے باپو شیر و کی طرح تھی۔ شیر و کے چوہدری نثار کے ساتھ بھائیوں جیسے تعلقات تھے۔ اور یہ تعلقات کوئی آج کل میں نہیں بنے تھے دونوں بچپن سے ساتھ بڑھے پلے تھے اور طبقاتی فرق کے باوجود انہوں نے باہمی محبت اور دوستی کا رشتہ برقرار رکھا تھا۔ چوہدری نثار کے جیل جانے کا سبب ایک بندے کا اس کے ہاتھوں اتفاقی قتل تھا۔

ہوا یوں کہ ایک شام کھانا کھانے کے بعد جب شیر و اور چوہدری نثار سیفو حلوائی کے دوکان پر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے چند منچلے لڑکوں نے ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

ان میں سے ایک نے کسی بات پر کہہ دیا کہ رضوان شیر و کا نہیں چوہدری نثار کا بیٹا ہے۔ چوہدری نثار نے آو دیکھا نہ تاو ایک مکا اس کی کنپٹی پر جڑ دیا۔ لڑکا چکرا کر گرا تو اس کا سر بھٹی پر رکھی دودھ کی کڑاہی کے عین کنارے پر اس طرح لگا کہ خوربوزے کی طرح دو ٹکڑے ہو گیا اور لڑکے نے زمین پر گر وہیں دم توڑ دیا۔ چند منٹوں میں لڑکے کے دم توڑنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے جمال پور میں پھیل گئی۔

سارا گاؤں سیفو حلوائی کے دوکان کے باہر اکٹھا ہو گیا۔ مرنے والے لڑکے کا ترکھان برادری سے تعلق تھا۔ لیکن چوہدری نثار بہر حال گاؤں کے نمبر دار کا بیٹا تھا۔ اس کا خاندان بھی بہت بڑا تھا۔ کئی بھائی اور بھتیجے تھے۔

تھوڑی دیر میں ترکھان برادری اور چوہدری نثار کے سب بھائی بھتیجے سیفو حلوائی کی دوکان پر پہنچ گئے۔

چوہدری نثار چونکہ پیشہ ور وکیل تھا۔ اسے پتہ تھا کہ یہ قتل مقتول کے اشتعال دلانے کی وجہ سے بغیر ارادہ واقع ہوا تھا اس لیے وہ وہیں کھڑا رہا۔

لڑکے کی لاش ابھی سیفو حلوائی کی دوکان کے سامنے پڑی تھی کہ پولیس بھی وہاں پہنچ گئی۔ پولیس نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اپنے قبضے میں لے لی اور چوہدری نثار کو جیپ میں بھٹا کر تفتیش کے لیے تھانے لے گئی۔

مقتول کے ورثا اور چوہدری نثار کے بھائی بند تھانے پہنچے تو انسپکٹر نے انہیں سمجھا بجھا کر واپس بھجوا دیا۔ چوہدری نثار کے بھائی بند چلے گئے لیکن شیر و موقع کے دیگر گواہوں کے ساتھ وہیں تھانے میں بیٹھا رہا۔ انسپکٹر چاہتا تھا کہ عدالت میں چالان پیش کرنے سے قبل موقع پر موجود گواہوں کا بیان قلمبند کرے۔

شیر و کو پتہ تھا کہ انسپکٹر نے ایف آئی آر میں جو کچھ لکھنا ہے سارے مقدمے کا فیصلہ اسی کے لکھے پر ہونا ہے۔ لہذا سب کے جانے کے بعد اس نے انسپکٹر سے کہا کہ چونکہ چوہدری نثار نے مقتول کو ارادہ قتل سے قتل نہیں کیا۔ لہذا وہ اسے حادثاتی موت لکھے۔ اور حقیقتاً ہوا بھی ایسے ہی تھا۔ مرنے والے نے چوہدری نثار پر اور پھر شیر و کی بیوی نگو پر اتنا بڑا بہتان لگایا تھا کہ اشتعال میں آ کر چوہدری نثار نے اسے مکہ مارا تھا۔ جس کے نتیجے میں لڑکھڑا کر گرنے کی وجہ سے وہ کڑاہی سے ٹکرا کر مرا تھا۔ اگر وہ کڑاہی سے نہ ٹکراتا تو ابھی زندہ ہوتا۔ انسپکٹر نے کہا دیکھو تم جو کہہ رہے ہو ٹھیک ہے لیکن معاملہ اس طرح ہے کہ تمہیں اور چوہدری نثار کو پتہ تھا کہ مقتول نے سیفو حلوائی کی دوکان پر آنا ہے۔ چنانچہ تم دونوں فیصلہ کر کے وہاں گئے تھے کہ تم نے مقتول پر حملہ کرنا ہے۔

اس کے باوجود میں وہی لکھوں گا جو تم کہہ رہے ہو۔ لیکن اس کے لیے تمہیں مجھے دو لاکھ روپے ادا کرنے ہوں گے۔ ورنہ ایف آئی آر اس طرح لکھی جائے گی جیسے میں کہہ رہا ہوں۔ اور یہ روپے مجھے تم نے ادا کرنے ہیں کیونکہ میں چوہدری نثار کے خاندان سے کوئی پیسے وصول کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا۔

رضوان کو ان واقعات کی خبر دینے والے نے بتایا تھا کہ اس کا باپو بہت پریشان ہے۔ اس نے اپنا گھر، احاطہ، اور پانچوں گدھے بیچنے کی کوشش کی ہے لیکن کوئی اسے ان سب چیزوں کے لیے چالیس پچاس ہزار روپوں سے زیادہ دینے کے لیے تیار نہیں۔

رضوان نے خبر دینے والے سے کہا کہ گاؤں واپس جاؤ تو میرے باپو سے کہنا کہ وہ گھر، احاطہ اور گدھے نہ بیچے۔ وہ کسی نہ کسی طرح روپوں کا بندوبست کر کے چند دنوں میں گاؤں آئے گا اور پولیس کو پیسے ادا کر دے گا۔

پولیس نے تحقیق کے لیے کورٹ سے چوہدری نثار کا دو ہفتے کا ریمانڈ لے لیا۔

رضوان سب کچھ بھلا کر اس فکر میں غلطاں تھا کہ کس طرح اپنے باپو کی مدد کرنے کے لیے دو لاکھ روپے حاصل کرے۔ حکومت کی طرف سے اسے جو اسکالرشپ ملتا تھا اس سے بمشکل اس کی اپنی زندگی چل رہی تھی۔ وہ کے ای کالج میں ایک غریب طالب علم کی طرح تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ سوائے ڈاکٹر نذیر کے اس کی کسی کے ساتھ ایسی دوستی بھی نہیں تھی کہ وہ اس سے پیسوں کی بات کرتا۔ ڈاکٹر نذیر بھی درویش آدمی تھے۔ روپے پیسے کے چکر میں پڑنے والے دنیادار آدمی نہیں تھے۔ اگر وہ ان سے روپوں کے بارے میں کہتا تو کیسے؟ اور وہ اسے روپے دیتے تو کہاں سے؟

کہنے کو تو اس نے گاؤں کے آدمی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے باپو کو بتا دے کہ وہ روپوں کا بندوبست کرے گا لیکن اب وہ انتہائی پریشان تھا اور اسے روپے حاصل کرنے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اسی ادھیڑبن میں کیفیٹیریا اور ادھر ادھر سمیرا اسے ایک آدھ بار اپنی سہیلیوں کے ساتھ دکھائی دی لیکن اس نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ سمیرا نے رضوان کی سرد مہری دیکھی تو اپنی سہیلیوں پر پھٹ پڑی۔ یہ کمہار کا بچہ ڈاکٹر بننے جا رہا ہے۔ وائلن بجاتا ہے۔ خود کو ہیرو سمجھتا ہے۔ ہم نے کے ای کی روایت کے مطابق پہلے دن اس کو مذاقاً فول بنانے کی کوشش کی تھی۔ جواباً اس نے سپرنگ فیسٹیول میں ہمیں فول بنانے کی کوشش کی۔ ہم نے اس کی چال اس پر الٹی تو اس نے اپنی وائلن سے ہماری چال ہم پر الٹ دی۔ لیکن اب یہ کس بھرتے پر ہمارے ساتھ ایسی بے التفاتی کر رہا ہے۔ ہائے ہیلو تو دور کی بات ہے آنکھ تک نہیں ملاتا۔

اتفاق سے رضوان نے سمیرا کے کچھ جملے سن لیۓ۔ اس نے ایک نگاہِ غلط انداز اس پر ڈالی اور پھر آگے بڑھ کر بولا:

"خاتونِ محترم۔ زندگی صرف کے ای تک محدود نہیں۔ کے ای اور ڈاکٹری سے ماورا بھی ایک دنیا ہے۔ جس کے اپنے مسائل ہیں۔ غریب لوگوں کو ان مسائل سے ڈیل کرنا ہوتا ہے۔" سمیرا اس کے لہجے کی کسک محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی۔ فوراً معذرت کرتے ہوے بولی: "رضوان کیا ہوا ہے۔ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟۔"

رضوان نے سمیرا کے لہجے میں ہمدردی دیکھی تو اس نے ساری کہانی اس کو اور اس کی سہیلیوں کو سنادی۔ اس کی کہانی سن کر سمیرا بولی:

"رضوان تم یہ بتاؤ کہ تمہارا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے؟ دولاکھ روپوں سے یا چوہدری نثار کے کیس کے خاتمے اور باعزت رہائی سے۔"

"روپے تو ایک ذریعہ ہیں مسئلہ حل کرنے کا۔ اگر روپوں کے بغیر مسئلہ حل ہو جائے تو روپوں کی کیا ضرورت ہے۔" رضوان نے جواب دیا۔

سمیرا نے کہا اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے۔ تم فکر نہیں کرو۔ اگلے چند دنوں تک ہر چیز ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ کہہ کر سمیرا نے اپنے باپ کرنل اکرام کو فون کرکے رضوان کی ساری کہانی سنائی اوران سے درخواست کی وہ جمال پور تھانے میں انسپکٹر کو کال کرکے بتلادیں کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ چوہدری نثار کے کیس کو ٹھیک نہج پر رکھنے کے لیے شیر و کمہار سے دولاکھ روپے مانگ رہاہے۔ کرنل اکرام کی انسپکٹر کو کال نے وہ کام کیا جو دولاکھ روپوں نے بھی نہیں کرنا تھا۔ چوہدری نثار کو انسپکٹر کے کمزور کیس بنانے کی وجہ سے عدالت نے اگلے دن ضمانت پر رہا کر دیا۔

چند دنوں بعد چوہدری نثار، شیر و اور نگو رضوان سے ملنے کے ای کالج چلے آے۔ وہ سب کیفٹیریا میں بیٹھے چاے پی رہے تھے کہ سمیرا اپنی سہیلیوں سمیت وہاں چلی آئی۔ رضوان نے اسے آتے دیکھا تو

کھڑا ہو کر اسے مسکراتے ہوئے بولا: "سمیرا آؤ میرے خاندان سے ملو۔ یہ تمہارا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔ یہ میرا کل خاندان ہے۔ یہ میری ماں نگو ہے۔ یہ میرا باپ شیرو اور یہ میرے باپو کے بچپن کے دوست چوہدری نثار ہیں۔

سمیرا نے ہاتھ باندھ کر سب کو سلام کیا۔ اور پھر رضوان سے بولی: "رضوان مجھے تمہارا خاندان اچھا لگا ہے۔ میں خوش ہوں کہ میری وجہ سے ان کی مشکل ٹل گئی۔"

پھر وہ سہیلیوں کے ساتھ کیفیٹیریا کے دوسرے کنارے پر جا کر بیٹھ گئی اور چائے پیتے ہوئے گپ شپ میں مصروف ہو گئی۔ اس کے اندر بیٹھے چور کے قہقہے دم توڑ چکے تھے اور اب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی قہقہے لگا رہی تھی۔

فصل 12

جمال پور میں ترکھانوں کے لڑکے کے قتل کا کیس اگرچہ سمیرا کے والد کرنل اکرام کی مداخلت سے ختم ہو چکا تھا لیکن رضوان کے اندر ایک نئی عدالت کھل گئی تھی جس میں اب اس کیس کی سماعت شروع ہو چکی تھی۔ ایک ایسا کیس جس میں ایک ساتھ کئی کیس چلنا شروع ہو گئے تھے۔ ایک مقدمہ چوہدری نثار کا تھا۔ جو بچپن سے اس کے باپو کا دوست تھا۔ لیکن اس پر الزام تھا کہ اس کے اس کی ماں کے ساتھ ناجائز جنسی تعلقات تھے۔ دوسرا مقدمہ تھا اس کے باپو کے خلاف جو اب تک اس کا باپ ہونے کا دعویدار تھا۔ جس نے بچپن سے لے کر باپ کی طرح اس کی پرورش کی تھی۔ تیسرا مقدمہ تھا اپنی ماں کے خلاف جس نے اس سے اس کے باپ کی اصلیت چھپائی تھی۔ چوتھا مقدمہ تھا اس کے اپنے خلاف۔ جسے آج تک پتہ نہیں تھا کہ اس کا حقیقتاً حیاتیاتی باپ کون ہے۔

مرنے والے نے چوہدری نثار پر اس کی والدہ کے ساتھ جنسی تعلقات کا الزام کیوں لگایا تھا؟ کیا وہ شیرو اور نگو کا بیٹا نہیں تھا؟ اس کی شکل وصورت شیرو اور نگو سے ملتی تھی۔ عادتیں ملتی تھیں۔ بول چال کا انداز ملتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی آواز واضح طور پر شیرو اور نگو کی آواز کا ملاپ سنائی دیتی تھی۔

پھر یہ سوچ کر کہ جمال پور جیسے دیہاتوں میں اگر دو افراد میں چوہدری نثار اور شیرو جیسے قریبی تعلقات ہوں تو لوگوں کا ذہن ایسی باتوں کی طرف چلا جاتا ہے اس نے بھی اپنے ذہن کی عدالت سے اس کیس کو خارج کر دیا۔

لیکن وہ اس بات پر خوش نہیں تھا کہ چوہدری نثار نے ایسی بات کہنے پر ایک لڑکے کو قتل کر دیا تھا۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے انسان کو قتل کرے۔ چاہے وہ کچھ بھی کہے۔

انسان پھولوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ہر انسان کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ سب اس مٹی سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی مٹی میں واپس لوٹ جاتے ہیں۔ کون کس طرح، کس مٹی میں اگتا ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہاں ان پھولوں کی خوشبو میں ضرور فرق ہوتا ہیں۔ کچھ پھولوں سے ایسی خوشگوار خوشبو بر آمد ہوتی ہے کہ انسان کا جی چاہتا ہے کہ ہمیشہ ان کے ارد گرد رہے۔ کبھی ان سے دور نہ ہو۔ اور کچھ پھولوں سے خوشبو کی بجائے ایسی ناخوشگوار بو بر آمد ہوتی ہے کہ انسان نہ چاہنے کے باوجود ان سے اتنی دور بھاگتا ہے کہ خود کو ان کے سائے سے بھی بچاتا ہے۔

ان سوچوں نے رضوان کو بہت جلد جمال پور میں رونما ہونے والے واقعہ کو بھلانے میں مدد دی اور وہ پوری تندہی سے کے ای میں اپنے تعلیمی معاملات میں دوبارہ جُٹ گیا۔

سمیرا اور اس کی سہیلیاں بھی ایک آدھ بار اسے ادھر ادھر دکھائی دیں لیکن اس کا ان سے آمنا سامنا نہ ہوا۔

کے ای میں یہ تعلیمی سر گرمیاں جاری تھیں کہ شہر میں آہستہ آہستہ موسم بہار نے سامان سفر باندھا اور اس کی جگہ گرمیوں نے جگہ جگہ اپنے خیمے گاڑنے شروع کئے۔

شہر کی سڑکوں پر جگہ جگہ ریڑھی لگانے والوں نے موسم سرما کے مشروبات کی جگہ موسم گرما کے مشروبات بیچنے شروع کر دیئے۔ چائے کی جگہ ٹھنڈے دودھ کی بوتلوں، قلفیوں، جامنوں اور فالسے نے لے لی۔

کالج میں گرمیوں کی چھٹیوں کے لیے مختلف ٹرپوں کے پروگرام بنناشروع ہوگئے۔ رضوان نے ٹرپ پر جانے والے طلبا اور طالبات کی فائنل لسٹ دیکھی تو اس میں سمیرا اور اس کی سہیلیوں کے نام بھی شامل تھے۔

سمیرا کا نام لسٹ میں دیکھ کر رضوان کو کچھ عجیب سا لگا۔ وہ نہ خوش تھا نہ حیران۔ صرف ایک تعجب تھا کہ سمیرا کے لیے نتھیا گلی جانے میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اس کا خاندان اسلام آباد میں مقیم تھا۔ اسلام آباد مری اور نتھیا گلی کے قدموں میں واقع ہے اور اسی جغرافیائی ٹرین کا حصہ ہے۔

اسے چاہیئے تھا کہ کراچی یا پشاور جانے والے ٹرپ کا حصہ بنتی۔ اس نے نتھیا گلی جانے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟ کیا اسے پتہ ہے کہ وہ بھی نتھیا گلی جا رہا ہے؟ کیا وہ اس ٹرپ میں اس کی وجہ سے شامل ہوئی ہے؟

یہ سب اس کے اپنے خیالات تھے۔ سمیرا نہ اس کی وجہ سے نتھیا گلی جا رہی تھی نہ کسی اور وجہ سے۔ اس کی سہیلیاں چاہتی تھیں کہ وہ چند دن اسلام آباد میں اس کے خاندان کے ساتھ گزاریں۔ چنانچہ باہمی مشورے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ نتھیا گلی والے ٹرپ کے ساتھ جائیں گی اور واپسی پر اسلام آباد رکیں گی۔

خود رضوان کے نتھیا گلی جانے کی وجہ خاصی دلچسپ تھی۔ اس نے سنا تھا کہ رات کے پچھلے پہر جب چاند نتھیا گلی کے جنگلوں کی سطح پر اترتا ہے تو ایسا حسین منظر جنم لیتا ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔

اس کی خواہش تھی کہ وہ نتھیا گلی جائے اور رات کے پچھلے پہر جب چاند ڈھلتے ہوئے درختوں کی سطح پر اترے تو وہ رات کی خاموشی میں جنگل کے پاس کھڑا ہو کر وائلن بجائے اور اس حسن کو اپنی دھنوں میں اس طرح سمولے کہ وہ اس کے وائلن کی سروں کا حصہ بن جائے۔

ویسے بھی اس کا پاکستان جمال پور سے شروع ہو کر لاہور پر ختم ہو جاتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ پاکستان کے دیگر شہروں کو بھی جانے۔ نتھیا گلی تک کے سفر میں کم از کم پنجاب کی حد تک وہ علاقے کا ایک حصہ دیکھ سکتا تھا۔

اسلام آباد پنجاب کا سر ہے جو کشمیر کے قدموں میں رکھا ہے۔ اسلام آباد تک وہ پنجاب میں سفر کرے گا اور پھر مری کے راستے نتھیا گلی جاتے ہوئے کشمیر کے جغرافیائی حسن کے مظاہر دیکھے گا۔

گرمیوں کی چھٹیوں کا آغاز ہوا تو کے ای کے طالب علموں کے تقریبا تمام علمی گردش کے گروپ اپنی مجوزہ منزلوں کی روانگی کے لیے تیار تھے۔

کراچی جانے والے طالب علموں نے ٹرین میں اسپیشل بوگی ریزرو کرار کھی تھی جبکہ نتھیا گلی جانے والوں نے پرائیوٹ کوچ کا بندوبست کرر کھا تھا۔

بس میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد تقریبا برابر تھی۔ لڑکے اور لڑکیاں زیادہ تر گروپوں کی شکل میں تھے۔ سمیرا اپنی سہیلیوں کے ساتھ کوچ پر سوار تھی جبکہ باقی لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔

رضوان حسب معمول تنہا تھا۔ کپڑوں کا ایک چھوٹا سا بیگ اور وائلن کا باکس اس کا کل سامانِ سفر تھا۔ وہ کوچ میں سوار ہوا تو اس نے کوچ میں بیٹھے تمام ساتھی طالب علموں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ اس نے دیکھا سمیرا اپنی سہیلیوں کے ساتھ ڈرائیور کی پشت پر واقع سیٹوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کوچ سائز کے اعتبار سے صرف اتنے ہی طالب علموں کے لیے تھی جتنے نتھیا گلی جارہے تھے۔ کوچ میں صرف ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی جبکہ باقی سب سیٹیں پر ہو چکی تھیں۔

رضوان اپنے چھوٹے سے بیگ اور وائلن کے ساتھ خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے بیگ اور وائلن کا باکس اپنی سیٹ کے نیچے رکھے اور سیٹ پر بیٹھ کر آنکھیں موند لیں۔

رضوان کی عادت تھی کہ جب بھی اسے فراغت کے لمحات میسر آتے وہ بیرونی دنیا سے خود کو منقطع کر کے اندر کی دنیا میں غوطہ زن ہو جاتا۔ اس کے اندر کی دنیا بھی اس کی وائلن کی دھنوں کی طرح انتہائی خوبصورت تھی۔

اس کے اندر کا سفر عموماً مٹی کے ایک بوتے سے شروع ہوتا اور پھر وہ مٹی کا بوتا پھیلتے پھیلتے پوری کائنات کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا جیسے ساری کائنات ابھی ابھی پیدا ہوئی ہے اور ہر چیز پر نوزائدگی کے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ چاند، سورج، ستارے، نیلا آسمان، اور فضا میں

تیرتی کہکشائیں، سب اپنی آنکھیں کھول کر شعور کی پہلی کرنوں سے روشناس ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پھر اسے لگتا کہ وہ اس کائنات کا حصہ ہے۔ اس کا اور کائنات کا دل ایک ساتھ دھڑکتا ہے۔ اور وہ اور کائنات دونوں ایک ساتھ سانس لیتے ہیں۔

شعور کی اس دنیا میں موجود وعدم ایک ہو جاتے، شعور اور لاشعور ایک ہو جاتے، خواب میں بیداری کی اور بیداری میں خواب کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی کہ خواب و بیداری کی تمیز مٹ جاتی۔

عام طور پر یہ کیفیت رات کے سناٹے میں وائلن بجاتے پیدا ہوتی۔ اسے لگتا کہ نہ وائلن کی باو اس کے ہاتھ میں ہے اور نہ وائلن کی تاروں پر اس کی انگلیاں ہیں۔ کائنات کی روح اس کے بازو اور انگلیوں کی ایک ساتھ حرکت کے ذریعے موسیقی تخلیق کر رہی ہے۔ اور وہ رفتہ رفتہ وائلن کی دھنوں میں ڈھلتا جا رہا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ کوچ میں بیٹھ کر آنکھیں موندتے ہی وہ کوچ اور کوچ میں سوار ساتھی مسافروں سے بے خبر ایک اور دنیا کی سیاحی میں دور بہت دور کائنات کے بیرونی کناروں میں تیر رہا تھا جبکہ سمیرا اور اس کی سہیلیاں باہمی جملہ بازی سے مسلسل کوشاں تھیں کہ اسے کسی طرح ڈائیلاگ میں الجھایا جائے۔

لیکن اس کے بارے میں سمیرا اور اس کی سہیلیوں کی جملہ بازی اسے اس حیرت کدے سے باہر لانے میں تب تک غیر موثر رہی جب تک ڈرائیور نے کوچ سڑک کے کنارے مسافروں کے لیے بنائے گئے ایک ریستوران کے سامنے کھڑے کرتے ہوئے پندرہ منٹ کے لیے رکنے کا اعلان نہیں کیا۔

رضوان ڈرائیور کے اعلان سے لاشعوری دنیا سے شعوری دنیا میں آیا تو سمیرا اور اس کی سہیلیاں اس کے پیچھے والی سیٹوں سے اٹھ کر کوچ کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

وہ بھی اپنی سیٹ سے اٹھ کر ان کے پیچھے ہولیا۔ جب وہ سب کوچ سے نیچے اتر کر چند لمحے ٹانگیں سیدھی کر رہے تھے تو سمیرا کی ایک سہیلی نے رضوان سے پوچھا کیا وہ ان کے ساتھ ریستوران میں چائے پینا پسند کرے گا؟

اس نے ان کی چائے کی دعوت یہ کہہ کر قبول کی کہ وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر چائے ضرو پیے گا لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ سپرنگ فیسٹیول کی طرح مورنیاں بننے کا وعدہ کر کے غائب نہیں ہو جائیں گی؟

"نہیں نہیں اب ایسا نہیں ہو گا۔ دراصل سمیرا اس دن کے لیے اس سے معذرت کرنا چاہتی ہے اور وہ سب بھی۔۔۔"

"سمیرا کو معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں آپ سب کی معذرت میں سچے دل سے قبول کرتا ہوں۔"

"ارے یہ کیا۔ سمیرا کو معذرت سے استثنا کیوں؟ اور ہماری معذرت کی قبولیت چہ معنی دارد؟" وہ سب بیک زبان چہچہا اٹھیں۔

"سمیرا نے میرے ساتھ اتنی بڑی نیکی کی ہے کہ میں زندگی بھر اس کا شکریہ ادا کرتا رہوں تو ناکافی ہے۔ اور میں احسان فراموش انسان نہیں ہوں۔ اس کی نیکی کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

"رضوان پندرہ منٹ کی بریک ہے۔ تم زندگی بھر کا بکھیڑا نپٹانے چل نکلے ہو۔ چلو چائے پئیں ورنہ ڈرائیور نتھیاگلی تک اور کہیں نہیں رکے گا۔" انہوں نے شرارت آمیز لہجے میں رضوان کو ریستوران کی طرف چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ پنجاب کی گرمیوں میں پیاس کو جس طرح چائے بجھاتی ہے کوئی اور مشروب نہیں بجھاتا۔ بہت سے لوگ اس خیال سے لسی اور ٹھنڈے دودھ کی بوتلیں پیتے ہیں کہ ان سے پیاس بجھے گی حالانکہ ان سے پیاس اور بھڑکتی ہے۔ جبکہ چائے کے ایک کپ کے بعد کئی گھنٹوں تک پیاس نہیں لگتی۔"

اس نے سمیرا اور اس کی سہیلیوں کے ساتھ ریستوران میں ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ سمیرا نے رضوان

کی تائید کی اور کہا:

"اور ایک بار جب وہ لسی یا ٹھنڈے دودھ کی بوتل پیتے ہیں تو پھر اور پینا چاہتے ہیں جبکہ گرمیوں میں چائے کے ایک کپ کے بعد دوسرے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔اور پیاس بھی بجھ جاتی ہے۔"

"ارے یہ ہم کیا انقلاب دیکھ رہے ہیں۔ رضوان اور سمیرا کی چائے کے کپ کے بارے میں رائے ایک ہو گئی ہے۔ جبکہ ہم سمجھتے تھے ان کی رائے کبھی ایک نہیں ہو سکتی۔" سمیرا کی ایک سہیلی نے ٹیبل کو اپنی دونوں ہتھیلیوں سے پیٹتے ہوئے کہا۔

"رائے ایک یا دو ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رائے کا اختلاف انسانی ذہن کا حسن ہے۔ دو انسان جب ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں تو ایک کہتا ہے میں ہوں اور اس کے جواب میں دوسرا کہتا کہ اگر تم ہو تو میں بھی ہوں۔" سمیرا نے اپنی سہیلی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر رضوان سے بولی:

"رضوان ہم سب تمہیں ایک ساتھی طالب علم، ایک ذہین انسان، اور ایک انتہائی ماہر وائلنسٹ کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن تفصیل سے تمہاری زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ کیا تم ہمیں تفصیل سے اپنے بارے میں بتانا پسند کروگے؟"

"سمیرا میری زندگی میں سوائے تم نے جو اپنے تین جملوں میں کہا ہے کچھ نہیں۔ بلکہ اپنے دوسرے جملے میں تم نے جو ذہین کا لفظ استعمال کیا ہے وہ بھی زائد استعمال کیا ہے۔ میں صرف انسان ہوں ذہین بالکل نہیں۔ ذہانت ایک اضافی اصطلاح ہے۔ اضافتوں کے بے جا استعمال سے چیزوں میں اشتراک نہیں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ اور اختلاف انسانی ذہن کا حسن ضرور ہو سکتا ہے لیکن سماجی عمل اضداد کے اشتراک سے آگے بڑھتا ہے۔ خالی خولی اختلاف سے سماجی عمل انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر بھی آپ اگر میری زندگی کی کہانی سننا چاہیں تو میں حاضر ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں پہلے آپ سب مجھے اپنے بارے میں بتائیں۔"

اس سے پہلے کہ سمیرا کچھ کہتی ڈرائیور نے سب طالب علموں کو کوچ میں بیٹھنے کیا اشارہ کیا۔ جس پر وہ ریستوران کا بل ادا کر کے کوچ میں جا بیٹھے۔

کوچ میں بیٹھتے ہی سمیرا کی سہیلیوں میں سے ایک نے ایک ساتھ بیٹھے طالب علم سے درخواست کی کہ اگر وہ رضوان کے ساتھ اپنی سیٹ بدل لے تو اس کی مہربانی ہو گی کیونکہ وہ اوراس کی سہیلیاں رضوان کے ساتھ کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہیں۔

رضوان نے نا محسوس انداز میں طالب علم کو ہاتھ کے اشارے سے سیٹ بدلنے سے منع کر دیا اور خود آنکھیں موند کر اندرونی دنیا کے سفر پر نکل کھڑا ہوا جب کہ کوچ دوبارہ نتھیا گلی کی طرف چل پڑی۔

فصل 13

دن ڈھلے کوچ نتھیا گلی پہنچی تو سارے طالب علم سفر کی طوالت سے تھک چکے تھے۔ ان کے رہنے کے لیے کالج انتظامیہ نے ٹورازم کے ریسٹ ہاوس میں اہتمام کر رکھا تھا۔

برف ابھی تک سڑکوں کے گرد موجود تھی۔ ہوا خنک تھی۔ چنانچہ سب طلبا و طالبات جلدی سے کوچ سے اپنا سامان اٹھا کر ستانے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

ریسٹ ہاوس کی تعمیر اس طرح کی گئی تھی کہ ہر کمرے سے پہاڑیوں کے اتار چڑھاؤ پر دور تک اُگے چیڑ، شاہ بلوط اور دیودار کے درختوں کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔

ریسٹ ہاوس کے انچارج نے سب طلبا و طالبات کو کمروں میں جانے سے پہلے نتھیا گلی کے جنگلوں میں پائے جانے والے جانوروں کے بارے میں بتایا۔

اس کا کہنا تھا کہ ان جنگلوں میں ہر طرح کے جنگلی جانور پائے جاتے ہیں۔ جن میں چیتے اور جنگلی بلے خطرناک ہیں۔ لیکن آج تک کسی چیتے یا جنگلی بلے نے کسی انسان پر حملہ نہیں کیا۔

تاہم یہاں پائے جانے والے بندر کافی شرارتی ہیں۔ وہ اکثر گھروں سے کھانے پینے کا سامان اور کبھی کبھار کپڑے چرا لے جاتے ہیں۔ بنیانوں اور انڈرویرز سے کھیلنا انہیں اچھا لگتا ہے۔

ہاں کبھی کبھار جنگل کی گہرائی سے کوئی ایک آدھ شیر ادھر آنکلتا ہے جو راتوں کی تنہائی میں دھاڑتا ہے تو دل دہل جاتے ہیں۔ لیکن عام طور پر وہ شیر چیتوں اور جنگلی بلوں کی طرح رہائشی علاقے سے دور رہتا ہے۔ اور آج تک کبھی کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا کہ بھٹک کر آنے والے کسی شیر نے کسی پر حملہ کیا ہو یا کسی کو زخمی کیا ہو۔

اس نے بستروں میں پائے جانے والے کھٹملوں کے بارے میں بھی طالب علموں کو وارننگ دی۔ اس نے

انہیں بتایا کہ ریسٹ ہاوس میں پوری کوشش کی جاتی ہیں کہ کھٹمل کش دواؤں کے ذریعے بستروں کو ان سے پاک رکھا جائے لیکن موسم کی مناسبت کی وجہ سے وہ بسرعت بستروں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہر کمرے میں کھٹمل کش اسپرے رکھا ہے۔ اگر کہیں کوئی کھٹمل دکھائی دے تو فوراً اسپرے کر دیں۔

یہ اسپرے بو سے پاک ہے۔ اس کے استعمال سے نہ آپ کو بو آئے گی نہ اس کا آپ کے جسم پر کوئی ریکشن ہو گا کیونکہ یہ ہر قسم کے کیمکل ریکشن سے پاک ہے۔ اس سے آپ کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا بھی کوئی خطرہ نہیں۔

اس نے طالب علموں کو یہ بھی بتایا کہ ان کے قیام کے دوران ناشتے اور ڈنر کا انتظام ریسٹ ہاوس میں ہو گا۔ ناشتہ اور ڈنر ان کے پیکیج میں شامل ہے لیکن لنچ کے بارے میں انہیں ناشتے کے وقت اطلاع دینا ہو گی۔ جتنے طالب علم یہاں ریسٹ ہاوس میں لنچ کرنا چاہیں گے اس کا انتظام کر دیا جائے گا۔

چند گھنٹے اپنے کمروں میں آرام کے بعد تقریباً سبھی طلبا و طالبات گرم پانی سے شاور لینے کے بعد ریسٹ ہاؤس کے ڈائننگ ہال میں کھانے کے لیے جمع ہوئے تو ڈائننگ ہال ان کے شور و غل سے بھر گیا۔ سب اپنے دوستوں کے ساتھ کھانے کے ٹیبلوں پر بیٹھ کر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

سمیرا اور اس کی سہیلیوں نے رضوان کو اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی جو اس نے بخوشی قبول کر لی۔

انہوں نے دوبارہ گفتگو وہیں سے شروع کی جہاں اس کا سلسلہ کوچ کے ریسٹ اسٹاپ والے ریستوران میں ٹوٹا تھا۔

سمیرا اور اس کی سہیلیاں رضوان کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں۔ اس سے اس کی کہانی سننا چاہتی تھیں۔ جبکہ وہ چاہتا تھا کہ اس سے پہلے کہ وہ اپنے بارے میں کچھ کہے سمیرا اور اس کی سہیلیاں اپنی اپنی کہانی پیش کریں۔

اس پہلے آپ پہلے آپ کے چکر میں ریسٹ ہاؤس کے بیروں نے خوراک میزوں پر چن دی۔

ڈائننگ ہال میں پہلے صرف انسانی شور تھا اب چمچوں اور پلیٹوں کا شور بھی اس میں شامل ہوا تو ایک دوسرے کی بات سننا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ اس لیے گفتگو کا رخ سنجیدہ باتوں سے ہلکے پھلکے مذاقوں کی طرف مڑ گیا۔

سمیرا اور اس کی سہیلیوں نے اپنے اپنے عزیز و اقارب کی کھانے پینے کی عادتوں کے حوالے سے خوب جوک سنائے۔ جبکہ رضوان نے جمال پور کے شب و روز کے حوالے سے انہیں بتایا کہ اسلام آباد اور لاہور سے باہر بھی لوگ جیتے ہیں اور ان کی زندگیاں بھی اسی طرح غم اور خوشی کی دھوپ چھاؤں میں گزرتی ہیں جیسے بڑے شہروں میں رہنے والوں کی۔

رضوان جب سمیرا اور اس کی سہیلیوں کو بتا رہا تھا کہ کس طرح وہ صبح اٹھ کر گدھوں کو چارہ ڈالتا تھا، پانی پلاتا تھا اور اپنے باپو کے لیے مٹی کے بوتے بناتا تھا تاکہ وہ انہیں چاک پر چڑھا کر مختلف شکلوں میں ڈھال سکے تو سمیرا اور اس کی سہیلیاں حیرت سے اس کا منہ تک رہی تھیں۔

وہ انہیں بتا رہا تھا کہ گدھے کس طرح پسندیدہ چارے سے خوش ہوتے ہیں اور کیسے ناپسندیدہ چارے پر ناخوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ کیسے ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔ کس طرح نر اور مادہ گدھے سرمستی کے عالم میں ایک دوسرے کے ساتھ منہ جوڑ کر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ پھر کیسے یہ سرمستی جنسی عمل پر منتج ہوتی ہے۔

سمیرا اور اس کی سہیلیاں پورے انہماک سے رضوان کی گفتگو سن رہی تھیں۔

اگر عام پاکستانی لڑکے اور لڑکیاں کھانے کی میز پر بیٹھے ہوتے تو شاید یہ گفتگو ممکن نہ ہوتی۔ لیکن وہ سب میڈیکل سائنس کے طالب علم تھے۔ ان کے لیے جنسی عمل کے بارے میں گفتگو میں وہ مسائل حائل نہیں تھے جو عموماً اس عمر کے غیر سائنسی مضامین کے طالب علموں میں ہوتے ہیں۔

سمیرا اور اس کی سہیلیوں کی اپنے عزیزو اقارب کے کھانے پینے کی مزاحیہ عادتوں سے شروع ہوئی اور رضوان کی نر اور مادہ گدھوں کے جسنی تعلقات سے ہوتے ہوئی پودوں، پرندوں اور جانوروں کے جنسی تعلقات تک پھیل گئی۔

سمیرا کی ایک سہیلی نے کہا کہ مردوں کا جنسی رویہ مرغوں اور چڑوں سے ملتا ہے۔ رضوان نے کہا سب مردوں کا جنسی رویہ مرغوں اور چڑوں سے نہیں ملتا زیادہ تر مرد ایک عورت کے ساتھ خوش رہتے ہیں اور ساری زندگی انتہائی دیانت داری سے اس کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ مل کر بچوں کی پیدائش اور پرورش میں اپنا ضروری کردار ادا کرتے ہیں۔

سمیرا نے رضوان کی بات سن کر کہا کہ اس کی بات کسی حد تک صحیح ہے لیکن زیادہ تر مرد عورتوں اور بچوں کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور ان میں اضافے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مردوں نے آج تک اس دنیا میں جتنی ایجادات کی ہیں، جتنی جنگیں کی ہیں، جتنے مذہبوں کو جنم دیا ہے، جتنے فلسفے تراشے ہیں، جتنے قوانین بنائے ہیں، جتنے حکومتی ادارے بنائے ہیں سب عورتوں پر اپنی برتری مسلط رکھنے کے لیے بنائے ہیں تو غلط نہیں ہو گا۔

رضوان نے سمیرا کی بات سنی تو کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اور پھر ہنستا چلا گیا۔

سمیرا اور اس کی سہیلیوں نے رضوان سے اس کے ہنسنے کا سبب پوچھا تو کہنے لگا کہ سمیرا نے جس طرح دنیا میں ہر چیز کا تعلق مرد کی عورت پر برتری قائم رکھنے کی خواہش سے جوڑ دیا ہے وہ حیران کن ہے۔

سمیرا بھول گئی ہے کہ مرد گدھوں سے زیادہ بے وقوف جانور ہے جو عورت کی ایک نگاہِ غلط انداز پر اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اپنی زندگی ہار جاتا ہے۔

انہی باتوں میں ڈنر اختتام پذیر ہوا تو بیروں نے چائے کے خواہش مند طالب علموں کے سامنے چائے کے کپ، شوگر، قہوہ اور دودھ دانیاں رکھ دیں۔

عین اس وقت نتھیا گلی کے چند پہاڑی لڑکے اور لڑکیاں ہاتھ میں سادہ مقامی دیہاتی سازوں کی لے پر ملکہ پکھراج کا پہاڑی گیت اللہ بیلوا ہو، اللہ بیلوا ہو گاتے ہوئے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے تو سب طالب علموں نے ساری گفتگو چھوڑ کر ان کے ساتھ آواز ملا کر اللہ بیلوا ہو، اللہ بیلوا ہو گانا شروع کر دیا۔

پہاڑی لڑکوں اور لڑکیوں نے رات ڈھلے تک انہیں اپنے گیتوں سے محظوظ کیا پھر سارے طالب علم اٹھ کر سونے کے لیے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

فصل 14

گزشتہ دن کی تھکن اور رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے سارے طالب علم صبح ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال میں پہنچے تو سارے میں خوشگوار دھوپ چمک رہی تھی۔

اردگرد پڑی برف سے ٹکرا کر لوٹنے والی سورج کی کرنیں ڈائننگ ہال کی کھلی کھڑکیوں سے ہال کے اندر کے ماحول کو منور کر رہی تھیں۔ چمکتی برف اور حدِ نظر تک پھیلے درختوں کے جھنڈ عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔

سمیرا اور اس کی سہلیاں رات والی ٹیبل پر ایک جگہ بیٹھی ناشتہ کر رہی تھیں۔ رضوان ابھی تک ڈائننگ ہال میں نہیں پہنچا تھا۔ سمیرا اور اس کی سہیلیاں اس کا ذکر کئے بغیر اس کی منتظر تھیں۔ گاہے بگاہے وہ کنکھیوں سے ہال کے دروازے کی طرف دیکھتیں اور پھر ناشتے میں مصروف ہو جاتیں۔

سمیرا سمیت سب سہیلیوں کے دل میں رضوان کے لیے ایک نرم گوشہ تھا لیکن کوئی ایک دوسری سے نہیں کہتی تھی کہ اس نے اپنے دل کے کسی کونے میں رضوان کی ایک چھوٹی سی تصویر سجالی ہے۔ لیکن سب کو کچھ کچھ اندازہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک رضوان کے لیے کچھ جذبات رکھتی ہے۔

فیسٹیول کمیٹی کی رضوان سے وائلن بجانے کی درخواست پر رضوان نے جس طرح ان سے خواہش ظاہر کی تھی کہ سمیرا اور اس کی سہیلیاں اس سے وائلن بجانے کی درخواست کریں اس سے ساتھی طالب علموں کو بھی کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ رضوان کے دل میں سمیرا اور اس کی سہیلیوں کے لیے کچھ جذبہ موجود ہے۔ لیکن رضوان نے کبھی براہ راست کسی سے کوئی ایسی بات نہ کہی جس سے کسی کو گمان گزرے کہ وہ سمیرا اور اس کی سہیلیوں میں کسی قسم کی کوئی دلچسپی رکھتا ہے۔

جب رضوان کافی دیر تک ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال میں نہ آیا تو سمیرا اور اس کی سہیلیاں ایک دوسرے کو احساس دلائے بغیر کہ ان میں سے ہر ایک اس کے آنے کی راہ دیکھ رہی ہے مضطرب ہونے لگیں۔

رضوان کی نتھیا گلی آنے کی وجہ باقی تمام طالب علموں سے مختلف تھی۔ اپنے ساتھی طالب علموں کے ساتھ وقت گزارنے کی بجائے وہ فطرت کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا۔

وہ علی الصبح اٹھ کر ریسٹ ہاؤس سے باہر جا کر جنگلوں کے پس منظر سے طوع ہوتے سورج کا منظر دیکھنا چاہتا تھا۔ سورج کی کنواری کرنوں سے غسل کرنا چاہتا تھا۔

اس کا خیال تھا جب رات کے اندھیروں کو چیرتا ہوا آفتاب زمین پر پہلی کرنیں بکھیرتا ہے جس چیز پر وہ کرنیں پڑ جائیں اس کا اندر باہر روشن ہو جاتا ہے۔ وہ فطرت کے ساتھ متوصل ہو جاتا ہے۔ فطرت اپنے حسن کے اظہار کے لیے اس کو وسیلے کے طور پر اپنا لیتی ہے اور پھر اس کا فن لافانی ہو جاتا ہے۔

رضوان جب غسلِ آفتابی کے مزے لوٹ رہا تھا۔ ڈائننگ ہال میں سمیرا اور اس کی سہیلیوں میں ان بن شروع ہو چکی تھی۔

عذرا نے غلطی سے سمیرا سے کہہ دیا تھا کہ وہ رضوان کے نہ آنے کی وجہ سے پریشان دکھائی دے رہی ہے۔

عذرا پشاور کی رہنے والی پٹھانی تھی۔ بہت شستہ اردو اور انگریزی بولتی تھی۔ اس کی اردو یا انگریزی کو سن کر کہنا مشکل تھا کہ وہ نسلاً پختون ہے۔

اس کا باپ صوبہ سرحد کا چیف سکریڑی تھا۔ اس نے پشاور ہی سے گورنمنٹ کالج سے پری میڈیکل میں نمایاں کامیابی کے بعد کے ای میں ایم بی بی ایس میں داخلہ لیا تھا۔

سمیرا باتوں میں کسی سے کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔ فوراً بولی: " میں تمہیں پریشان دکھائی دیتی ہوں۔ حالانکہ تمہاری آنکھوں سے رضوان کے لیے آنسو چھلکے پڑتے ہیں۔"

یاسمین نے سمیرا اور عذرا میں تو تکار ہوتی دیکھی تو فوراً مداخلت کرتے ہوئے بولی: "چھوڑو نہ یار رضوان

کے لیے کیوں لڑتی ہو۔ وہ تو آسمان کا تارا ہے کسی کے ہاتھ نہیں آئے گا۔"

یاسمین امریکہ سے غیر ملکی پاکستانیوں کے کوٹے میں نیویارک سے ایم بی بی ایس کرنے پاکستان آئی تھی۔ اس کا باپ نیویارک میں واقع ایک فارماسوٹیکل کمپنی کا مالک تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی ڈاکٹر بنے۔ چنانچہ اس نے یاسمین کو کے ای میں داخلہ دلوا دیا۔ ایک تو وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی ایم بی بی ایس کرے اور دوسرے وہ چاہتا تھا کہ اپنی عمر کے اس اہم حصے میں وہ پانچ چھ سال پاکستان میں گزارے تا کہ نیویارک میں کسی گورے کالے کی محبت میں گرفتار ہونے کی بجائے وہیں پاکستان میں اپنے کسی ہم جماعت کو پسند کر لے۔

سمیرا اور عذرا دونوں اپنا اختلاف بھلا کر یاسمین پر پل پڑیں: "ہمیں پتہ ہے تم امریکہ سے رضوان کے لیے ہی آئی ہو۔ اس لیے تمیں وہ آسمان کا تارا دکھائی دیتا ہے۔ تم چاہتی ہو کہ ہم اپنی آنکھیں بند رکھیں اور تم اسے امریکہ لے اُڑو۔"

یاسمین بھی نیویارک ہائی کی طالبہ رہی تھی۔ کئی بار کالی گوری لڑکیوں اور لڑکوں سے لڑ جھگڑ چکی تھی۔

سمیرا اور عذرا سے ترکی بہ ترکی بولی: " تمہارے گٹر جیسے گندے ذہنوں سے بُو کے بھبھو کے اُٹھنے لگے ہیں۔ رضوان تم جیسی گندی ذہنیت کی لڑکیوں کو منہ نہیں لگائے گا۔"

شائستہ اب تک چپ بیٹھی اپنی سہیلیوں کی نوک جھونک دیکھ اور سن رہی تھی چپ نہ رہ سکی:

"مجھے لگتا ہے تم سب رضوان کے لیے محبت کے جذبات رکھتی ہو۔ اس لیے یوں لڑ رہی ہو۔ بہتر یہ ہو گا کہ تم لڑائی جھگڑا چھوڑو اور یہ رضوان پر چھوڑ دو کہ وہ کس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہونا پسند کرتا ہے۔"

شائستہ ساہیوال کے ایک جاگیر دار کی بیٹی تھی۔ پڑھنے لکھنے میں تیز تھی۔ رنگ گندمی لیکن نقش و نگار انتہائی دلکش تھے۔ اس کے چہرے میں ایک خاص کشش تھی۔ جو بھی دیکھتا بس دیکھتا رہ جاتا۔ کئی بار اسے لوگوں سے پوچھنا پڑتا کہ وہ اس کی طرف کیوں دیکھے چلے جا رہے ہیں۔

شائستہ نے منہ کیا کھولا اس کی سہیلیاں اس کی جان کو آ گیں: "لو شائستہ بی بی کی شائستگی بھی دیکھ لو۔ ہم سب تو رضوان کے لیے لڑ رہی تھیں۔ اب یہ بھی اس لڑائی میں فریق بن گئی ہے۔"

سمیرا اور اس کی سہیلیوں کی نوک جھونک سے ڈائننگ ہال میں بیٹھے سب طالب علم ان کے طرف متوجہ ہو گئے۔ رضوان کے نام کی تکرار سے انہیں بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ کس بات پر جھگڑ رہی ہیں۔ چنانچہ سب اٹھ کر ان کے گرد جمع ہو گئے۔

انہوں نے سب طالب علموں کو اپنے گرد اکٹھے ہوتے دیکھا تو چاروں اٹھ کر ریسٹ ہاوس سے باہر آ گئیں۔ باقی طالب علم بھی ان کے پیچھے پیچھے ریسٹ ہاوس سے باہر چلے آئے۔

پھر سمیرا اور اس کی سہیلیوں اور دوسرے سب طالب علموں نے دیکھا کہ رضوان ہلکے ہلکے قدم اٹھاتا جنگل کی طرف سے ریسٹ ہاوس کی طرف آ رہا تھا۔

اس کا چہرہ مہاتما بدھ کے چہرے کی طرح پر سکون تھا۔ آسمان پر سورج عین اس کی پشت پر چمک رہا تھا۔ اس کی چال سے لگتا تھا کہ سورج سے زمین تک بنی کسی پگڈنڈی پر چل رہا ہے اور سورج کی روشنی اس کے جلو میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہی۔

جب وہ چلتے چلتے ان کے قریب پہنچا تو سب طالب علموں نے اسے دیکھ کر کہا رضوان اچھا ہوا تم لوٹ آئے ہو۔ اگر آج تم اس وقت نہ لوٹتے تو یہاں سمیرا اور اس کی سہیلیوں میں مہابھارت یُدھ ہو جاتا اور ہمارا نتھیا گلی کے ٹرپ کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ اس نے مسکرا کر ان سب کی طرف دیکھا اور بولا کہ اس کے لیے کسی کو مہابھارت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہ میڈیکل کا طالب علم ہے لیکن وہ ایک انتہائی معمولی انسان ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے لیے کوئی لڑائی جھگڑا کرے۔ اور ویسے بھی ہم یہاں گرمیوں کی چھٹیوں کو انجوائے کرنے کے لیے آئے ہیں۔ لڑیں جھگڑیں گے تو چھٹیوں کا لطف جاتا رہے گا۔

وہ سب وہیں کھڑے تھے کہ بندر ایک ٹولی کی شکل میں آگے پیچھے بھاگتے وہاں چلے آئے۔

بندر اور بندریاں ان کے پاس ہی دھوپ میں بیٹھ کر ایک دوسرے کے جسموں سے جوئیں چن کر کھانے لگے۔

سارے طالب علم اپنی گفتگو بھول کر دلچسپی سے بندروں کو دیکھنے لگے۔ کس قدر قریب ہیں یہ ہم انسانوں کے۔ یہ صرف ہماری طرح گفتگو نہیں کر سکتے۔ لیکن ان کی سماجی زندگی اور عادتیں کس قدر ہم سے ملتی جلتی ہیں۔

اور پھر بندروں نے واقعتاً انسانوں جیسا ہونے کا ثبوت بھی فراہم کر دیا۔ چند ایک نر بندر ایک بندریا کے پیچھے بھاگے۔ وہ بھاگ کر قریبی درخت پر چڑھ گئی۔

جو بندر بندریوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے ان میں سے ایک واپس زمین پر بیٹھے بندروں میں لوٹ آیا لیکن آتے ہی عضو تناسل نکال کر اپنے زانوؤں کو اپنے منہ سے کاٹنا شروع ہو گیا۔ لگتا تھا کہ اپنے عضو تناسل کو اپنے منہ میں ڈالنا چاہتا ہے لیکن اپنی جسمانی لچک کے باوجود ایسا کرنے سے قاصر ہے۔

پھر عضو تناسل کو ہاتھ میں پکڑ کر مشت زنی کرنے لگا۔ مشت زنی کے دوران وہ منہ سے عجیب و غریب طریقے سے غرانے کی آوازیں نکالتا رہا۔

لڑکوں نے بندر کو مشت زنی کرتے دیکھا تو اس کی ہمت بڑھانے کے لیے شور کرنا شروع ہو گئے جبکہ لڑکیوں کے چہرے شرم سے سرخ ہو گئے اور وہ فوراً ریسٹ ہاوس کے اندرونی حصے میں چلی گئیں۔

بندر مشت زنی سے فارغ ہوا تو لڑکے بھی لڑکیوں کے پیچھے ریسٹ ہاوس کے اندرونی حصے میں چلے آئے اور پھر لڑکیوں کو تنگ کرنے لگے۔

"تم ڈاکٹر بننے جا رہی ہو اور بندر کی اتنی سی حرکت سے لجا کر ریسٹ ہاوس کے اندر چلی آئی ہو۔"

لڑکیاں کہاں پیچھے رہنے والی تھیں۔ فوراً بولیں: "یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ ہم بندر کو مشت زنی کرتے دیکھ کر اندر آئی تھیں۔ ہم تم لوگوں کی حالت دیکھ کر اندر چلی آئی تھیں۔ کیونکہ کہ مشت زنی کرنے والے بندر سے تم زیادہ پاگل ہوئے جا رہے تھے۔"

لڑکیوں کے ترکی بہ ترکی جواب سے لڑکوں نے بہتر سمجھا کہ موضوع تبدیل کر دیں۔ چنانچہ وہ دن کا باقی حصہ ریسٹ ہاوس میں گزارنے کی بجائے باہر جانے کے بارے میں پروگرام بنانے لگے۔

رضوان نے کہیں جانے سے معذرت کرلی۔ اس نے کہا کہ وہ کہیں باہر جانے کی بجائے باقی ماندہ دن ریسٹ ہاوس میں گزارنا چاہتا ہے۔ رضوان نے علی الصبح نتھیا گلی میں سورج نکلنے کا منظر دیکھا تھا۔ وہ دن میں آرام کرنا چاہتا تھا تا کہ رات جب سارے علاقے میں چاندنی پھیلے تو زیادہ سے زیادہ وقت کھلے آسمان تلے بسر کرے۔

رضوان کے باہر جانے کے انکار پر سمیرا اور اس کی سہیلیوں نے بھی باقی دن ریسٹ ہاوس میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

جبکہ باقی سب طلبا و طالبات گھوڑوں پر بیٹھ کر جنگل کی سیاحت کے لیے روانہ ہو گئے۔

فصل 15

گرمیاں اگرچہ امیر اور غریب میں تمیز نہیں کرتیں۔ لیکن پاکستان ابھی تک ان ملکوں میں شامل ہے جہاں امیر لوگ گرمیوں میں ٹھنڈے علاقوں میں چلے جاتے ہیں جبکہ غریب بے چارے اپنے جہنم زاروں میں گرمیوں اور سردیوں کے ستم برداشت کرتے رہتے ہیں۔

مری اور نتھیا گلی بھی ان ہل اسٹیشنوں میں شامل ہیں جہاں پنجاب کے مڈل اور اپر مڈل کلاس خانوادے اپنی گرمیاں اور سردیاں گزارنے کے لیے آتے ہیں۔ گرمیوں میں وہ موسم کی سختیوں سے بچنے کے لیے یہاں آتے ہیں جبکہ سردیوں میں برف بازی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ان ہل اسٹیشنوں کا رخ کرتے ہیں۔

آج کل اگرچہ پورا پنجاب، سندھ، سرحد اور کچھ پر فضا مقامات کے علاوہ باقی بلوچستان گرمیوں میں جل رہا تھا۔ لُو کے تھپیڑے ہر ذی روح جسم کو ادھیڑے جارہے تھے۔ لیکن مری اور نتھیا گلی میں موسم خاصہ خوشگوار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پورے پاکستان کے خوشحال گھرانے یہاں ڈیرہ جمائے بیٹھے تھے۔

کسی زمانے میں لوگ تنہائی کی تلاش میں جنگلوں اور پہاڑی علاقوں میں جاتے تھے۔ لیکن ان نو دولتیوں کے سبب اب جنگل اور پہاڑی علاقے بھی تنہائی جیسی نعمت سے محروم ہو چکے تھے۔

کے ای کے طالب علم سوائے رضوان اور سمیرا اور اس کی سہیلیوں کے ریسٹ ہاوس سے گھوڑوں پر بیٹھ کر جنگل کی طرف روانہ ہوئے تو جنگل میں منگل کا سماں پیدا ہو گیا۔

ریسٹ ہاوس کے باہر انہوں نے چند بندروں کی کاروائی ملاحظہ کی تھی لیکن یہاں تو حضرت ہنومان کے رشتہ داروں کے قبیلے کے قبیلے آگے پیچھے درختوں پر چیخ چنگاڑ کر رہے تھے۔

درختوں پر بیٹھے پہاڑی کوے اور بندر گرے پڑے خوراک کے ٹکڑوں کے لیے ایک دوسرے کی چالاکی اور پھرتی کا امتحان لے رہے تھے۔ اگرچہ بندروں اور پرندوں کو خوراک ڈالنا محکمہ سیاحت کے اصولوں کے خلاف تھا لیکن یہاں آنے والے پاکستانی ابھی اصول پرستی یا اصول کی پابندی جیسی خرافات سے بہت دور تھے۔ چنانچہ جنگل میں بنی پگڈنڈیوں کے ارد گرد جگہ جگہ بچی کھچی خوراک کے ٹکڑے اور پلاسٹک کے شاپرز بیگ بکھرے پڑے تھے۔

گھوڑوں کی پشتوں پر سوار طالب علموں کا قافلہ رفتہ رفتہ کالے جنگل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کالے جنگل میں اگرچہ کبھی کبھار کوئی چیتا دکھائی دے جاتا تھا لیکن کبھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود ریسٹ ہاوس کی انتظامیہ نے ایک عدد گن بردار ان کے ساتھ کر دیا۔ تاکہ کسی خطرناک صورت حال کے پیدا ہونے کے نتیجے میں فوری کاروائی کی جا سکے۔

جب طالب علموں کا گھڑ سوار قافلہ کالے جنگل کی طرف جا رہا تھا رضوان اپنے کمرے میں لیٹا آرام کر رہا تھا۔ سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ کی باہمی لڑائی نے اس کے کان کھڑے کر دیے تھے۔

گورنمنٹ کالج میں بھی لڑکیاں اس کے حوالے سے کہانیاں بناتی رہتی تھیں لیکن اس نے ان کی کہانیوں کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ ایک کان سے کچھ سنتا تو دوسرے سے نکال دیتا۔ اسے پتہ تھا کہ گورنمنٹ کالج میں وہ صرف دو برس کے لیے پری میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے آیا ہے۔ اور دو برسوں کا عرصہ پلک جھپکتے گزر جائے گا۔ لیکن کے ای میں تو ابھی اس کا پہلا سال تھا۔ اسے کم از کم چار پانچ برس اور وہاں گزارنے تھے۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا اسکینڈل بنے کہ اس کے باقی ماندہ برسوں میں اس کے لیے کسی بھی قسم کے مسائل کھڑے ہوں۔

اگرچہ وہ اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں کسی کمپلیکس کا شکار نہیں تھا پھر بھی اس کے ذہن کی گہرائیوں میں بہت نیچے کہیں یہ بات موجود تھی کہ پاکستان جیسے ملک میں جہاں ذات پات، سرمائے پیسے،

اور معاشی مرتبہ و مقام بہت اہمیت رکھتے ہیں وہ صرف اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے جس مقام پر پہنچا ہے اس کی حفاظت کرنا ازحد ضروری ہے۔ اگر اس کے لیے اس کی صلاحیتوں کے باوجود کسی جگہ کوئی رکاوٹ آئی تو اس کے لیے اپنی ترقی کا عمل جاری رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔

سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ چاروں اچھے اور طاقت ور خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ اگر ان میں سے کسی ایک خاندان نے کسی بھی وجہ سے اس کے راستے کی رکاوٹ بننے کا فیصلہ کر لیا تو اس کی زندگی صرف وائلن بجانے تک محدود رہ جائے گی۔ اور ڈاکٹری کا خواب تعبیر پانے سے پہلے بکھر جائے گا۔

اس خیال سے اس کے ذہن میں خطرے کی چار گھنٹیاں بجنے لگیں۔ وہ ان چاروں میں سے کسی کو خوش یا ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سمیرا کا باپ کرنل اکرام اگر اس کے باپ اور چچا چوہدری نثار پر بنا قتل کیس فوراً ختم کروا سکتا تھا تو ناراضگی کی صورت میں اس کی زندگی بھی اجیرن کر سکتا تھا۔

چیف سکریٹری سرحد بھی اعلیٰ ترین سطح کا سرکاری افسر تھا۔ وہ آج کل صوبہ سرحد میں تعینات تھا لیکن بنیادی طور پر فیڈرل حکومت کا حصہ تھا۔ چنانچہ اس کے تعلقات اور حلقہ اثر صرف صوبہ سرحد تک محدود نہیں تھا۔ ضرورت پڑنے کی شکل میں وہ پورے پاکستان میں کسی بھی جگہ کسی کے راستے میں کوئی بھی اڑچن کھڑی کر سکتا تھا۔

باقی رہے پنجاب کے بڑے زمین دار تو وہ آدھے زمین دار اور آدھے جرائم پیشہ افراد تھے۔ لوگوں کو مارنا مروانا ان کے روزمرہ کے معمولات تھے۔

ہاں شائستہ کے باپ کا نیویارک میں بہت بڑا فارماسوٹیکل کا کاروبار تھا اور وہ پاکستان میں زیادہ گہری جڑیں نہیں رکھتا تھا لیکن پاکستان میں روپے پیسے سے جس طرح ہر چیز بکتی ہے اس لیے اس کے اثر و رسوخ کو کم اہمیت دینا قرین مصلحت نہیں تھا۔

ان سب خیالات کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ جس طرح وہ چاروں اس پر یلغار کر رہی ہیں مناسب رہے گا کہ وہ ان چاروں کے ساتھ اپنے تعلقات ٹھیک رکھے اور کسی ایک کو یہ تاثر نہ دے کہ اس کے دل میں اس کے لیے کوئی نرم گوشہ موجود ہے۔

انہی خیالوں میں الجھا دن کے پچھلے پہر وہ اپنے کمرے سے نکل کر چائے پینے کے لیے ریسٹ ہاوس کی لابی میں آیا تو اس نے دیکھا سمیرا اور اس کی سہیلیاں صبح کی ظاہری تو تکار کے بعد اکھٹی بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔

اسے لابی کی طرف آتے دیکھ کر سمیرا اور اس کی سہیلیوں نے بیک وقت اس کی طرف ہاتھ ہلایا اور اسے اشارہ کیا کہ وہ ان کے پاس آکر بیٹھ جائے۔

اس نے لابی کے نیوز ڈیسک پر رکھے چند اخبارات اور میگیزینوں پر نظریں دوڑاتے ہوئے سمیرا اور اس کی سہیلیوں کو تاثر دیا کہ وہ ان کے ساتھ بیٹھنے کی بجائے وہیں بیٹھ کر اخبار پڑھنا اور چائے پینا چاہتا ہے۔ لیکن سمیرا بھی کرنل اکرام اللہ کی بیٹی تھی۔ کیسے الگ تھلگ بیٹھی رہتی۔ فوراً سہیلیوں کے ساتھ اٹھی اور آکر رضوان کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ عذرا، یاسمین اور شائستہ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئیں۔

پھر رضوان سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی:

" رضوان ہمیں لگتا تم ابھی تک سپرنگ فیسٹیول والی بات کو بھولے نہیں۔"

"سمیرا بی بی آپ کس بات کی بات کر رہی ہیں؟"

"وہی جو تم نے ہمیں مورنیاں بننے کے لیے کہا تھا اور ہم وعدہ کرنے کے باوجود اسٹیج سے دور رہی تھیں۔"

سمیرا کی بات سنتے ہی رضوان کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ ایسے ہنسا کہ اس سے پہلے کبھی ہنسا نہ تھا۔ جب اس کی ہنسی ذرا تھمی تو بولا:

" سمیرا بی بی میں نے آپ کی وعدہ خلافی کا بالکل برا نہیں منایا تھا۔ آپ اور آپ کی سہیلیاں میرے

کہنے کے مطابق اسٹیج پر آتیں تو آپ کی عزت بڑھتی اور حاضرین ہماری مشترکہ پرفارمنس سے لطف اندوز ہوتے۔ لیکن پھر آپ اور آپ کی یہی سہیلیاں اسٹیج پر آنے کی بجائے باقی سب طالب علموں کے ساتھ اسٹیج سے نیچے وائلن کی دھنوں کے ساتھ لہراتے رہے۔ اور اس طرح اس فنکشن کا حصہ بنے۔"

"چلیں رضوان آپ کی یہ وضاحت مان لی۔ لیکن یہ بتاؤ آپ ہمہ وقت ہم سے دور کیوں بھاگتے ہو؟"

"میں کسی سے دور نہیں بھاگتا۔ میں ایک سیدھا سادہ دیہاتی لڑکا ہوں۔ بہت معمولی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس لیے کام سے کام رکھتا ہوں۔ کسی غیر ضروری چیز میں الجھنے سے گریز کرتا ہوں۔"

" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہمیں غیر ضروری چیزیں سمجھتے ہیں۔؟" سمیرا نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں نچاتے ہوئے ہلکے طنزیہ انداز میں استفسار کیا۔

"سمیرا بی بی آپ پھر میری بات کو غلط مفہوم دے رہی ہیں۔ میں نہ آپ کو غیر ضروری چیزیں سمجھتا ہوں نہ آپ سے بے التفاتی کرتا ہوں۔ صرف مختلف کلاسوں میں ہونے کی وجہ سے ہمارے راستے کراس نہیں کرتے اس لیے سامنا نہیں ہوتا۔"

"اور یہ جو آپ ہمارے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے کی بجائے یہاں بیٹھ کر میگزین پڑھنا اور چائے پینا چاہتے ہیں کیا یہ بے التفاتی نہیں؟" یاسمین بھی سمیرا کی مدد کے لیے میدان میں کود پڑی۔

"یاس جی۔۔۔" رضوان نے رخ یاسمین کی طرف موڑتے ہوئے کہا:

"بہت دنوں سے اخبار دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ابھی چند لمحے میسر آئے ہیں تو ارد گرد کی دنیا کے بارے میں باخبر ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"کیا ہم آپ کی ارد گرد کی دنیا میں شامل نہیں؟" یاسمین نے آنکھیں سیدھی رضوان کے چہرے پر اٹکاتے ہوئے سوال کیا۔

یاسمین کے سوال اور اسٹائل سے رضوان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اسے محسوس ہوا وہ چاروں سہیلیاں پلان کے تحت اس سے الجھ رہی ہیں۔ اس نے بھی ان کے ساتھ ڈائرکٹ ہونے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا:

"اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک سنجیدہ مخمصے کا شکار ہوں۔ آپ چاروں اتنی خوبصورت ہیں کہ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کس کے قریب ہوں اور کس سے دور رہوں۔ اگر میں کسی ایک کے قریب ہوا تو باقیوں سے مجھے دور ہٹنا پڑے گا۔ اور یہ مجھے قبول نہیں۔"

رضوان کی ڈائرکٹ اپروچ نے چاروں کو چاروں شانے چت کیا اور انہیں تھوڑا پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ چاروں سہیلیوں کے دلوں میں بیٹھے چوروں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور سرکس کے مسخروں کی طرح گھورتے ہوئے ان کا منہ چڑانے لگے۔ انہیں محسوس ہوا رضوان ان کے دلوں میں بیٹھے چوروں کو جانتا ہے اسی وجہ سے ان کی قربت سے دور رہتا ہے۔ لیکن وہ بھی تہیہ کئے ہوئے تھیں کہ نتھیا گلی سے لوٹنے سے پہلے رضوان کو اپنے حلقہ دوستان میں شامل کر کے رہنا ہے۔

سمیرا نے پینترہ بدلتے ہوئے شکائتی انداز میں رضوان سے کہا:

"رضوان آپ جانتے ہو آپ نے اپنے گرد ایک انتہائی مضبوط حصار کھڑا کر رکھا ہے۔ آپ کسی کو اجازت نہیں دیتے کہ کوئی اس حصار کے اندر آئے۔"

"نہیں سمیرا بی بی۔ ایسی بات نہیں۔ آپ نے اس دن میری زندگی خرید لی تھی جس دن آپ نے میرے باپو اور باپو کے دوست چوہدری نثار کی پولیس سے جان چھڑائی تھی۔ ورنہ ہمارے پاس تو پولیس کو دینے کے لیے دو لاکھ تو کیا دو ہزار روپے بھی نہیں تھے۔

میرا ابا پو اپنا چند مرلے کا آبائی گھر، چند مرلے کا احاطہ اور پانچوں گدھے بیچنے جا رہا تھا اور پھر بھی چند ہزار روپے جمع ہوتے تھے۔"

"نہیں رضوان میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ میرے باپ کی ایسی پوزیشن ہے کہ وہ ایسے معاملات با آسانی حل کروا سکتے ہیں چنانچہ میں نے مدد کر دی۔"

پھر تھوڑا سا مزہ لینے کے لیے بولی:

"رضوان یہ بتاو اگر میں تمہاری مدد نہیں کرتی تو تم اور تمہاری فیملی کیا کرتی؟"

"جب مجھے اپنے باپو کی مشکل کے بارے میں پتہ چلا تھا۔ میرے ذہن میں کئی خیال آئے تھے۔

جب میں نے گورنمنٹ کالج میں کنسرٹ کیا تھا۔ ایک یوروپین کمپنی نے میری گدھے والی تصویر کے حقوق خریدنے کی بات کی تھی۔ میں نے انکار کر دیا تھا۔

اگر کچھ نہ ہوتا تو میرے ذہن میں تھا دوبارہ ان سے رابطہ کر کے تصویر کے حقوق انہیں بیچ دوں گا۔ ڈالروں میں پے مینٹ ملتی تو کئی لاکھ روپے بن جاتے۔"

"پھر تم نے تصویر کے حقوق کیوں نہیں بیچے۔" سمیرا نے سوال کیا۔

"وہ تصویر میرے لیے تصویر سے بڑھ کر ہے۔ وہ میرا ماضی ہے، میرا حال اور میرا مستقبل ہے۔ کوئی اپنا ماضی، حال اور مستقبل کیسے بیچ سکتا ہے۔"

"لیکن پیسوں کے لیے ہر چیز بکتی ہے۔" یاسمین نے گفتگو میں دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

"یاس، تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن ہر چیز کی قیمت روپے پیسے میں نہیں لگائی جا سکتی۔" رضوان نے جواب دیا۔

ابھی رضوان اور سمیرا کی سہیلیاں ریسٹ ہاوس کی لابی میں بیٹھے تھے کہ جنگل کی سیاحت کے لیے نکلنے والے طالب علم واپس آ پہنچے۔ وہ سب بری طرح تھکے ہوئے تھے۔ اس لیے آتے ہی لابی میں بچھے صوفوں پر ڈھیر ہو گئے۔

رضوان، سمیرا اور اس کی دوستوں نے ان طالب علموں پر مذاقیہ جملے کسے۔ لیکن ان میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ ان کا جواب دے سکتے چنانچہ صوفوں پر خاموش پڑے رہے۔ نہ ہوں کی نہ ہاں۔ بس آنکھیں بند کئے، کندھے لٹکائے، ٹانگیں پھیلائے صوفوں پر بیٹھے رہے۔

پہاڑی راستوں پر گھوڑوں کی سواری کے تھکا دینے والے تجربے کے بعد وہ اپنے جسموں اور دماغوں کو مکمل آرام دینا چاہتے تھے۔

ان کی طرف سے کوئی ردعمل نہ آنے کے بعد رضوان، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ نے بھی انہیں تنہا چھوڑ دیا اور دوبارہ اپنی گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

فصل 16

سمیرا اور اس کی سہیلیوں کے اصرار کے باوجود رضوان کچھ کھائے پیئے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا اور جلد سو گیا۔

رات ایک بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

اس نے جلدی سے غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ سویٹر پہنا اور وائلن اٹھا کر ریسٹ ہاوس سے باہر چلا گیا۔

ریسٹ ہاوس کے کمپاؤنڈ سے تھوڑی دور جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ وہ کمپاونڈ سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا سارے پہاڑ اور جنگل چاند کی دودھیا روشنی میں چمک رہے تھے۔

اتنا حسین منظر اس نے کبھی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ مبہوت حیران وہ جنگل کی طرف چلتا رہا۔ جب جنگل کے قریب پہنچا تو اسے ایک جگہ قدرے تھوڑی سی اونچی دکھائی دی۔

وہ مٹی کا ایک ٹیلا تھا جس کے پیچھے دور تک دیودار کے درخت ڈھلان کی شکل میں نیچے تک چلے گئے تھے۔

اس نے ٹیلے پر کھڑے ہو کر وائلن بائیں بازو اور کندھے پر رکھ کر دائیں ہاتھ میں باو پکڑی اور پھر بائیں ہاتھ کی انگلیاں وائلن پر درست کر کے باو کو آہستہ آہستہ حرکت دینی شروع کی۔ وائلن سے ہولے ہولے ڈیو شنل دُھنیں پانی کی لہروں کی طرح سارے میں پھیلنے لگیں۔

جیسے جیسے وائلن کی دھنوں کی آواز بلند ہوتی چلی گئی جنگل میں رات کے حشرات الارض کی آوازیں آنا بند ہو گیں اور سارے میں ایک سکوت پھیل گیا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے پوری کائنات نے اپنی سانس روک لی ہے اور ہر چیز پر ایک مکمل سکوت طاری ہے۔

رضوان بہت دیر تک آنکھیں موندھے مکمل انہماک کے ساتھ وائلن پر ڈیو شنل دھنیں بجاتا رہا۔

جب اسے وائلن بجاتے کوئی آدھا پہر گزرا اس نے دیکھا جنگل سے بندر بہت بڑی تعداد میں آکر اس کے سامنے بیٹھنا شروع ہو گئے ہیں۔ عام طور پر بندروں کے لیے آرام سے بیٹھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور کچھ نہ ہو تو بوریت سے بچنے کے لیے وہ گروپوں کی شکل میں بیٹھ کر ایک دوسرے کے بالوں سے جوئیں نکال کر کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن رضوان کے سامنے بندر اس طرح آرام سے بیٹھے تھے جیسے ہائی اسکول کے طالب علم استادوں کے سامنے بیٹھتے ہیں۔ وہ سب انتہائی خاموشی اور آرام کے ساتھ بیٹھے ہمہ تن گوش وائلن سن رہے تھے۔

بندروں کی بہت بڑی تعداد کے بعد رضوان نے دیکھا جنگل کے دوسرے جانور بھی وہاں آکر بندروں کے پیچھے دائرے میں کھڑے ہوتے چلے گئے۔ وہ سب اس طرح ہمہ تن گوش تھے کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں تھی۔ چیتے، نیل گائے، جنگلی خرگوش اور جنگلی مینڈھے اس طرح ساتھ کھڑے وائلن سن رہے تھے کہ ان میں شکاری اور شکار کی تمیز ختم ہو چکی تھی۔

جب باقی سارے جانور وائلن سن رہے تھے تو جنگلی پرندے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ بھی نیند سے بوجھل پلکیں لیے اپنے گھونسلوں سے اڑ کر رضوان کے ارد گرد آکر بیٹھ گئے اور وائلن سننے لگے۔ کووں کو کائیں کائیں، چڑیوں کو چہچہاہٹ، کبوتروں کو غٹر غوں، فاختاؤں کو کو کو بھول گئی۔ الو بھی اپنی بڑی بڑی دانشورانہ آنکھیں کھولے مجمعے میں آبراجمان ہوئے۔ اور عقاب تو باقاعدہ چونچیں پروں کے نیچے چھپا کر اس طرح وائلن سننے میں محو ہوئے جیسے اعلان کر رہے ہوں کے آج کی شب کسی کو ہم سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ آج ہم نہ کسی پر جھپٹیں گے نہ کسی کا خون گرائیں گے اور نہ کسی کو اپنا تر نوالہ بنائیں گے۔

رضوان نے پہلے بھی کئی بار راتوں کی تنہائی میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر وائلن بجائی تھی لیکن یہ سین اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ وائلن کی دُھنوں سے حشرات الارض خاموش ہو جائیں، پرندے اپنی بولیاں بند کر دیں، اور جنگلی جانور ہوس اور خوف سے آزاد ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح سَٹ کر بیٹھ جائیں کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ ہو کہ اس کے ساتھ کون بیٹھا ہے۔

یہ سین دیکھ کر رضوان پر خود بھی ایک بے خودی طاری ہو گئی۔ اسے لگا آسمان پر چاند نے بھی اپنی گردش روک دی ہے اور باقی سب کے ساتھ مل کر اپنی جگہ پر جامد و ساکت وائلن پر ڈیو شنل دھنیں سن رہا ہے۔ رفتہ رفتہ اسے لگا کہ وہ خود بھی وائلن کی دھنوں مین ڈھلتا جا رہا ہے۔ اس میں اور وائلن کی دھنوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں اور جنگل میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں اور پنڈال میں بیٹھے ہوئے پرندوں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں۔ وہ سب ایک ہیں۔

یہ ایک انوکھا اجتماع تھا ایک عجیب و غریب کنسرٹ تھا نہ قدیم دنیا نے کوئی ایسا سین دیکھا تھا نہ جدید دنیا میں اس کی کوئی مثال تھی کہ ایک انسان چاندنی رات میں سات آٹھ ہزار فٹ بلند پہاڑوں پر واقع ایک جنگل کے ایک کنارے میں ایک ٹیلے پر کھڑا وائلن بجا رہا ہے اور جنگل کے سب چرندے پرندے اس کے سامنے بیٹھے پورے انہماک کے ساتھ اس کی وائلن سن رہے ہیں۔

اس کیفیت میں اس نے دیکھا کہ اچانک زمین اور آسمان کے درمیان، چاند کے پہلو میں، ایک شبیہ نمایاں ہو رہی ہے۔ اس کی وائلن کی دھنیں بلند تر ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ وہ شبیہ ایک نورانی وجود میں متشکل ہو کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔

ایسے لگتا تھا کہ کائناتی حسن نے واقعتاً ایک نورانی وجود کی شکل اختیار کر لی ہے اور وہ وجود اب اس کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ نورانی پیکر پوری کائنات سے اس طرح متصل ہو رہا تھا کہ کچھ بھی اس سے جدا نہیں تھا۔

چاند کے عقب میں چمکتے ستارے، چاند کے سامنے پھیلا لا محدود جنگل، جنگل کے ایک کنارے میں ٹیلے پہ کھڑا رضوان، اور رضوان کے کندھے پر رکھی وائلن اور سامنے پنڈال میں بیٹھے چرند اور پرند سب اس نورانی وجود کا حصہ دکھائی دے رہے تھے۔ اس نورانی شبیہ کا چہرہ ایک انتہائی خوبصورت عورت کی طرح دلکش، جاذب اور جالب تھا۔

رضوان نے وائلن بجاتے بجاتے اس نورانی پیکر سے بغیر الفاظ ادا کئے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ دراصل اس

سوال نے ابھی رضوان کے ذہن مین جنم لیا تھا کہ اس کی ترسیل ہو گئی۔

نورانی پیکر نے اسی وسیلے سے جواب دیا وہ روح کائنات ہے۔ اس کے وائلن کی ڈیو شنل دھنوں کے جواب میں یہاں متشکل ہوئی ہے۔

رضوان نے پوچھا کیا یہ اس کا حقیقی وجود ہے۔ روح کائنات نے جواب دیا اس کائنات میں صرف وہی ایک حقیقت ہے۔ باقی سب صورتیں اسی ایک حقیقت کی مظہر ہیں جو زمان و مکان کے پردے پر نمایاں ہوتی اور پھر غائب ہو جاتی ہیں۔

رضوان نے پوچھا کہ زمان و مکان کے پردے پر نمایاں ہونے والی صورتیں کہاں غائب ہو جاتی ہیں۔ روح کائنات نے جواب دیا کہ رنگ اور بیرنگی دو کیفیتس ہیں۔ یہ صورتیں ہمہ وقت رنگ اور بیرنگی کے دائروں میں تیرتی رہتی ہیں۔ کبھی ایک رنگ میں زمان و مکان کے پردے پر عیاں ہوتی ہیں پھر بیرنگی کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہیں پھر کسی اور رنگ میں متشکل ہو کر زمان و مکان کے پردے پر کہیں اور جا کر نمایاں ہو جاتی ہیں۔ یہ بننے، مٹنے اور دوبارہ بننے کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ مٹی کبھی تباہ نہیں ہوتی بس اپنی صورتیں تبدیل کرتی رہتی ہے۔ ایک صورت سے دوسری اور دوسری سے تیسری صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

رضوان نے روح کائنات سے صوتی وسیلے کے بغیر پوچھا کہ خدا کیا ہے؟

خدا ایک خیال ہے۔ جسے انسان نے جنم دیا ہے۔ وہ ابھی تکمیل کے مراحل میں سے گزر رہا ہے۔

سچ کیا ہے۔ رضوان کے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔

سچ کی بھی اپنی کوئی شکل نہیں۔ سچ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ صورتوں کے ساتھ اس کی صورت بدلتی رہتی ہے۔ جب ایک صورت بدلتی ہے اس کا سچ اس کے ساتھ تبدیل ہو جاتا ہے۔

پھر انسان جھگڑتے کیوں ہیں؟

کیوں کہ ہر انسان سمجھتا ہے کہ اس کا سچ ہی اصل سچ ہے اور باقی سب سچ فریب پر مبنی ہیں۔ حالانکہ ہر سچ ایک فریب پر مبنی ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ فریب سچ پر غالب آ جاتا ہے اور پھر ایک نیا سچ جنم لیتا ہے جس کی بنیاد بھی پہلے سچ کی طرح فریب پر مبنی ہوتی ہے۔

کیا انسان کبھی سچ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے؟

ہاں جب وہ تمام صورتوں سے پاک ہو جاتا۔ تمام رنگوں سے نکل کر مکمل بے رنگی کی کفیت میں داخل ہوتا ہے اس پر اس کا سچ عیاں ہو جاتا ہے۔

پھر کیا ہوتا ہے؟

پھر اسے مکمل سکون مل جاتا ہے۔ وہ میرے وجود کا حصہ بن جاتا ہے۔ اپنی اصل میں شامل ہو جاتا ہے۔

جنت کیا ہے؟

ایک خواہش ہے۔

جہنم کیا ہے؟

ایک خوف ہے

جینا مرنا کیا ہے؟

ایک سراب ہے۔

قاتل اور مقتول کون ہیں؟

نہ کوئی قاتل ہے نہ مقتول۔ نہ کوئی مارنے والا نہ مرنے والا۔ نہ مارنے والا کسی کو مار سکتا ہے اور نہ مرنے والا حقیقت میں مرتا ہے۔ بس دو صورتوں نے دو سوانگ بھر رکھے ہیں۔ ایک مارنے کی ایکٹنگ کرتا ہے دوسرا مرنے کی۔

پھر یہ جو روز قتل ہوتے اور روز قتل کرتے ہیں یہ کیا تماشہ ہے؟

دو اناؤں کی تکرار، دو پرچھائیوں کی باہمی کشمکش اور دو صورتوں کا باہمی مجادلہ، ایک دوسرے کے فریب پر مبنی سچ کو جھٹلانے کی کوشش۔

رضوان وائلن بجارہا تھا اور روح کائنات اس پر خدا، انسان، جنت، دوزخ، جنگ، امن، اور موت وحیات کے اسرار رموز کھول رہی تھی۔

جنگل سے آئے سارے چرندے۔ پرندے، درندے وائلن کی دھنوں میں کھوے دل چسپی سے رضوان اور روح کائنات میں ہونے والا مکالمہ سن رہے تھے۔

گزشتہ شب سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ کا رضوان کے ساتھ جو مکالمہ ہوا تھا اس کے بعد ان چاروں نے اپنے اپنے دل میں فیصلہ کیا تھا کہ وہ رضوان کو حاصل کر کے رہے گی۔ اسے اپنا جیون ساتھی بنائے گی۔ اور باقی ماندہ زندگی اس کے ساتھ گزارے گی۔

رات کی پچھلے پہر سمیرا کی آنکھ کھلی تو اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جنگل کی طرف دیکھا۔

اس نے دیکھا رضوان ایک ٹیلے پر کھڑا وائلن بجارہا تھا۔ وہ اسی طرح شب خوابی کے لباس میں بغیر پیروں میں چپل پہنے جنگل کی طرف بھاگی۔ لیکن وہاں اس نے جو سین دیکھا اس سے خوف زدہ ہو کر اس نے چیخنا چاہا لیکن پھر وائلن کی دھنوں کی گرفت میں آکر وہ بھی سب جانوروں کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی۔

سمیرا کی نظریں رضوان پر تھیں تو عذرا، یاسمیں اور شائستہ نے رضوان کے علاوہ اس پر بھی نظریں لگا رکھی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ رضوان کے ساتھ اس نے جو نیکی کی تھی اس کی وجہ سے رضوان کا جھکاؤ اس کی طرف زیادہ ہے۔

چنانچہ وہ تینوں بھی جلدی سے اٹھ کر سمیرا کے پیچھے جنگل کی طرف روانہ ہوئیں۔ انہوں نے ٹیلے پر کھڑے رضوان کو ہزاروں جنگلی جانوروں میں گھرے وائلن بجاتے دیکھا تو وہ بھی سمیرا کی طرح پہلے خوف زدہ ہوئیں لیکن پھر وائلن کی دھنوں کے سحر میں کھو کر جانوروں کے مجمع کا حصہ بن گئیں۔

پنڈال میں بیٹھے دیگر چرندوں، پرندوں اور درندوں کی طرح سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ بھی بھول گئیں کہ وہ کون ہیں۔ ان کی شناخت کیا ہے۔ ان کے نام کیا ہیں۔ بس وائلن کی دُھنیں تھیں اور رضوان کا روح کائنات کے ساتھ مکالمہ۔

رضوان روح کائنات سے بغیر کسی صوتی وسیلے کے پوچھ رہا تھا کہ وہ کون ہے اس کے ماں باپ کون ہیں اس کے عزیز واقارب کون ہیں؟

روح کائنات اسے بتا رہی تھی کہ نہ کوئی کسی کا باپ ہے نہ بیٹا۔ نہ کوئی کسی کی ماں ہے نہ بیٹی۔ سب مٹی کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ ہر چیز کا ایک دائرہ ہے وہ اس میں گردش کرتی رہتی ہے۔ اس گردش کے دوران واقع ہونے والی اضافتوں سے رشتے بنتے ہیں لیکن آخر کار وہ اضافتیں تبدیل ہو جاتی ہیں اور وہ رشتے بھی بدل جاتے ہیں۔ مٹی کے بیٹے بیٹیاں آخر کار مٹی میں گم ہو جاتے ہیں۔

رضوان کی وائلن کی ڈیوشنل دھنیں ابھی جاری تھیں۔ لیکن ان کی بلند آہنگی میں کمی آنے لگی تھی۔ چاند دھیرے دھیرے آسمان کے مغربی کنارے پر ڈھلنے لگا تھا۔ ستاروں کی چشمک ماند پڑنے لگی تھی۔

اس سے پہلے کہ آسمان کے مشرقی کنارے پر دن کے بادشاہ آفتاب جہاں تاب کی سواری نمودار ہوتی سب سے پہلے روح کائنات کا نورانی وجود جس طرح متشکل ہوا تھا اسی طرح پہلے شبیہ میں ڈھلا پھر آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو گیا۔

عقابوں نے پروں کی نیچے سے اپنی چونچیں نکال کر دوبارہ درست کیں۔ پرندوں نے اڑان بھری اور درختوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ باقی سب چرندے درندے بھی اُٹھ کر جنگل میں روپوش ہو گئے۔

سمیرا، عذرا، یاسمین اور سائستہ بھی اٹھ کر ٹیلے پر کھڑے رضوان کے سامنے جا کر خاموش کھڑی ہو گئیں۔

اس دن ایک نئے رضوان، نئی سمیرا، نئی عذرا، نئی یاسمین اور نئی شائستہ نے جنم لیا تھا۔

وہ پانچوں ایک ٹولی کی شکل میں چلتے ریسٹ ہاوس میں پہنچے۔ ان کے ساتھی کئی لڑکے اور لڑکیاں ناشتے کے لیے پہلے سے لابی کے پاس واقع ڈائننگ ایریا میں آئے بیٹھے تھے لیکن ان پانچوں میں سے کسی نے کسی کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ اور وہ بغیر ناشتے کے لیے رکے سیدھے اپنے کمروں میں جا کر لیٹے اور سو گئے۔

فصل 17

ہفتہ بھر کی گردشِ علمی کے بعد کے ای کے طالب علم نتھیا گلی کے خوشگوار ماحول سے لاہور واپس پہنچے تو گرمیاں ابھی شباب پر تھیں۔

سمیرا اور اس کی سہیلیاں اسلام آباد میں رک گئیں۔ انہوں نے بہت کوشش کی رضوان ان کے ساتھ رکے لیکن وہ باقی طالب علموں کے ساتھ واپس لاہور چلا آیا۔

اسے لاہور میں کوئی خاص کام نہیں تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ سمیرا اور اس کی سہیلیاں جس تجربے سے گذری ہیں وہ اسے اچھی طرح اپنی روح کی گہرائیوں میں جذب کر لیں۔

اس کا خیال تھا اگر وہ ان کے ساتھ اسلام آباد رکا تو وہ اس کے حلقہ اثر میں گرفتار رہیں گی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کے حلقہ اثر میں اس طرح گرفتار رہیں کہ ان کی انفرادیت ختم ہو جائے۔

فطرت سے ماوراتجربات کو منطقی پیرائے میں ہضم کرنا ہر ذہن کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ خاص طور پر جن ذہنی فریموں میں نئی پاکستانی نسل گرفتار ہو چکی ہے اس میں مکمل بغاوت یا مکمل اطاعت کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ وہ بھونڈے پن کی حد تک اپنی اصل سے بغاوت پر آمادہ اور پرائے ثقافتی تصورات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اپنے اندر زندگی سے بڑی تخلیقی تصویر بننے کی صلاحیت پیدا کرنے کی بجائے گھٹیا حد تک خود کو دوسری ثقافتوں کے عکس بنا رہے ہیں۔ آزاد قوموں کے نوجوانوں میں ایک عجیب شان بے نیازی اور عجیب حسن ہوتا ہے۔ وہ پرائی ثقافتی تصویروں کی کاپی کرنے کی بجائے زندگی کے اسٹیج پر خود اتنی بڑی تصویر بنتے ہیں کہ باقی ساری دنیا ان کی کاپی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

رضوان نہیں چاہتا تھا کہ سمیرا اور اس کی سہیلیاں اس کی تابعِ مُہمل بن کر رہ جائیں۔ اس لیے جب

انہوں نے اسے اسلام آباد میں رکنے کے لیے کہا تو اس نے محبت بھرے انداز میں انہیں کہا کہ وہ لاہور میں ان کا انتظار کرے گا۔

سمیرا نے کہا وہ چاہتی کہ وہ اس کے والدین سے ملے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کے والد کرنل اکرام اور اس کے دونوں بھائی خاص طور پر اس سے ملاقات کے متمنی ہیں۔

اس نے سمیرا کی خواہش کے احترام میں صرف اتنا کہا کہ وہ بھی اپنے محسنوں سے ملنا چاہتا ہے لیکن فی الحال اس کا وقت نہیں آیا۔ وقت آنے پر وہ ان سے ضرور ملے گا۔

اگرچہ کالج گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے بند تھا لیکن اب بھی کئی طالب علم ہاسٹل میں قیام پذیر تھے۔ رضوان بھی جمال پور جانا چاہتا تھا لیکن اس نے وہیں ہاسٹل میں رُکنے کو ترجیح دی۔

وہ چاہتا تھا کہ چھٹیوں میں اپنے تمام مضامین کے بنیادی تصورات کی اس طرح تفہیم کرے کہ ان کا اسٹرکچر اس پر مکمل طور پر عیاں ہو جائے۔ چنانچہ نتھیا گلی سے لوٹنے کے بعد اس نے خود کو اپنے ہاسٹل کے کمرے میں تقریباً بند کر لیا اور اپنے ذہن میں مختلف مضامین کے بنیادی تصورات کی تصویریں بنا کر ان سے پھوٹنے والی شاخوں اور پھر شاخوں پر نمودار ہونے والی مزید شاخوں کے رنگ، صفات، افعال، اور ساختیاتی خلیات کے بارے میں گہرے غور و فکر میں ڈوب گیا۔ وہ جتنا زیادہ ان تصورات کی گہرائی میں جاتا اس کا زندگی کی پر اسراریت کو جاننے اور سمجھنے کے بارے میں اشتیاق مزید گہرا ہوتا چلا گیا۔ وہ مادے کی غیر نامیاتی سطح سے نامیاتی سطح پر پہنچنے کے بارے میں پہلے بھی خاصی تحقیق کر چکا تھا اور اپنی تحقیق کے بارے میں پیپر بھی لکھ چکا تھا لیکن اب اس کی زیادہ تر توجہ آر این اے اور ڈی این اے پر مرکوز تھی۔

ڈی این اے میں بھی اس کے لیے حیرت ناک چیز اس کی اپنا عکس پیدا کرنے کی صلاحیت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنا زیادہ وقت ڈی این اے کی تحقیق پر صرف کرے گا اور اس دوران اپنی سماجی مصروفیات کو بالکل ترک رکھے گا۔

لیکن سمیرا اور اس کی سہیلیاں چند دن اسلام آباد میں رک کر لاہور واپس آچکی تھیں۔ سمیرا کی تو خیر فیملی اسلام آباد میں تھی اس لیے وہ اسلام آباد کے لائف اسٹائل کی عادی تھی لیکن اس کی سہیلیاں اس دفتری لائف اسٹائل سے بہت جلد بور ہو گئیں۔

چند دن وہاں رکنے کے بعد انہوں نے سمیرا سے کہا کہ انہیں کلرکوں اور بابوؤں کا یہ شہر پسند نہیں اور وہ لاہور واپس جانا چاہتی ہیں۔

ان کی وجہ سے کرنل اکرام نے سمیرا کو بھی اجازت دے دی کہ اگر وہ گرمیوں کی چھٹیاں لاہور میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گزارنا چاہے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں۔

سمیرا اور اس کی سہیلیاں واپس آئیں تو رضوان کا آر این اے، ڈی این اے اور نامیاتی اور غیر نامیاتی مادہ سب کچھ ماورالطبعیات میں گم ہو گیا۔

نتھیا گلی جانے سے پہلے رضوان اور سمیرا اور اس کی سہیلیوں میں جو اجنبیت اور غیریت تھی وہ واپسی کے بعد اپنائیت میں بدل گئی۔ چھٹیوں کی وجہ سے ہاسٹل اور کالج میں طلبا کی تعداد خاصی کم تھی لیکن جتنے طلبا بھی موجود تھے سب کو خبر ہو چکی تھی کہ رضوان، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ میں دوستی ہو چکی ہے۔ اور دوستی بھی کوئی ایسی ویسی نہیں بلکہ سمیرا اور اس کی سب سہیلیاں رضوان پر کسی بھی وقت جان نچھاور کرنے کے لیے تیار تھیں۔

کالج کے ہاسٹل میں ان کے کمرے الگ الگ تھے۔ لیکن وہ پانچوں اپنا وقت زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے۔ ایک ساتھ کیفیٹیریا جاتے۔ ایک ساتھ بازار جاتے۔ ایک ساتھ شام کے وقت ڈنر کے لیے ریستوران جاتے اور پھر ایک ساتھ رات گئے واپس لوٹتے۔ ان کو اس طرح ایک ساتھ چلتے پھرتے دیکھ کر کئی ساتھی طالب علموں کے پیٹ میں حسد کی وجہ سے مروڑ اٹھنے لگے لیکن کسی کو ہمت نہ پڑی کہ وہ رضوان یا سمیرا یا ان کی باقی دوستوں میں سے کسی کو کچھ کہتا۔

کالج کی چھٹیاں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں کہ ایک دن سمیرا نے رضوان اور اپنی سہیلیوں سے کہا کہ بہتر یہ ہوگا کہ وہ ہاسٹل چھوڑ کر کوئی گھر کرائے پر لے لیں اور وہاں رہنا شروع کر دیں۔

یاسمین نے کہا اگر رہنے کے لیے گھر چاہیے تو کرائے پر لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ ڈیفنس میں ان کا ایک گھر موجود ہے جو کہ اتفاق سے آج کل خالی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے پاپا سے کہہ دے گی کہ وہ اپنی دوستوں کے ساتھ ہاسٹل سے وہاں منتقل ہو گئی ہے۔

یاسمین کی گھر کے بارے میں خبر سب کے لیے انتہائی خوش آئند تھی۔ رضوان، سمیرا، عذرا اور شائستہ سب خوش تھے کہ بجائے کالج ہاسٹل میں رہنے کے سب ایک چھت تلے ایک گھر میں آزادی کے ساتھ اکٹھے رہیں گے۔

یاسمین نے اپنے پاپا کو اسی روز نیویارک کال کر کے باقاعدہ ان سے ہاسٹل سے اپنی سہیلیوں کے ساتھ اپنے گھر میں منتقل ہونے کی اجازت لے لی۔

چند دنوں میں وہ پانچوں ہاسٹل چھوڑ کر ڈیفنس میں یاسمین کے گھر منتقل ہو گئے۔ رضوان چند دن پہلے سوچ رہا تھا کہ اسے ان چاروں لڑکیوں سے کسی نہ کسی طرح دور رہنا ہے۔ لیکن اب یک نہ شد، دو نہ شد، سہ نہ شد چہار شد والا معاملہ تھا۔ وہ چاروں کے ساتھ ایک چھت تلے ایک ہی گھر میں رہ رہا تھا۔ اور رہ بھی ایسے جیسے پانچ لڑکے یا پانچ لڑکیاں اکٹھی رہ رہی ہوں۔ ان پانچوں میں کسی قسم کا کوئی پردہ، کوئی دوئی، یا کسی قسم کا کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ سب ایک جان اور پانچ قالب تھے۔ ان پانچوں نے بغیر کچھ کہے، بغیر کچھ سنے، اور بغیر کچھ سوچے ایک قسم کا سمجھوتہ کر لیا تھا کہ جو بھی ہو انہوں نے باقی زندگی ایک دوسرے کی معیت میں گزارنی ہے۔

اس میں سب سے مزے دار بات یہ تھی کہ سمیرا اور اس کی سہیلیوں نے خاموشی سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جو بھی ہو رضوان کی رائے ان سب کی رائے پر مقدّم ہو گی۔ کسی بھی چیز کے بارے میں جو بھی اس کا فیصلہ ہو گا اسی پر عمل کیا جائے گا۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد کالج کھلنے تک ان پانچوں میں ایک ایسا ربط قائم ہو چکا تھا کہ دیکھنے والے کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک ہی کنبے کے پانچ افراد ہیں۔

چنانچہ کالج کھلنے کے بعد جب وہ پانچوں واپس آئے تو جیسے کالج میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اس سے پہلے کالج میں لڑکوں اور لڑکیوں میں محبت کی کئی داستانوں نے جنم لیا تھا جو بعد میں شادیوں اور بچوں پر جا کر منتج ہوئی تھیں لیکن یہ ایک عجیب محبت کی داستان تھی جس میں چار لڑکیاں ایک لڑکے کو دل دے بیٹھی تھیں اور اب روز و شب اسی کے ساتھ رہتی تھیں۔

اور پھر محبت کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ عورت جان دے دیتی ہے لیکن محبت میں کسی کو شریک نہیں کرتی لیکن یہاں بیک وقت چاروں ایک ساتھ ایک ہی لڑکے سے محبت بھی کر رہی تھیں اور اسی کے ساتھ زندگی بھی گزار رہی تھیں اور وہ بھی بغیر کسی شرعی ازدواجی رشتے کے۔

لیکن یہ سب باتیں صرف دکھائی دیتی تھیں۔ حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ ان پانچوں میں محبت کا تعلق ضرور تھا لیکن معصوم بچوں جیسی محبت۔ جس میں کوئی ملاوٹ نہیں تھی۔ کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ ان پانچوں میں نہ کسی کی نگاہوں میں گناہ کی چمک تھی نہ کسی کے دل میں گناہ کا شائبہ۔

بس وہ ایک ساتھ زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ ایک دوسرے کے آس پاس۔ ایک دوسرے کے ساتھ۔ ایک دوسرے کی معیت میں۔ اور ایک دوسرے کے پہلو میں۔

وہ ایک کنبہ تھا جس نے نتھیا گلی کی پہاڑیوں میں ایک ایسی دودھیا چاندنی میں جنم لیا تھا جب روح کائنات زندگی کی تمام یکجا صورتوں کے ساتھ رضوان کے وائلن کے انوکھے کنسرٹ کے موقع پر رونما ہوئی تھی۔ روح کائنات نے رضوان کے وائلن کی دھنوں کے ذریعے پرندوں، چرندوں، درندوں کو یہ پیغام دیا تھا کہ ان سب کی اصل مٹی ہیں۔ وہ مٹی سے پیدا ہوتے ہیں اور مٹی میں دفن ہو جاتے ہیں۔ باقی سب امتیازات بے معنی ہیں۔

زندگی ایک ہے۔ چیونٹی سے لیکر ہاتھی تک۔ چڑیا سے لے کر باز تک۔ جو مٹی سے جڑا رہتا ہے مطمئن رہتا ہے۔ جو مٹی سے ناطہ توڑتا ہے ذلیل وخوار ہو جاتا ہے۔ مٹی کی کشش سب سے طاقت ور کشش ہے۔ اور مٹی کی خوشبو سب سے خوشتر خوشبو ہے۔ اور یہ ایسی خوشبو ہے جس سے مٹی سے پیدا ہونے والی کوئی چیز کبھی نجات نہیں پا سکتی۔

نتھیا گلی کی چڑیوں، کبوتروں، فاختاؤں، اُلوؤں، عقابوں، بندروں، خرگوشوں، چیتوں، رضوان، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ نے تو یہ پیغام سنا تھا، سمجھا تھا، دل کی گہرائیوں سے اسے قبول کیا تھا لیکن نہ یہ پیغام کے ای کالج کے طالب علموں تک پہنچا تھا۔ نہ کرنل اکرام نے یہ پیغام سنا تھا۔ نہ سرحد کے چیف سکریڑی تک اس پیغام کی صدا پہنچی تھی۔ نہ ساہیوال کے چوہدری صاحب کو کسی نے بتایا تھا کہ نتھیا گلی کی پہاڑیوں میں ایک دودھیا چاندنی رات میں کیا ڈرامہ ہوا ہے۔

چنانچہ رضوان اور چاروں نوجوان لڑکیوں کے عجیب وغریب تعلق اور رشتے کی کہانی کے ای کالج کے درو دیوار سے ٹکرائی تو سب سے پہلے رجسٹرار صاحب نے ان پانچوں کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔ وہ پانچوں رجسٹرار کے دفتر میں پہنچے تو رجسٹرار نے انہیں کہا کہ ان کے باہمی تعلق کی کہانی وائس چانسلر نے سنی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ میں اس کی انکوائری کروں اور انہیں رپورٹ پیش کروں۔ بجائے اس کے کہ میں ادھر ادھر سے انفارمیشن لیتا میں نے مناسب جانا کہ براہ راست تم لوگوں سے بات کروں۔

سمیرا نے رجسٹرار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: " کہ کالج میں ہمارے حوالے سے جو گفتگو ہو رہی ہے وہ ٹھیک ہے۔ ہم پانچوں دن رات ایک ساتھ رہتے ہیں۔ اس لیے ایک ساتھ رہتے ہیں کہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے۔"

"لیکن تمیں پتہ ہے کہ یہ لائف اسٹائل ہمارے کالج کے ڈسپلن پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ لوگ الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں۔ کل کلاں شہر میں اس بات کا چرچا ہوا تو قیامت آجائے گی۔ پہلے بھی یہاں لڑکوں اور

لڑکیوں میں محبت ہوئی۔ انہوں نے شادیاں بھی کیں لیکن چار چار لڑکیاں ایک لڑکے کے ساتھ اس طرح کبھی نہیں رہیں۔" رجسٹرار نے سمیرا کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"رجسٹرار صاحب، آپ نہیں جانتے رضوان سے کے ای کی کتنی لڑکیاں محبت کرتی ہیں۔ ابھی تو ہم چار اس کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ جس کل کلاں کی آپ بات کرتے ہیں۔ اس کل کلاں میں سارے کی ای کی ساری لڑکیاں اس کے ساتھ رہنا شروع ہو جائیں گی تو آپ اور آپ کے وائس چانسلر صاحب کیا کریں گے؟"

"دیکھو سمیرا، میڈیکل میں داخلہ کتنی مشکل سے ملتا ہے۔ یہ ایک پروفیشنل انسٹی ٹیوشن ہے۔ یہاں پروفیشنل ایجوکیشن دی جاتی ہے۔ اس پروفیشن کی کچھ اخلاقیات ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم تمہیں میڈیکل کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس اخلاقیات میں بھی ٹرینڈ کریں۔"

"دیکھیں رجسٹرار صاحب۔ ہم پانچوں دوست ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہیں۔ لیکن کلاس کے وقت اپنی الگ الگ کلاسوں میں بیٹھتے ہیں۔ باقی وقت میں ہم کیا کرتے ہیں۔ کہاں جاتے ہیں۔ کہاں رہتے ہیں۔ کیسے رہتے ہیں اس سے آپ کا یا کسی اور کا کیا مطلب؟"

"ٹھیک ہے میں نے جو سننا تھا سن لیا۔ جو کہنا تھا کہہ دیا۔ تم میں سے کسی اور کو کچھ کہنا ہے؟" رجسٹرار نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ لیکن رضوان اور سمیرا اور باقی سب خاموش رہے۔ رجسٹرار کے ساتھ اتنے سخت مکالمے کے باوجود ان سب کے چہروں پر ایک پاکیزہ سکون برقرار رہا۔

کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ مٹی کے ساتھ جڑے ہیں۔ مٹی میں صلاحیت ہے کہ وہ ہر طرح کا بوجھ برداشت کر لیتی ہے۔ اور اگر ضرورت محسوس کرے تو بوجھ کو اپنے سینے میں دفن کر لیتی ہے۔ وہ رجسٹرار کے دفتر سے نکلے اور سب کچھ بھلا کر خوش گپیاں کرتے اکٹھے مال روڈ کی طرف چہل قدمی کرنے چلے گئے۔

فصل 18

رجسٹرار نے سمیرا کے ساتھ مکالمے کے بعد اپنی رپورٹ وائس چانسلر کو پیش کر دی۔ رپورٹ میں رجسٹرار نے لکھا کہ سمیرا نے اپنی زبان سے اقرار کیا ہے کہ وہ یاسمین کے ڈیفنس میں واقع گھر میں ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ اس نے مزید لکھا کہ رضوان، عذرا، یاسمین اور شائستہ نے بھی سمیرا کی تائید کی ہے۔ کالج کے دیگر طلبا کی طرف سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق وہ اپنی کلاسوں کے علاوہ ہر جگہ اکٹھے دیکھے جاتے ہیں۔ لائبریری میں اکٹھے بیٹھتے ہیں۔ کیفیٹیریا میں اکٹھے چائے پیتے اور رات ڈنر بھی ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور گزشتہ کئی ہفتوں سے رہ بھی ایک ساتھ رہے ہیں۔

رجسٹرار نے اپنی سفارش میں لکھا کہ چاروں طالبات انتہائی بااثر خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر ان کے خلاف کاروائی کی گئی تو کالج انتظامیہ کو مختلف سرکاری حلقوں کی طرف سے بے پناہ دباؤ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تاہم رضوان کا ایک معمولی خاندان سے تعلق ہے۔ اس کا باپ ایک چھوٹے سے گاؤں جمال پور کا کمہار ہے جس کے کل ملکیت پانچ عدد گدھے ہیں۔

وہ مٹی ڈھونے کا کام کرتا ہے۔ اگر مٹی نہ ڈھوئے تو اپنے گھر میں چاک پر مٹی کے برتن بناتا ہے۔ جنہیں آگ میں پکا کر منڈی میں بیچتا ہے۔ اگر اسے کالج سے فارغ کر دیا جائے تو نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ لیکن غریب خاندان سے تعلق ہونے کے باوجود وہ فطری طور پر بہت ذہین وفطین نوجوان ہے۔ وائلن کا ماسٹر پلیئر ہے۔ میٹرک اور ایف ایس سی میں بورڈ میں ٹاپ پوزیشن حاصل کر کے کے ای کی درخواست پر یہاں پڑھ رہا ہے۔ کئی غیر ملکی میڈیکل اسکولوں سے اس کو داخلے کی پیشکش ہو چکی ہے۔ اس بات کا مکمل امکان ہے کہ ڈاکٹر بنا تو لاجواب ڈاکٹر ہو گا۔ ریسرچ میں گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ اگر ریسرچ جاری رکھے گا تو یقینا بائیو کیمسٹری میں کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام دے گا۔

وائس چانسلر نے رضوان، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ کے بارے میں رجسٹرار کی رپورٹ پڑھی تو سر پکڑ لیا۔ کس کے خلاف کاروائی کرے اور کس کے خلاف نہ کرے۔

پھر وائس چانسلر کو میڈیئے کا خوف بھی تھا۔ میٹرک اور ایف ایس سی میں نمایاں کامیابی اور پھر محیر العقول کنسرٹوں کے بعد وہ تقریباً ایک سلیبرٹی بن چکا تھا۔

اور اس کی گدھے کے ساتھ کھینچی تصویر جسے کئی بین الاقوامی کمپنیاں اپنے اشتہاروں میں استعمال کرنے کے لیے خریدنے کے لیے آمادہ تھیں۔

وائس چانسلر جہاں دیدہ آدمی تھا۔ رپورٹ کو دفتر داخل کرنے کا حکم دے کر خاموش ہو گیا۔ لیکن دنیا کی آنکھیں اور زبان کون بند کر سکتا تھا۔ کالج میں اسلام پسند طالب علموں نے اسے بہت بڑا ایشو بنا دیا۔ اسلام پسندوں کی اپیل پر لاہور کے تمام کالجوں سے جمعیت کے طلبا بڑے بڑے بینر اٹھا کر کے ای کالج پہنچ گئے اور کالج انتظامیہ سے مطالبہ کیا کہ احکام اسلامی کی کھلے بندوں خلاف ورزی پر رضوان، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ کو کالج سے نکالا جائے۔

چند گھنٹے نعرہ بازی کرنے کے بعد انہوں نے رجسٹرار کو ایک یاداشت پیش کی جس میں بینروں والے مطالبات دہرائے گئے تھے۔

جب اسلام پسند کے ای کے باہر نعرہ زنی کر رہے تھے۔ چند اسلام پسند اخباروں کے رپورٹروں نے ان کی تصویریں کھینچ کر نمک مرچ لگا کر انہیں اپنے اخباروں میں شائع کیا۔

چند دنوں میں رضوان، سمیرا اور اس کی سہیلیاں ٹالک آف دی ٹاؤن بن چکے تھے۔ اسلام آباد میں کرنل اکرام، پشاور میں چیف سکریڑی سرحد خٹک صاحب، ساہیوال میں چوہدری فقیر حسین صاحب اور نیویارک میں سلمان احمد نے اخباروں میں اپنی سپوتنیوں کی خبریں پڑھیں تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

سب نے اپنی اپنی بیٹی کو کال کر کے صورت حال کی تفصیل پوچھی۔ لڑکیوں نے جو سچ تھا اپنے والدین کو بتا دیا۔ سوائے عذرا کے والد چوہدری فقیر حسین کے کسی اور نے شدید رد عمل کا مظاہرہ نہ کیا۔ بلکہ کرنل

اکرام نے سمیرا سے کہا اگر اسے خطرے کی کوئی بو آئے تو فوراً اطلاع دے تو وہ ان کی مدد کے لیے رینجرز بھیج دیں گے۔ سمیرا نے اپنے والد کو عذرا کے والد چوہدری فقیر حسین کا ساہیوال میں فون نمبر دیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان سے بات کر کے انہیں ٹھنڈا کریں۔ سمیرا کے کہنے پر کرنل اکرام نے چوہدری فقیر حسین کو کال کی تو چوہدری صاحب اخباری خبروں سے ابھی تک تپے بیٹھے تھے۔ انہوں نے سمیرا کا نام سنتے ہی کرنل صاحب پر چڑھائی کر دی۔ کرنل نے بغیر کسی رد عمل کے انہیں سمجھایا کہ ینگ بچے ہیں۔ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ایک ساتھ رہتے ہیں۔ کیا حرج ہے۔ کل ان کی تعلیم مکمل ہو گی تو سب اپنے اپنے کاموں میں لگ جائیں گے۔ کسی کو یاد نہیں رہے گا کہ کون کون تھا۔ "لیکن ان اخباروں کا کیا کریں؟" چوہدری صاحب نے اپنے آپ کو تھوڑا سنبھالتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں جہاں تک بچوں کی حفاظت کا تعلق ہے وہ تو میں نے رینجرز کے انچارج کرنل کو لاہور میں کہہ دیا ہے۔ اگر ضرورت پڑی وہ پوری پلٹن لے کر ان کے گھر پہنچ جائے گا۔ باقی رہے اخبار تو ان کا کچھ سوچنا پڑے گا۔"

ادھر کرنل اکرام اور چوہدری فقیر حسین آپس میں یہ گفتگو کر رہے تھے دوسری طرف پاکستان بھر کی ترقی پسند تنظیموں نے اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے اپنی میٹنگ طلب کر لی تھی۔

رضوان، سمیرا، اور اس کی سہیلیاں نظریاتی طور پر ترقی پسند نہیں تھے۔ لیکن ان کا لائف اسٹائل رجعت پسند طبقوں کے لیے ایک چیلنج تھا۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ہر جگہ پر اسلام پسندوں کی بھرپور مخالفت کریں گے۔

متفقہ لائحہ عمل طے کر کے اگلے دن ترقی پسند رضوان اور سمیرا کی حمائت میں بینر اٹھا کر کے ای کالج پہنچ گئے۔ انہوں نے بھی چند گھنٹوں تک رضوان اور سمیرا کی حمائت میں نعرے لگائے۔ کے ای کی انتظامیہ کو وارننگ دی کہ اگر انہوں نے رضوان اور اس کی دوستوں کے خلاف کوئی کاروائی کی تو وہ پورے ملک میں بھرپور احتجاج کریں گے۔

ترقی پسند اخباروں نے رضوان اور اس کی دوستوں کی تصویریں شائع کیں اور ان کی حمائت میں مضامین لکھے تو لڑکیوں کے والدین کو کچھ تسلی ہوئی۔

وائس چانسلر نے رجسٹرار کی رپورٹ دفتر داخل کروا دی تھی لیکن اسلام پسندوں کی ہنگامہ آرائی سے انہیں خاصی تشویش تھی لیکن کرنل اکرام کی کال کے بعد اور ترقی پسند طالب علموں کے ایکشن کے بعد انہیں کچھ تسلی ہو گئی تھی۔

چنانچہ انہوں نے رضوان، سمیرا، اور اس کی سہیلیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا لیکن انہوں نے پانچوں کو بلا کر الرٹ کر دیا کہ وہ اپنا خیال رکھیں اور اپنے ارد گرد کے ماحول سے باخبر رہیں کیونکہ اسلام پسندوں میں کئی عناصر خاصے انتہا پسند ہیں اور ان سے کسی بھی وقت کسی بھی ناشائستہ رد عمل کی توقع کی جا سکتی ہے۔

رضوان اور سمیرا اور ان کی دوستوں نے وائس چانسلر کا شکریہ ادا کیا اور کالج میں اپنی روزمرہ کی مصروفیات میں مشغول ہو گئے۔ لیکن اسلام پسند بھی کہاں آرام سے بیٹھنے والے تھے۔ انہوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ ان پانچوں کو آرام سے نہیں رہنے دینا۔ ڈیفنس کی مسجد ان کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اسلام پسندوں نے امام مسجد سے جا کر شکایت کی کہ کے ای کالج کا طالب علم رضوان اپنی ہم جماعت چار نوجوان لڑکیوں کے ساتھ بغیر شادی کے رہ رہا ہے۔

مولانا نے نماز کے بعد نمازیوں کے ساتھ رضوان اور اس کی دوستوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ دینی کتابوں میں قیامت کی جو نشانیاں بیان کی گئی ہیں ان میں سر فہرست یہ ہے کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بغیر شادی کے ایک ساتھ ایک ہی گھر میں ایک چھت تلے ایک ساتھ زندگی گزاریں گے اور کوئی انہیں روکنے، ٹوکنے اور پوچھنے والا نہیں ہو گا۔

کیا قیامت آنے والی ہے کہ مسجد سے چند قدم دور سلمان احمد کے گھر میں سلمان احمد کی بیٹی اپنی چند سہیلیوں اور ایک دوست کے ساتھ مل کر ایک ہی گھر میں رہ رہے ہیں۔ لڑکا اور لڑکیاں پانچوں جوان ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ دن رات مسجد کے زیر سایہ سلمان احمد کے گھر میں کیا کیا گناہ کئے جا رہے ہیں۔

نمازیوں نے تحمل سے مولانا کی بات سنی اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ کسی کی ذاتی زندگی میں مداخلت نہ کریں تو بہتر ہوگا۔ کوئی کیا کرتا ہے کیسے زندگی گزارتا ہے یہ اس کا اور اس کے خدا کا معاملہ ہے ہمیں اس میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔

جن نمازیوں نے مولانا سے درخواست کی تھی کہ وہ اس پھڈے میں ٹانگ نہ اڑائیں مولانا نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کل قیامت کے دن اللہ جب آپ لوگوں سے پوچھے گا کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے شعائر اسلام کی تذلیل ہو رہی تھی اور تم نے اسے روکنے کے لیے کیا کیا تھا تو تم اسے کیا جواب دوگے؟۔

ان نمازیوں میں سے ایک نے کہا۔ مولانا اللہ تو قیامت کے دن سوال کرے گا لیکن آپ قیامت سے پہلے جو قیامت برپا کرنا چاہتے ہیں آپ کو اس کے نتائج کا اندازہ نہیں۔

مولانا ادھار کھائے بیٹھے تھے کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کے جذبات کو بھڑکا کر علاقے میں بلوہ کروایا جائے۔ انہیں جماعت اسلامی کے ہیڈ کوارٹر منصورے سے یہی ہدایت تھی۔ اگر ایک بار اس علاقے میں جہاں رضوان اور چاروں لڑکیاں بغیر نکاح ایک ساتھ رہ رہے تھے بلوہ ہو جاتا ہے تو باقی پاکستان میں آگ لگانے کا فریضہ جماعت کے دیگر تنظیمی مراکز خود کر لیں گے۔

چنانچہ مولانا نے ان نمازیوں کو سرزنش کرتے ہوے کہا کہ وہ انہیں دینی فریضہ سرانجام دینے سے نہ روکیں۔ وہ اپنی مسجد کے ارد گرد کے علاقے میں کوئی ایسا کام کسی صورت بھی جاری نہیں رہنے دیں گے جس سے اسلام کے کھلے احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ انہوں نے کہا کہ وہ آئندہ جمعہ کا خطبہ اس مسئلہ پر دیں گے اور پھر باقی معاملہ جمعہ کے اجتماع پر چھوڑ دیں گے کہ وہ کیسے اس معاملے کو دیکھتے ہیں۔

اتفاق سے معترض نمازیوں میں سے ایک کرنل اکرام اور سمیرا کو جانتا تھا۔ معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس نے فوراً کرنل اکرام کو اطلاع دی کہ مقامی مسجد کے مولانا کیا کرنے جا رہے ہیں۔

اگر کرنل اکرام کی بیٹی سمیرا اس معاملے میں شامل نہ ہوتی تو وہ مولانا کے عزائم میں حائل نہ ہوتے اور انہیں علاقے میں شوق سے آگ بھڑکانے دیتے لیکن وہ یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ مسئلہ ان کی بیٹی کا ہو اور وہ مولانا کو شر انگیزی کے لیے تنہا چھوڑ دیں۔ انہوں نے فوراً لاہور کے رینجرز کے انچارج کرنل کو دوبارہ فون کر کے مسجد میں مولانا کی گفتگو اور ان کے عزائم کے بارے میں بتایا۔

اس رات مولانا عشا کی نماز کے بعد گھر جا رہے تھے کے راستے میں چند رینجرز نے انہیں پکڑ کر اپنی جیپ میں ڈالا اور اپنے ساتھ کسی نامعلوم مقام پر لے گئے۔

رضوان، سمیرا، اور اس کی سہیلیاں آرام سے اپنے گھر ایک ہی چھت تلے ایک ساتھ سو رہے تھے۔ انہیں خبر بھی نہ ہوئی کہ ان کے خلاف کیا کھچڑی پک رہی تھی جس کی ہنڈیا کھچڑی پکنے سے پہلے توڑ دی گئی تھی۔ کرنل صاحب کی بیٹی اگرچہ سو رہی تھی لیکن کرنل صاحب بہر حال جاگ رہے تھے۔

فصل 19

ڈیفنس کی مسجد کے مولانا راتوں رات غائب ہوئے تو جماعت اسلامی نے سارے پاکستان میں اپنی تنظیموں کو ان کی گمشدگی کے بارے میں الرٹ کر دیا۔

جماعت اسلامی نے اپنی تنظیموں کو داخلی میمو میں مولانا کی سرگرمیوں کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ وہ گم ہونے سے پہلے کے ای کالج کی چار نوجوان لڑکیوں کے بغیر شرعی نکاح کے کے ای کے ایک نوجوان طالب علم کے ساتھ رہنے کے خلاف مسجد میں لوگوں کو خبردار کر رہے تھے۔

میمو میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ لڑکے کا نام رضوان ہے جبکہ لڑکیوں کے نام سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ ہیں۔ سمیرا کسی کرنل کی بیٹی ہے جبکہ عذرا سرحد کے چیف سکریٹری کی بیٹی ہیں۔ یاسمین کسی زمیندار کی بیٹی ہے جبکہ شائستہ پاکستانی امریکن ہے۔ وہ امریکہ میں پیدا ہوئی تھی۔ اس نے وہیں مادر پدر آزاد ماحول میں کالج تک تعلیم پائی تھی۔ اس کا رہن سہن بالکل غیر شرعی اور غیر اسلامی ہے۔ ان لڑکیوں میں سے کوئی لڑکی حجاب نہیں پہنتی لیکن شائستہ تو باقاعدہ ہمہ وقت مغربی لباس میں ملبوس رہتی ہے۔

جماعت اسلامی نے خاص طور پر سرحد میں اپنی تنظیموں سے درخواست کی کہ وہ سرحد کے قبائلی علاقوں میں مولانا کی موجودگی کا کھوج لگانے کی کوشش کریں۔ کیونکہ اغلب امکان یہی ہے کہ سرحد کے چیف سیکریڑی نے مولانا کو اغوا کرا کے سرحد کے قبائلی علاقے میں پہنچا دیا ہے۔

رینجرز کے کرنل کو جب جماعت اسلامی کے داخلی میمو کی کاپی ملی تو اس نے مولانا کے نگران رینجرز کو حکم دیا کہ وہ مولانا کی آنکھیں باندھ کر انہیں کوئی دس گھنٹے تک جیپ میں گھما پھرا کر کسی دوسرے انڈر گراونڈ خفیہ اڈے پر واپس لے آئیں۔ کرنل نے انہیں یہ بھی تلقین کی کہ مولانا کے ارد گرد

سارے پشتو بولنے والے رینجرز کی ڈیوٹی لگا دیں۔ تا کہ اسے اندازہ ہو کہ وہ سرحد کے کسی خفیہ مقام پر زیر حراست ہے۔

رینجرز کا کرنل چاہتا تھا کہ اس طرح ایک تو جماعت کا فوکس غلط ٹارگٹ پر مرکوز رہے گا۔ دوسرا ان کی توجہ رضوان اور لڑکیوں سے ہٹی رہے گی۔

جب جمعہ تک مولانا کا کوئی پتہ نہ چلا تو جماعت اسلامی نے سب مسجدوں کے اماموں سے درخواست کی کہ جمعہ کی نماز کے بعد مولانا کی گمشدگی کے بارے میں سارے پاکستان میں جلوس نکالیں اور حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ جلد از جلد مولانا کی بازیابی کا اہتمام کرے۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی درخواست کی کہ وہ کے ای کالج کی انتظامیہ سے مطالبہ کریں کہ وہ رضوان اور اس کی ساتھیوں کو کالج سے نکال دیں تا کہ ان کی دیکھا دیکھی مزید طالب علم ان کی طرح بغیر نکاح ازدواجی زندگی نہ گزاریں۔

رضوان، سمیرا اور اس کی دوستوں کو مولانا کی کہانی کا پتہ چلا تو انہوں نے باہمی غور و فکر کیا کہ مولانا کو کس نے اغوا کیا ہے۔ سمیرا کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ یہ کام اس کے والد کرنل اکرم کے ایما پر ہوا ہے۔ عذرا نے اس کہانی سے مکمل طور پر لاعلمی کا اظہار کیا کہ اس کے والد کا مولانا کی گمشدگی میں کوئی ہاتھ ہے۔ یاسمین نے بھی کہا کہ اس کے والد زمیندار ضرور ہیں لیکن ان کے ہاں کوئی خفیہ جیل نہیں ہے اور وہ ایسے کام نہیں کرتے۔ شائستہ کی فیملی ویسے بھی پاکستان سے باہر تھی۔ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ نیویارک میں بیٹھ کر مولانا کو غائب کرا دیں۔

کافی غور و فکر کے بعد رضوان، سمیرا، یاسمین اور شائستہ نے باہمی طور پر فیصلہ کیا کہ وہ مولانا کے گمشدگی سے اپنی اور اپنے خاندانوں کی لاتعلقی کا اظہار کریں گے اور ان کو اغوا کرنے والوں سے اپیل کریں گے کہ وہ انہیں رہا کر دیں۔

اس مقصد کے لیے رضوان اور سمیرا اور ان کی دوستوں نے لاہور پریس کلب میں مسجدوں سے جلوس بر آمد ہونے سے ایک روز پہلے شام کے وقت صحافیوں کو اکٹھا کیا اور مولانا کی گمشدگی کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے کہا:

" ہمیں پتہ چلا ہے کہ ہماری رہائش گاہ کے قریب واقع مسجد کے مولانا کچھ دنوں سے غائب ہیں۔ ہمیں یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ان کی گمشدگی کا رشتہ ہم سے جوڑا جا رہا ہے۔

ہمیں یہ بھی پتہ چلا ہے کہ مولانا اپنی مسجد کے نمازیوں کو ہمارے خلاف اُکسا رہے تھے۔ کچھ نمازیوں نے مولانا کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں اور کسی کی ذاتی زندگی میں مداخلت نہ کریں لیکن مولانا بضد تھے کہ وہ ہمیں ہدف بنا کر رہیں گے جس پر بعض نمازیوں سے ان کی تلخی بھی ہوئی تھی۔

مولانا ہمارے خلاف جو بھی عزائم رکھتے تھے ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ اپنے علم اور شعور کی روشنی میں جو مناسب سمجھتے تھے اس کے مطابق عمل کرنا چاہتے تھے۔

ہمیں یہ بھی اندازہ ہے کہ اگر کچھ نمازی دانشمندی کا مظاہرہ نہ کرتے اور مولانا کے اکسانے پر جذباتی ہو کر ان کے منصوبے کا حصہ بنتے اور ہمیں گزند پہنچاتے تو پاکستان کے قوانین کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرتے۔ جس کے نتیجے میں ان کے خلاف قانونی کاروائی ہوتی جس سے اور زیادہ سنجیدہ مسائل پیدا ہوتے۔

اس سب صورت حال کے باوجود ہم میڈیا کے توسط سے کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارا یا ہمارے خاندانوں کا مولانا کی گمشدگی سے کوئی تعلق نہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ انہیں اغوا کر کے قبائلی علاقوں میں پہنچا دیا گیا ہے۔ عذرا کے والد صوبہ سرحد کے چیف سکریڑی ضرور ہیں لیکن وہ ہمارے معاملات سے لاتعلق ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہم ذمہ دار شہری اور ہونہار طالب علم ہیں اس لیے وہ ہمارے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے۔ انہوں نے ہمیں مکمل آزادی دے رکھی ہے کہ ہم جیسے مناسب سمجھیں موجودہ معاملات سے نبرد آزما ہوں۔

ہم میڈیا کے توسط سے مولانا کو اغوا کرنے والوں سے درخواست کرنا چاہتے ہیں کہ اگر انہوں نے مولانا کو ہماری وجہ سے اغوا کیا ہے تو وہ انہیں رہا کر دیں اور اگر انہوں نے کسی اور وجہ سے انہیں اغوا کیا ہے تو بھی انہیں جانے دیں۔

مولانا ہمارے علاقے کے معزز شہری ہیں۔ عالم دین ہیں۔ امام مسجد ہیں۔ اچھے انسان ہیں۔ ان کو اغوا کرنے یا ہراساں کرنے سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ لہذا ہماری استدعا ہے کہ انہیں فوراً رہا کر دیا جائے۔"

رضوان نے پہلے سے لکھا ہوا بیان میڈیا کے سامنے پڑھا اور پھر اخباری رپورٹروں کو دعوت دی کہ اگر وہ ان سے کوئی سوال کرنا چاہیں تو وہ حاضر ہیں۔

سب سے پہلے جماعت اسلامی کے زیر اثر ایک میگزین کا رپورٹر کھڑا ہوا:

"کیا یہ سچ ہے کہ آپ بغیر نکاح ایک ہی گھر میں ایک ساتھ رہتے ہیں؟"

" جی ہاں۔ یہ سچ ہے کہ ہم ایک ہی گھر میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ اور ہم اس طرح ایک ساتھ رہنے کو غلط نہیں سمجھتے۔" سمیرا نے پہلے سوال کا جواب دیا۔

سمیرا کے پہلے سوال کے جواب سے سب رپورٹروں میں شور مچ گیا۔ انہوں نے تو اقرار کر لیا ہے کہ یہ ایک ہی گھر میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ ایک اسلامی معاشرہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔

اس سے پہلے کوئی دوسرا رپورٹر سوال کرتا۔ سمیرا نے اسی رپورٹر سے سوال کیا کہ وہ کتنے بہن بھائی ہیں؟

رپورٹر نے جواب دیا کہ اس کی پانچ بہنیں ہیں اور وہ ان کا اکیلا بھائی ہے۔

سمیرا نے اس رپورٹر سے پوچھا کیا وہ اپنی بہنوں کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتا ہے۔ رپورٹر نے کہا ہاں وہ اور اس کی بہنیں ایک ہی گھر میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔

سمیرا نے کہا کہ وہ مرد ہے اور اس کی بہنیں عورتیں ہیں چنانچہ کیا وہ ان کے ساتھ نکاح کر کے رہ رہا ہے یا بغیر نکاح کے۔؟

سمیرا کے اس استدلال سے رپورٹروں میں اورزیادہ شور بڑھ گیا۔ کئی رپورٹر آپے سے باہر ہونا شروع ہو گئے۔

رضوان نے مداخلت کر کے معاملات کو سنبھالا۔

"دیکھیں۔ ہم یہاں اپنے معاملات پر پریس کانفرنس نہیں کر رہے۔ اگر آپ ہمارے ایک ساتھ رہنے پر بات کرناچاہیں تو ہم حاضر ہیں۔ لیکن اس وقت ہم مولانا کی گمشدگی کے بارے میں بات کرناچاہتے کیونکہ ان کی گمشدگی کا تعلق ہم سے جوڑا جارہاہے۔ اس ضمن میں، میں نے بنیادی طور پر سارے حقائق پیش کر دیے ہیں۔ میرے بیان کی کاپی بھی آپ کو مل چکی ہے۔ اس بارے اگر کوئی اور سوال ہو تو ہم اس کاجواب دینے کے لیے تیار ہیں۔

ایک دوسرے اخبار کے رپورٹر نے پوچھا کہ ہمیں پتہ چلاہے کہ مولانا کو رینجرز نے اغوا کیاہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ سمیرا کے والد صاحب فوج میں کرنل ہیں۔

سمیرا نے بولناچاہالیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی رضوان بولا:

"سمیرا کے والد صاحب فوج میں کرنل ضرور ہیں لیکن وہ پنجاب رجمنٹ کے ساتھ وابستہ ہیں اور آج کل اسلام آباد میں پوسٹ ہیں اس کے بھائی بھی فوج میں ہیں اور آج کل ایک کی بہاولپور اور دوسرے کی ملتان میں پوسٹنگ ہے۔ ان میں سے کسی کا رینجرز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اور آپ کو یہ تو پتہ ہی ہو گا کہ فوج میں فوجی صرف اپنے کمانڈر سے احکامات لیتے ہیں۔"

ایک اور رپورٹر نے کہا کہ اگر مولانا کو رینجرز نے اغوا کیاہے تو آپ ان سے کیا کہیں گے۔ رضوان نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا:

"ہماری ان سے بھی درخواست ہو گی کہ وہ مولانا کو رہا کر دیں۔ مولانا کو حراست میں رکھنے سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ ہم چاہیں گے کہ وہ جلد سے جلد اپنے نمازیوں میں واپس آئیں اور ان کی امامت کریں۔ ان کے بغیر ان کے مقتدی پریشان ہیں۔ اور لوگوں میں بلاوجہ اشتعال پیدا ہو رہاہے۔"

جب رضوان پریس کانفرنس کر رہا تھا سمیرا اور عذرا اس کی دائیں جانب کھڑی تھیں جبکہ یاسمین اور شائستہ اس کی بائیں طرف ایستادہ تھیں۔ سب رپورٹروں نے ان پانچوں کی ایک ساتھ بہت سی تصاویر بنائیں۔ اگلے دن پاکستان بھر کے اخبارات نے پہلے صفحے پر ان کی تصویریں شائع کیں۔ ساتھ مولانا کے حوالے سے ان کی پریس کانفرنس اور اپیل شائع کی کہ جس نے مولانا کو اغوا کر رکھا ہے وہ انہیں رہا کر دے۔

رینجرز کے کرنل نے اخبار میں ان کی تصویر اور پریس کانفرنس کی تفصیل پڑھی تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے خود کلامی کی: " کتنے سادہ اور معصوم ہیں یا پانچوں بچے۔ یہ نہیں جانتے کہ مولوی ان کے ساتھ کیا کرنے جا رہا تھا۔ اگر ہم اس مولانا کر بروقت نہ اٹھاتے تو آج اخبار میں ان کی تصویر چھپنے کی بجائے ان کی لاشوں کی تصویر چھپتی۔"

پھر خود ہی ہنستے ہوئے کہنے لگا:

"مذہب جیسے جیسے شراب کی طرح پرانا ہوتا ہے۔ اس کی تندی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پھر جب یہ رسموں میں ڈھلتا ہے۔ تو یہ نشہ زہر بننے لگتا ہے۔ اس کے ماننے والے انسانوں سے درندے بن جاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو قتل کرنے لگتے ہیں۔ لیکن جب مذہب کا یہ قتل وغارت کا دور گزر جاتا ہے۔ تو پھر اس کی شدت میں کمی آنے لگتی ہے۔ اس کے ماننے والے ایک دوسرے کو برداشت کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ مذہب میدانی علاقوں میں بہنے والے دریاؤں میں ڈھل جاتا ہے۔ جس سے کلچر اور تہذیب کی آبیاری ہوتی ہے اور ان میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔"

رینجرز کے کرنل کی خود کلامی جاری تھی کہ کرنل اکرام کی کال آگئی۔ کرنل اکرام نے اسے پوچھا کہ مولانا کا کیا حال ہے۔

" لگا دیے ہیں سالے کو بہت سے ٹیکے۔ اب ٹھیک رہے گا۔ کچھ نہیں کرے گا۔ سالا سمجھتا ہے کہ سرحد میں کسی نامعلوم مقام پر بند ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو اسے چھوڑ دو۔ اسے زیادہ دیر تک حراست میں رکھنے سے معاملات ہاتھ سے نکل سکتے ہیں۔"

رینجرز کے کرنل نے کرنل اکرام کی کال کے بعد اپنے میجر سے کہا کہ وہ مولانا کی انکھیں بند کر کے آٹھ دس گھنٹے گاڑی چلا کر اسے چھانگا مانگا کے پاس چھوڑ آئیں۔ سالا خود جہاں جانا چاہے گا چلا جائے گا۔

لیکن اسے بتا دینا کہ وہ مسجد میں جو کچھ کہتا ہے اس کی روزانہ رپورٹ ہمیں ملتی ہے۔ سیدھے سبحاو اللہ رسول کی باتیں کیا کرے۔ اگر پھر قران کے حاشیے سے باہر کی باتیں کرے گا تو سالے کو پھر اٹھا لائیں گے۔ اور اگر پھر آیا تو واپس مسجد یا اپنے گھر نہیں جائے گا سیدھا جنت میں جائے گا۔

مولانا کی واپسی اور رضوان کی پریس کانفرنس سے لوگوں میں پیدا ہونے والا اشتعال کچھ کم ہوا لیکن زیر سطح ان کے ایک گھر میں ایک ساتھ رہنے کا مسئلہ چلتا رہا۔ لوگوں میں باتیں بھی ہوتی رہیں لیکن زیادہ تر لوگوں نے آنکھیں اور کان بند کر لیے۔

فصل20

رضوان اور اس کی دوستوں پر ان کے ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے پڑنے والا سماجی دباو کچھ کم ہوا تو انہوں نے دوبارہ اپنے تعلیمی مشاغل کی طرف بھرپور توجہ دینی شروع کی۔

اب کالج سے آ کر وہ روزانہ دن بھر میں اپنی کلاسوں میں پڑھے موضوعات کے بارے میں تا دیر گفتگو کرتے۔ کتابوں میں دی گئی انفارمیشن کو کھنگالتے۔ ان پر آپس میں تبادلہ خیال کرتے۔ ان کے بارے مختلف سوال اٹھاتے اور پھر ان سوالوں کے بارے میں اپنے جوابوں کا محا کمہ کرتے۔ اس گفتگو میں سمیرا اور اس کی سہیلیوں کو اندازہ ہوا کہ رضوان کی یاداشت کمپیوٹر کی طرح ہے۔ وہ جو کچھ سنتا ہے اس کا ذہن اسے الفاظ اور تصویروں کی شکل میں محفوظ کر لیتا ہے۔

پھر انہوں نے دیکھا کہ رضوان بہت کم کھاتا پیتا ہے۔ اور مسلسل کوشش کر رہا ہے کہ کھانے پینے سے خود کو بالکل آزاد کر لے۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ انسانی جسم کو زندہ رہنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب کسی نہ کسی شکل میں ہوا میں موجود ہوتی ہیں۔

اگر انسان کھانا پینا چھوڑ دے تو اس کا وجود ہوا سے وہ سارے عناصر حاصل کر لیتا ہے جن سے اسے خود کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ صرف کھانے پینے اور فضلات کے اخراج کا سارا نظام غیر فعال ہو جاتا ہے جبکہ انسانی جسم ساری غذایت پھیپھڑوں کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔

اس مقصد کے لیے رضوان کی ساری توجہ ان ڈی این ایز پر مرکوز تھی جو کھانے پینے اور فضلات کے اخراج کے نظام کو کنٹرول کرتے اور جسم کو خوراک سے انرجی فراہم کرنے کے عمل کی نگرانی کرتے ہیں۔ تصوراتی سطح پر وہ بڑی حد تک اس بات سے متفق تھا کہ انرجی کے نظام کو کنٹرول کرنے والے ڈی این ایز کو دوبارہ پروگرام کر کے ہوا میں موجود عناصر کو براہ راست پھیپھڑوں کے ذریعے خون میں

شامل کیا جا سکتا ہے جس سے انسانی وجود کی انرجی کی ساری ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ اور چونکہ ہوا سے ملنے والی انرجی خالص انرجی ہو گی چنانچہ فضلات کے اخراج کی جسمانی ضرورت ختم ہو جائے گی۔ اور اس طرح انسان بغیر کھائے پیے نہ صرف ساری عمر زندہ رہ سکے گا بلکہ اس کی عمر کی طوالت بڑھ جائے گی کیونکہ ہوا کے ذریعے براہ راست جسم کو ملنے والی انرجی میں وہ بہت سے عناصر شامل نہیں ہوں گے جو انسانی جسم کی شکست وریخت کا سبب بنتے ہیں۔

سمیرا اور اس کی سہیلیاں رضوان کی اس طرح کی باتیں سنتیں، کبھی اظہار تعجب کرتیں، کبھی اس سمت میں تحقیق کے لیے اس کی ہمت بڑھاتیں، کبھی اس چیز کے اخلاقی، سماجی، معاشی اور سیاسی پہلوؤں کی طرف اس کی توجہ دلاتیں۔

سمیرا کہتی کہ اگر انسان نے کھانے پینے کی ضرورت پر کنٹرول کر لیا تو اس کے نتیجے میں دنیا کا سارا کاروباری اور معاشی نظام تباہ ہو جائے گا۔ کیونکہ بنیادی طور پر انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اپنے کھانے، پینے اور رہنے سہنے کے نظام کو قائم اور جاری رکھنے کے لیے کرتا ہے۔ بہت سے نچلے طبقوں کے لوگ جتنی محنت اور مشقت کرتے ہیں اس کی بنیادی وجہ دو وقت کی روٹی فراہم کرنا ہوتا ہے۔ اگر انہیں دو وقت کی روٹی کی ضرورت نہ رہی تو وہ کیوں کام کریں گے؟ کیونکر اپنے افسروں اور مالکوں کی دھونس دھتکار برداشت کریں گے؟ کیوں روزانہ صبح اٹھ کر اپنی ملازمتوں کی جگہ کی طرف بھاگیں گے؟

عذرا کہتی کھانے پینے کی ضرورت کی علاوہ زندگی کی اور بہت سی ضروریات تو باقی رہیں گی۔ اس لیے دنیا کا کاروباری نظام چلتا رہے گا۔ لوگ اسی طرح کام کرتے رہیں گے۔ اور عملاً اجتماعی زندگی کے معمولات پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

یاسمین کہتی کھیتی باڑی کا زیادہ تر نظام تو کھانے پینے کی اشیا کی پیدوار کے گرد گھومتا ہے۔ اگر کھانا پینا ختم ہو گیا تو زمیندار اور کسان کیوں فصلیں بوئیں گے۔ وہ فصلیں نہیں بوئیں گے تو پھر یہ لہلہاتے ہوئے کھیت،

سر سبز و شاداب مناظر کہاں دیکھنے کو ملیں گے۔ چائے کے باغات کی کیا ضرورت رہ جائے گی؟ ناشپاتیاں، آڑو، آم، سیب، انار کے باغات کون اگائے گا۔

شائستہ کہتی یہ سب کچھ یونہی رہے گا۔ اگر انسان اپنی ضرورت کے تحت یہ سب کچھ نہیں کریں گے تو فطرت اپنی ضرورت اور موجودہ عوامل کے باہمی ارتباط کے نتیجے میں یہ سارے عمل جاری رکھے گی۔ انسان صرف اپنی ضرورت کے تحت ان کی تنظیم اور ترتیب کا سلسلہ جاری رکھے گا۔

رضوان ان کی باتیں سنتا تو کہتا ہو سکتا ہے انسانی جسم کی انرجی کی فراہمی کے عمل کی تبدیلی سے انسان اپنے جسم میں ہونے والے شکست وریخت کے عمل کو روکنے میں کامیاب ہو جائے اور اس طرح موت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے اور پھر انسان پیدا تو ہو لیکن اسے کبھی موت نہ آئے۔

سمیرا کہتی اگر ایسا ہوا تو پھر تو زمین انسانوں کے لیے چھوٹی پڑ جائے گی۔

زمین چھوٹی پڑے گی تو انسان دوسرے سیاروں کی طرف سفر کر جائے گا۔ وہاں جا کر آباد ہو جائے گا۔

کیا دوسرے سیاروں پر چلے جانے سے اس کا مٹی کے ساتھ رشتہ نہیں ٹوٹ جائے گا؟ اور مٹی سے رشتہ ٹوٹا تو اس پر دکھوں اور غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ عذرا نقطہ اٹھاتی۔

رضوان عذرا کے ایسے نقاط پر غور و فکر میں ڈوب جاتا۔ سب کو رضوان کی یہ ادا بہت اچھی لگتی۔ جس طرح وہ چند لمحوں کے لیے اپنے اندر غائب ہوتا اور پھر واپس لوٹتا تو انہیں لگتا جیسے سورج لحظہ بھر کو بادلوں کے پیچھے چھپ کر دوبارہ نمودار ہو گیا ہے۔

وہ کہتا یہ ساری کائنات مٹی کے ایک بوتے سے بنی ہے۔ انسان جہاں جائے گا اس کا رشتہ مٹی کے ساتھ کسی نہ کسی طرح استوار رہے گا۔ مٹی ہی اس کی اصل ہے۔ مٹی ہی اس کی ماں ہے۔ مٹی ہی اس کا باپ ہے۔ اس بات پر اکثر یاسمیں بول اٹھتی:

"رضوان کچھ لوگ کہتے ہیں مٹی ان کی ماں ضرور ہے لیکن ان کا باپ آسمان ہے۔"

رضوان کہتا کہ آسمان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ آسمان ایک حد نظر ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ باقی سب فضا ہے۔ پھر وہ اپنی بات پر زور دینے کے لیے کہتا کہ میں نے لفظ فضا استعمال کیا ہے خلا نہیں۔ کیونکہ خلا ممکن نہیں۔ صرف فضا ممکن ہے۔ اور فضا مادے کی ان لطیف صورتوں سے تشکیل پاتی ہے جن سے انسانی وجود براہ راست انرجی حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ مٹی کا بیٹا اگر کھانے پینے سے آزاد ہو گیا اور اس کے جینز کو دوبارہ پروگرام کر دیا گیا تو وہ فضا سے ضرورت کے مطابق انرجی حاصل کر کے پوری کائنات میں کسی بھی جگہ اپنے وجود کو برقرار رکھ سکے گا۔

عام طور پر ایسی گفتگو کے دوران رضوان، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ کے چہرے ایک بے پایاں مسرت سے چمک اٹھتے۔ ان کا وجود پانچ ایسے ستاروں میں ڈھل جاتا جو ایک دوسرے کو روشنی فراہم کرتے اور ایک دوسرے سے فیض یاب ہوتے۔

لیکن ان پانچوں ستاروں میں سب سے طاقت وراور روشن تر ستارہ رضوان ہی تھا کیونکہ وہ مسلسل فکری روشنی کی شعاعیں بکھیرتا رہتا جس سے سمیرا اوراس کی سہیلیوں کو اپنی تب وتاب میں اضافہ کرنے کا موقع ملتا۔

کے ای میں سمیرا اور اس کی سہیلیاں رضوان سے ایک سال آگے تھیں لیکن فکری اور علمی گہرائی میں رضوان ان سے کہیں آگے تھا۔ ہمہ وقت اس کے ساتھ رہنے کی وجہ سے سمیرا اور اس کی سہیلیوں کی علمی کارکردگی بھی حیران کن حد تک بہتر ہو گئی۔ ان کی کارکردگی میں رونما ہونے والی بہتری دیکھ کر ان کے اساتذہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ایسے کونسے سے نئے عوامل ان کی زندگی میں شامل ہوئے ہیں جس سے ان کی تعلیمی استعداد اور کارکردگی میں اتنی نمایاں بہتری پیدا ہوئی ہے۔

ان کا ذہن گھوم پھر کر ان کے لائف اسٹائل میں تبدیلی کی طرف چلا جاتا۔ پہلے وہ چاروں اکھٹی رہتی تھیں اب ان چاروں کے ساتھ پانچواں رضوان بھی شامل ہو چکا تھا۔

رضوان نے کے ای میں ابتدائی چند ماہ میں اپنی علمی، ادبی اور تحقیقی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا تھا۔ صرف طالب علم ہی نہیں کالج کے سب اساتذہ اس کی استعداد اور صلاحیتوں کے معترف تھے۔ وقت کے ساتھ بین الاقوامی سطح پر ٹیلنٹ کی متلاشی تنظیموں کی طرف سے انہیں مسلسل رضوان کے بارے میں استفہامیہ خطوط ملتے رہتے تھے۔ ساتھ ہی رضوان کو براہ راست ان کی طرف سے مستقلاً پیشکشیں آتی رہتی تھیں کہ اگر وہ کے ای سے اپنے کریڈینشیلز ٹرانسفر کرنا چاہے تو وہ اسے خوش آمدید کہیں گے۔

گزشتہ چند ماہ سے اس کے اور اس کی دوستوں کے حوالے سے شہر میں جو بحث چل رہی تھی اس کی وجہ سے اس نے کئی ایسی ملنے والی پیشکشوں پر سنجیدگی سے غور و فکر شروع کر دیا تھا۔

اس کی خواہش تو یہی تھی کہ وہ کے ای سے ایم بی بی ایس کرے اور پھر وہیں ایک ہسپتال شروع کرے جس کے ساتھ ریسرچ کا ایک ادارہ ہو جس میں میڈیکل کے لاینحل مسئلوں کے بارے میں ریسرچ کی جائے اور پھر اس ریسرچ سے پاکستان کے عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے لیکن اس کی ذاتی زندگی میں مختلف حلقوں کی طرف سے کی جانے والی مداخلت سے اس کے خیالات تبدیل ہونے لگے تھے۔

بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے وائلن بجانے کی وجہ سے اس کی شخصیت میں سے جھجک اور دودلی کا عنصر تقریباً غائب ہو چکا تھا۔ اسے گہری سے گہری بات سوچنے اور بڑے سے بڑا فیصلہ کرنے میں کسی ذہنی خلفشار یا دورخے پن کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔

اس لیے جب اسے امریکہ کے ایک ممتاز میڈیکل ادارے جانز ہاپکنز کی طرف سے دعوت وصول ہوئی کہ وہ اگر انہیں جائن کر لے تو نہ صرف وہ میڈیکل میں اس کی تعلیم کے مکمل اخراجات برداشت کریں گے بلکہ اس کے لیے ابھی سے مناسب مشاہرہ مقرر کریں گے۔ اسے ریسرچ کی تمام سہولتیں فراہم کریں گے اور اس کے رہن سہن کے لیے اچھی رہائش بھی فراہم کریں گے تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کے ای سے ایم بی بی ایس کی بجائے جانز ہاپکنز سے ایم ڈی کرے گا اور وہیں ڈی این ایز اور جینز پر اپنی ریسرچ جاری رکھے گا۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس نے کے ای کے رجسٹرار کو درخواست دی کہ جان ہاپکنز کی طرف اس کے کریڈینشیلز کے بارے میں ملنے والی انکوائری کا مثبت جواب دے دیں کیونکہ اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ جانز ہاپکنز سکول آف میڈیسن جائن کرے گا اور باقی کے تعلیمی مراحل وہیں طے کرے گا۔

سمیرا اور اس کی سہیلیوں نے رضوان کے جان ہاپکنز جائن کرنے کے بارے میں سنا تو ان کے دل بجھ گئے۔

اتنے تھوڑے عرصہ میں رضوان ان کی زندگیوں کا اہم ترین حصہ بن چکا تھا۔ وہ اس سے جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے سوچا تھا کہ کے ای سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہسپتال کھولیں گے۔ ساتھ ریسرچ سنٹر قائم کریں گے۔ اور پانچوں مل کر ایک ساتھ لوگوں کی خدمت کریں گے اور ساتھ ساتھ رضوان کی راہنمائی میں ریسرچ کا سلسلہ بھی جاری رکھیں گے۔

رضوان کا فیصلہ سن کر چاروں کی آنکھیں بھر آئیں۔ رضوان نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا: کہ دو چار برس کی جدائی کوئی بڑی بات نہیں۔ اب بھی ایسے ہی ہو گا۔

اس نے انہیں کہا کہ وہ بہت جلد کے ای سے ایم بی بی ایس کر کے فارغ ہو جائیں گی۔ ہاؤس جاب مکمل کرتے ہی وہ پلان کے مطابق ہسپتال کھولیں اور ساتھ ریسرچ سنٹر قائم کریں۔ وہ جانز ہاپکنز سے فارغ التحصیل ہو کر واپس آئے گا اور ان کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔

رضوان کی بات سن کر ان کے چہرے خوشی اور امید سے کھل اٹھے۔ انہوں نے پوری تندہی کے ساتھ رضوان کو یو ایس بھجوانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

فصل 21

رضوان ایک چمکتے دن کی سہ پہر نیویارک ائیر پورٹ پر اترا تو اس کا دل دکھ اور خوشی کے جذبات سے معمور تھا۔

اس کا دل دکھی تھا پاکستان چھوڑنے پر۔ اس کا دل دکھی تھا جمال پور کی مٹی سے دور جانے پر۔ امریکہ آنا کبھی بھی اس کے پلان کا حصہ نہیں تھا۔ لیکن گزشتہ چند ماہ سے اس کی زندگی میں جو واقعات رونما ہو رہے تھے اس کا اس نے یہی حل مناسب سمجھا کہ جانز ہاپکنز چلا آئے اور باقی تعلیم وہاں پوری کرے۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ صورت حال اتنی خراب ہو جائے کہ اس کے نتائج سمیرا، عذرا، یاسمین یا شائستہ کو بھگتنے پڑیں۔ یا جمال پور میں اس کے سیدھے سادے ان پڑھ والدین کو اس کی وجہ سے ایسے حالات در پیش ہوں جن سے نبرد آزما ہونا ان کے بس سے باہر ہو یا جن کی پیچیدگی کا انہیں شعور نہ ہو۔

اس کا دل خاص طور پر دکھی تھا سمیرا اور اس کی سہیلیوں کی ان پرنم آنکھوں کی وجہ سے جن کے ساتھ انہوں نے اسے لاہور ائیر پورٹ پر الوداع کہا تھا۔

کتنی کاٹ تھی سمیرا کے آخری جملے میں:

"رضوان یاد رکھنا ہم تمہارے بغیر بارش میں بیٹھی کبوتریوں کی طرح ہیں۔"

اس جملے کا خیال آتے ہی اس کی آنکھیں بھی چھلک اٹھیں۔ پھر اس کی نظر امیگریشن آفیسر کے دیئے گئے ایک کارڈ پر پڑی جس پر انگریزی میں لکھا تھا: ویلکم ٹو دی یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ۔ یہ جملہ پڑھ کر اس کی آنکھوں میں آگ کے شعلوں کی طرح جلتے آنسو موسم بہار کی بارش میں بدل گئے۔ کہاں جمال پور کے ایک کمہار کا بیٹا اور کہاں نیویارک، واشنگٹن اور بالٹی مور۔ اس نے اپنے ہاتھ میں لپٹی ہوئی گدھے والی تصویر کو اور مضبوطی سے تھام لیا۔

اگلے چند دنوں میں ایڈمشن آفس اور ہاؤسنگ کی کاروائی کے بعد اس نے فیکلٹی ایریا میں ملنے والی فرنشڈ ریذیڈنس میں لونگ روم کی دیوار پر گدھے والی تصویر اس طرح آویزاں کی کہ گھر میں آنے والے ہر فرد کی نظر سب سے پہلے اس پر پڑتی۔

اتفاق سے جن دنوں وہ بالٹی مور میں وارد ہوا یوایس اے کی مشرقی کوسٹ پر موسم خزان کا ورود ہو چکا تھا۔ اس کے گھر کی کسی بھی کھڑکی کھلنے پر ہر طرف درختوں کے سرخ اور زرد پتوں کا منظر اتنا خوبصورت تھا کہ وہ پہروں کبھی ایک کھڑکی کبھی دوسری کھڑکی کھول کر فال کلرز سے لطف اندوز ہوتا اور اس کا جی نہ بھرتا۔ وہ اکثر سوچتا جس ملک میں خزاں کا موسم اتنا خوبصورت ہے وہاں بہار کا عالم کیا ہوگا۔ لیکن جلد ہی جب وہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہوا نہ اسے خزاں یاد رہی نہ بہار۔

ان مصروفیات کا سب سے بڑا فائدہ اسے یہ ہوا کہ وہ بہت جلد پاکستان کے ماحول کا بھلا کر امریکی ماحول میں ایڈجسٹ ہو گیا۔ ویسے بھی اس میں نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہونے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ شروع شروع میں اسے ساتھی طالب علموں اور اساتذہ کے انگریزی کے لہجے سے کچھ الجھن ہوئی لیکن چند ہفتوں میں اس نے امریکی انگریزی کے صوتی اتار چڑھاؤ پر اس طرح عبور حاصل کیا جیسے امریکہ میں پیدا ہوا ہو اور امریکہ ہی میں اس کی ساری تعلیم ہوئی ہو۔ جب اس کی زبان صاف ہوئی تو اس کے ساتھی طالب علموں اور اساتذہ نے اس کی بے پناہ ذہنی استعداد اور انسانی جسم اور انسانی بیماریوں کے بارے میں غیر روائتی نقطہ نظر میں خاصی دلچسپی کا اظہار کیا۔

جانز ہاپکنز میں طالب علموں کی تعداد کے ای کی نسبت بہت کم تھی۔ لیکن فیکلٹی میں اساتذہ اور ریسرچرز کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

رضوان نے بہت جلد بہت سے فیکلٹی ممبران اور ریسرچ اسکالرز سے دوستی کر لی۔ فیکلٹی ایریا میں رہائش ملنے کی وجہ سے فیکلٹی کے بہت سے ممبران کے ساتھ کسی نہ کسی طرح اس کا سامنا ہو جاتا اور چند ملاقاتوں کے بعد دوستی ہو جاتی۔

اس طرح چند ماہ میں رضوان نے جانز ہاپکنز میں اپنا ایک حلقہ پیدا کر لیا۔ اس حلقے میں مزید پھیلاؤ اور گہرائی اس کے وائلن بجانے کی بے مثال صلاحیت کی وجہ سے آئی۔

امریکہ میں تقریباً ہر اسکول میں میوزک کی کلاسیں ہوتی ہیں اور سبھی طالب علم کوئی نہ کوئی انسٹرومینٹ بجانا جانتے ہیں لیکن ان میں سے چند ایک ہی میوزک کو سنجیدگی سے لیتے اور اس میں کمال پیدا کرتے ہیں۔ باقی میوزک کی کتابوں میں تحریر شدہ دھنیں بجانے تک محدود رہتے ہیں۔ ان کے لیے میوزک زندگی کے اندرونی سیلف کے اظہار کی بجائے زیادہ تر ایک میکانیکی عمل کی حیثیت رکھتا ہے جس سے لوگوں کی جمالیاتی حس کی تسکین ضرور ہوتی ہے لیکن ان کا میوزک کبھی فنی معجزے کی سطح تک نہیں پہنچ پاتا۔

جب رضوان کے ہم جماعتوں اور فیکلٹی کے ممبران کو پتہ چلا کہ رضوان وائلن بجانے میں بہت ایکسپرٹ ہے تو انہوں نے ایک ویک اینڈ پر فیکلٹی کے رہائشی ایریا میں سر شام ایک چھوٹی سی محفل رکھی۔ جس میں بہت سے طالب علم اور فیکلٹی ممبران جن انسٹرومینٹس میں مہارت رکھتے تھے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ ڈاکٹر تھامسن جو کہ بنیادی طور پر کارڈیالوجسٹ تھے اور جانز ہاپکنز میں کارڈیالوجی پڑھاتے تھے ایک اچھے وائلنسٹ بھی تھے۔ وہ رضوان کے گھر سے تھوڑی دور اسی فیکلٹی ایریا میں رہتے تھے۔ اور ان کی بیگم جوڈی تھامسن جو کہ بہت اچھا پیانو بجاتی تھیں اس محفل کے میزبان تھے۔ جب رضوان اپنی وائلن اٹھائے ڈاکٹر تھامسن کے گھر پہنچا تقریباً سبھی مہمان لڑکے لڑکیاں وہاں آ چکے تھے۔

نیل لارسن اپنی بینجو اور رج گارسیا اپنی کلیرانٹ کے ساتھ ڈاکٹر تھامسن کے ڈرائنگ روم میں اپنی اپنی دھنوں کی کتابوں کے ساتھ موجود تھے۔

رضوان چونکہ میوزک کی لکھی ہوئی دھنیں نہیں بجاتا تھا بلکہ اس کی دھنیں زیادہ تر اس کی اپنی افتاد طبع کی ایجاد تھیں۔ اس لیے اس کے پاس دھنوں کی کوئی کتاب نہیں تھی۔

جوڈی تھامسن نے اسے کتاب کے بغیر دیکھا تو اسے دھنوں کی کتاب دی جو اس نے شکریے کے ساتھ ایک طرف یہ کہہ کر رکھ دی کہ اسے اس کی ضرورت نہیں۔

شام کا آغاز جوڈی تھامسن نے پیانو سے کیا۔ رضوان نے دوسرے مہمانوں کے ساتھ پوری توجہ سے جوڈی کی پیانو کی دھنیں سنیں۔ پیانو کی دھنیں اس کے کانوں کو بہت بھلی محسوس ہوئیں۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے ان کی تحسین کی۔

جوڈی تھامسن کے بعد نیل لارسن نے اپنی بینجو کی دھنوں سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ نیل لارسن نے بینجو بجانا ختم کی تو رج گارسیا نے کلیر انٹ سے دھنیں الاپنا شروع کر دیں۔

جب رج گارسیا کلیر انٹ بجا چکا تو ڈاکٹر تھامسن نے کہا کہ وہ رضوان کے احترام میں اس سے پہلے وائلن بجائیں گے۔ لیکن ساتھ ہی کہنے لگے چونکہ رضوان کا تعلق پاکستان سے ہے اس لیے پاکستان کی مناسبت سے وہ جو دُھن بجائیں گے اس کا ٹائٹل ہے پاکستانی آرمز ڈیلر کی بیٹی۔

جب ڈاکٹر تھامسن دُھن کا نام بتا رہے تھے رضوان کو دھن کے ٹائٹل سے ہلکا سا تضحیک کا پہلو نکلتا محسوس ہوا۔

ڈاکٹر تھامسن نے پاکستانی آرمز ڈیلر کی بیٹی نام دھن وائلن پر بجائی تو باقی حاضرین کے ساتھ رضوان کو بھی وہ دھن خاصی پسند آئی۔ ڈاکٹر تھامسن نے دھن کے تاثر میں گہرائی پیدا کرنے کے لیے دھن کو کئی مختلف طریقوں سے پیش کیا۔ باقی سب کے ساتھ رضوان نے بھی ڈاکٹر تھامسن کو دل کھول کر داد دی۔

ڈاکٹر تھامسن وائلن سے پاکستانی آرمز ڈیلر کی بیٹی کی دھن بجا کر داد سمیٹ چکے تو کہنے لگے اب جانز ہاپکنز کمیونٹی کے نئے ممبر رضوان وائلن پر اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔ اور رضوان کے بعد ہم سب مل کر ایک ساتھ کچھ دھنیں بجائیں گے۔

رضوان نے اپنا وائلن اپنے بائیں کندھے پر اور بائیں ہاتھ کی انگلیاں وائلن کے تاروں پر درست کیں اور دائیں ہاتھ سے باو وائلن پر رکھتے ہوے بولا: "آج وہ صرف ایک دُھن بجائے گا۔ اور اس دُھن کا ٹائٹل ہے اے ٹرپ ٹو پاکستان۔

ڈاکٹر تھامسن نے پاکستانی آرمز ڈیلر کی بیٹی کے نام سے دُھن پیش کی ہے لیکن اے ٹرپ ٹو پاکستان میں آپ واقعتاً وائلن کے ذریعے پاکستان کی سیاحت پر جائیں گے۔ چونکہ آپ عملاً پاکستان نہیں گئے لیکن فطرتی مظاہر اور انسان چونکہ ہر جگہ ایک ہی جیسے ہوتے ہیں اس لیے اے ٹرپ ٹو پاکستان سے آپ جن تصوراتی کیفیات سے گزریں گے وہ حقیقت کے بہت قریب ہوں گی۔

اب دل تھام کر بیٹھیں اور چلیں پاکستان۔ یہ کہہ کر اس نے وائلن پر باو کو حرکت دینی شروع کی۔ اور کمرے میں بیٹھے سب لوگوں کی آنکھیں خود بخود بند ہونا شروع ہو گیں۔

انہوں نے چاہا کہ ان کی آنکھیں بند نہ ہوں۔ لیکن اب انہیں خود پر اختیار کہاں تھا۔ ان کے دل، ان کے دماغ، اور ان کی روحیں رضوان کی وائلن کی دھنوں کی گرفت میں تھیں۔

وہ اس کے وائلن کی دھنوں کے ساتھ گوادر اور کراچی کے ساحلوں پر پرواز کر رہے تھے۔ سندھ اور پنجاب کے صحراوں، وادیوں، اور دور دور تک پھیلی آبادیوں کی سیاحت کر رہے تھے۔ آبادیوں میں محنت کشوں کو خستہ حالی کے باوجود سخت محنت سے کام کرتے دیکھ رہے تھے۔ آبادیوں کے باہر کھیت کھلیان دیکھ رہے تھے۔ کھیتوں میں ہل چلاتے کسان دیکھ رہے تھے۔ جھونپڑیاں اور محل نما گھر دیکھ رہے تھے۔ دریا دیکھ رہے تھے۔ نہریں دیکھ رہے تھے۔ جھیلیں دیکھ رہے تھے۔ پہاڑوں میں بل کھاتی سڑکیں دیکھ رہے تھے اور برف سے اٹی پہاڑوں کی چوٹیاں دیکھ رہے تھے۔

رضوان نے ایک ماہر پتنگ باز کی طرح کئی بار اپنے وائلن کی دھنوں سے ان کے تصور کی پتنگوں کو دائیں، بائیں، اوپر اور نیچے گھمایا اور پھر گوادر اور کراچی کے ساحلوں سے انہیں واپس بالٹی مور لے آیا۔

رضوان نے وائلن بجانی بند کی تو وہاں بیٹھے سب لوگوں کو محسوس ہوا کہ وہ خوابوں کی دنیا میں ایک اجنبی ملک کے سفر سے واپس لوٹے ہیں۔ وہ سب اپنی جگہوں پر کھڑے ہو کر دیر تک تالیاں بجا کر رضوان کو داد دیتے رہے۔

ڈاکٹر پیٹ تھامسن اور جوڈی تھامسن نے اس شام کا اگلا سیشن یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ اس تجربے کے بعد گنجائش نہیں رہ گئی کہ سب مل کر میوزک بجائیں اور اس خوبصورت کیفیت کو ختم کر دیں جو رضوان نے اپنی وائلن سے پیدا کی ہے۔

اس کے بعد وہ سب شریک محفل تھے اور رضوان جان محفل۔ جانز ہاپکنز نے رضوان کے لیے اپنے بازو اس طرح وا کئے اور اپنی آغوش ایسے کشادہ کی کہ وہ تتلی کی طرح جہاں چاہتا چلا جاتا جس گل پر چاہتا بیٹھ جاتا ہر کوئی اسے خوش آمدید کہتا۔

وہ واقعتاً کے ای سے جانز ہاپکنز اور پاکستان سے امریکہ آ چکا تھا۔ پاکستان کی طرح امریکہ بھی اسے اچھا لگا۔

فصل 22

ڈاکٹر تھامسن اور جوڈی تھامسن کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ بیٹا شادی شدہ تھا۔ اور اپنی بیوی کے ساتھ الگ سے رہتا تھا۔ تاہم بیٹی حیدر بیٹے سے چھوٹی تھی اور تا حال اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ جس شام ڈاکٹر اور مسز تھامسن نے اپنے گھر موسیقی کا چھوٹا سا پرگرام کیا وہ اپنے سائیکل سوار دوستوں کے ساتھ بالٹی مور سے نیویارک اور پھر نیویارک سے واپس بالٹی مور کی سائیکل ریس پر تھی۔

وہ گروپ ریس سے واپس لوٹی تو ڈاکٹر تھامسن اور اس کی امی جوڈی تھامسن نے اسے رضوان کے وائلن والے تجربے کے بارے میں بتایا۔ ماں، باپ اور بھائی کے موسیقی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے موسیقی حیدر کی جان تھی۔

وہ خود بھی کئی انسٹرومینٹ بجاتی تھی۔ لیکن اپنی ماں کی طرح وہ بھی پیانو کی ایکسپرٹ تھی۔ اس نے رضوان کے سحر انگیز وائلن کے بارے میں سنا تو پہلے تو اسے یقین نہ آیا۔ پھر کندھے اچکاتی ہوئی بولی۔ کیا وائلن بجانے کے علاوہ ہمارا پاکستانی مہمان سائیکلسٹ بھی ہے کہ نہیں؟

رضوان نے کبھی زندگی میں سائیکل نہیں چلائی تھی۔ اس لیے نہیں چلائی تھی کہ اسے کبھی سائیکل چلانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ جمال پور اتنا چھوٹا تھا کہ وہاں سائیکل کی ضرورت نہیں تھی۔ گورنمنٹ کالج اور کے ای میں اس کا ہاسٹل میں قیام رہا۔ ہاسٹل میں اپنے کمرے سے نکلتا تو کلاس روم میں ہوتا اور کلاس روم سے نکلتا تو اپنے کمرے میں۔ چنانچہ سائیکل چلاتا تو کیوں اور کس وقت؟

حیدر باقاعدہ بالٹی مور ینگ سائیکلسٹس کلب کی ممبر تھی۔ اسے سائیکل چلانے سے عشق تھا۔ وہ اکثر ہفتوں کے لیے سائیکلنگ کی طویل ریسوں پر چلی جاتی۔ واپس لوٹتی تو اس کا چمکتا سفید چہرا ماند ہوتا دکھائی دیتا۔ لیکن بدن کے خطوط اور نمایاں ہو جاتے۔ ہپ اور ٹانگوں کے خطوط میں اور دلکشی پیدا ہو جاتی۔ اور

اپنے چمکتے بلانڈ بالوں کی تو کبھی اس نے فکر نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ آزادی سے اس کے شانوں پر لہراتے رہتے۔

اپنی ماں اور باپ سے رضوان کے وائلن بجانے کے واقعہ کا سن کر اس نے سائیکل سنبھالی اور سیدھی رضوان کے گھر جا پہنچی۔ دروازے کی گھنٹی بجا کر سائیکل تھامے دروازہ کھلنے کی منتظر کھڑی رہی۔ رضوان نے دروازہ کھولا اور استفہامیہ انداز میں حیدر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

"فرمایئے؟"

"کیا تم رضوان ہو؟"

"ہاں، میں رضوان ہو؟"

"تو ہٹو مجھے اندر آنے دو۔"

"لیکن محترمہ تم ہو کون؟"

"میں حیدر ہوں۔ ڈاکٹر تھامسن کی بیٹی۔ تمہارے وائلن بجانے کے بارے میں سنا تو تم سے ملنے چلی آئی۔"

رضوان نے ڈاکٹر تھامسن کا نام سنا تو حیدر کے لیے دروازہ کھول دیا۔ حیدر سائیکل باہر ہی کھڑی کر کے دروازے کے اندر داخل ہوئی تو اس کی نظر دیوار پر لگی رضوان کی گدھے کے ساتھ کھنچی تصویر پر پڑی۔ وہ چند لمحوں کے لیے رک کر محویت کی ساتھ اس تصویر کو دیکھتی رہی۔

وہ تصویر دیکھ رہی تھی اور رضوان اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے لگا حیدر کے خدوخال اس کے دل میں اترتے جا رہے ہیں۔ اس کا چمکتا خوبصورت چہرہ، چہرے پر چمکتی زندگی سے بھرپور دو روشن آنکھیں۔ آنکھوں سے نیچے ہلکی گولائی لیے تھوڑی سی اوپر اٹھتی ہوئی ناک۔ اسے سب بہت اچھا لگا۔ اس کا جی چاہا کہ حیدر گدھے کے ساتھ اس کی تصویر دیکھتی رہے اور وہ اسے دیکھتا رہے۔

چند ثانیوں بعد حیدر نے تصویر سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا کہ "اس تصویر میں ایک عجیب سی کشش ہے۔ نوجوان لڑکے اور گدھے کے تاثرات اور دونوں کا دور تک دیکھنے کا انداز اور گدھے کی گردن کا خم سب کچھ اتنا عجیب ہے کہ یہ تصویر گیلری میں رکھے جانے کے قابل ہے۔ کس نے بنائی تھی یہ تصویر؟"

"یہ تصویر کسی اخبار کے رپورٹر نے بنائی تھی۔ میں بورڈ کے میٹرک کے امتحان میں فرسٹ آیا تھا۔ اس نے اپنے اخبار کے لیے یہ تصویر کھینچی تھی۔"

"بورڈ اور امتحان؟" حیدر نے استفہامیہ انداز میں رضوان کی طرف دیکھا۔ پاکستان کی طرح کا امریکی تعلیمی نظام میں بورڈ کے امتحان کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔

"یہ ایسے ہی ہے جیسے میری لینڈ اسٹیٹ کا ایک تعلیمی بورڈ ہو جو کہ میری لینڈ کے تمام ہائی اسکولوں کے تمام طالب علموں کا مشترکہ امتحان لے اور اس میں ایک طالب علم سب سے زیادہ مارکس حاصل کرے۔"

رضوان کی وضاحت سن کر حیدر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اور پھر بولی: "جو بھی موقع تھا۔ جس نے بھی یہ تصویر بنائی تھی اس نے وقت کے کسی ایسے لمحے کو اپنے کیمرے میں اس وقت گرفت میں لیا تھا جب ہر چیز پرفیکٹ حالت میں تھی۔"

"ہاں پاکستانی کبھی کبھی ایسا کمال کرتے ہیں۔" اور پھر ہنستے ہوئے بولا: "محترمہ کیا آپ بیٹھیں گی اور کچھ پئیں گی یا یونہی تصویر کی تعریف کرتی رہیں گی؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ کیا تمہارے ریفریجریٹر میں بیئر ہے؟" حیدر نے استفسار کیا۔

"بی بی یہاں بیئر کہاں۔ ہم چائے پینے والے لوگ ہیں۔ اگر چائے پینا پسند کریں تو حاضر ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر آئس ٹی ہو تو چلے گی۔" حیدر نے جواب دیا۔

آئس ٹی کے کین وافر تعداد میں اس کے ریفریجریٹر میں رکھے تھے۔ اس نے آئس ٹی کا ایک کین حیدر کو دیا اور دوسرا خود کھول کر چسکیاں لینے لگا۔

حیدر نے رضوان کو بغیر اسٹرا کے کین سے آئیس ٹی پیتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی اسٹرا ایک طرف پھینک کر ویسے ہی کین سے منہ لگا کر آئس ٹی پینے لگی۔

حیدر کے آئس ٹی پینے میں ایک سادگی اور والہانہ پن تھا جو رضوان کو بہت اچھا لگا۔ عام امریکی کتنے اچھے ہیں۔ اس نے سوچا۔ لیکن امریکی حکومت کی پالیسیاں کس طرح ان کے بارے میں پوری دنیا میں بدگمانیاں پیدا کرتی ہیں۔

"کب آئے تھے پاکستان سے؟" حیدر نے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے رضوان سے پوچھا۔

"چند ہفتے قبل پہنچا تھا۔ تمہارے والدین کے ساتھ موسیقی کی شام عام امریکیوں کے ساتھ میرا پہلا سماجی تجربہ تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو میں جانز ہاپکنز میں مصروف رہا۔"

"کیسا رہا یہ تجربہ؟" حیدر نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے دوسرا سوال داغ دیا۔ "بہت اچھا۔ ڈاکٹر تھامسن اور مسز تھامسن نے چند لوگوں کو دعوت دے رکھی تھی لیکن سب بہت کوالٹی کے لوگ تھے۔ مزے دار بات یہ ہے کہ وہاں سب کو موسیقی سے دلچسپی تھی۔ وہاں موجود ہر شخص کوئی نہ کوئی انسٹرومینٹ بجانا جانتے تھا۔"

"کیا پاکستان میں لوگوں کو موسیقی سے دلچسپی نہیں ہے۔"

"سننے کی حد تک لیکن موسیقی سیکھنے کا شوق اتنا عام نہیں۔"

"ایسا کیوں ہے؟"

"شاید اس لیے کہ پاکستانی اسلامی ویلیوز کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ اور اسلام میں موسیقی کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں۔"

"لیکن عیسائیت میں تو ایسا نہیں۔ یہاں تو چرچ میں اتوار کے اجتماع کے لوازمات اس وقت تک پورے نہیں ہوتے جب تک خدا کے حمدیہ گیت نہ گائے جائیں۔"

"خدااور رسول کے حمد یہ گیت وہاں بھی گائے جاتے ہیں لیکن سماجی سطح پر موسیقاروں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔"

رضوان اور حیدر کے درمیاں موسیقی پر تبادلہ خیال چل رہا تھا۔ رضوان کو محسوس ہوا کہ صرف وہی حیدر میں دلچسپی نہیں لے رہاوہ بھی اس میں اتنی ہی دلچسپی لے رہی ہے۔

وہ جب سے آئی تھی اس کی نظریں مسلسل رضوان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات، آنکھوں میں ابھرتے جذبات، بات کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی حرکات و سکنات کو پوری توجہ سے دیکھ رہی تھی۔

اسے رضوان کی گدھے والی تصویر میں جو کشش محسوس ہوئی تھی اس سے زیادہ کشش اسے رضوان کی شخصیت میں محسوس ہوئی۔ ایک عجیب انوکھا بانکپن تھا اس کی شخصیت میں۔ حیدر کو لگا جیسے پوری نیچر رضوان کی شخصیت میں مجسم ہو گئی ہو۔ اس پر اس کے بات کرنے کا اندازاور نوا نکور امریکی لہجہ جو اس کے پاکستانی لہجے سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

حیدر نے سوچا رضوان سے دوستی ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ وقت گزارا جا سکتا ہے۔

"کیا تم میرے لیے وائلن نہیں بجاؤ گے؟" حیدر نے ملتجیانہ انداز میں رضوان سے درخواست کی۔

"نہیں حیدر میں تمہارے سامنے وائلن نہیں بجا پاؤں گا۔ امید ہے تم مجھے معاف کر دو گی۔"

حیدر کے سامنے وائلن بجانے سے انکار رضوان کے لیے بھی حیران کن تھا۔ وہ چند لمحوں تک حیرت کی تصویر بنا اسے دیکھتا رہا۔ حیدر کے لیے بھی رضوان کا وائلن بجانے سے انکار حیران کن عمل تھا۔ آخر اس نے اس کے سامنے وائلن بجانے سے انکار کیوں کیا ہے۔ رضوان نے حیدر کی آنکھوں میں حیرت کے بادل تیرتے دیکھے تو کہنے لگا:

"حیدر بات یہ ہے کہ میں جب وائلن بجاتا ہوں تو میرا رشتہ براہ راست فطرت کے ساتھ جڑ جاتا ہے اور باقی ہر چیز سے منقطع ہو جاتا ہے۔ تمہارے ہوتے ہوئے مجھے لگتا ہے میں ایسا نہیں کر پاؤں گا۔ مجھے

وائلن بجانے کے لیے اپنے ارد گرد سے جس انقطاع کی ضرورت ہے وہ تمہاری موجودگی میں ممکن نہیں۔"

رضوان کے جواب کی بے ساختگی نے حیدر پر سحر طاری کر دیا۔اس نے آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لیا۔

رضوان کے لیے حیدر کی یہ حرکت حیرت ناک تھی۔ لیکن اس نے کسی رد عمل کا مظاہرہ نہیں کیا بس مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا۔حیدر کا اسے اس طرح دیکھنا اچھا لگا۔

پھر وہ اس سے اجازت چاہتے ہوئی بولی۔ کیا وہ اس سے ملنے اور اس کے ساتھ وقت گزارنے اس کے گھر واپس آسکتی ہے۔

"کسی بھی وقت،جب بھی تم چاہو،وقت کی کوئی قید نہیں۔" رضوان نے اپنائیت سے جواب دیا۔

حیدر نے اپنا ہلمٹ اٹھا کر سر پر رکھا اور شب بخیر کہہ کر دروازے سے باہر چلی گئی۔

فصل 23

چند دنوں تک حیدر غائب رہی۔ نہ وہ خود آئی نہ اس کا فون آیا۔ اس دوران رضوان نے چند ثانیوں کے لیے اس کے بارے میں سوچا لیکن پھر اپنے تعلیمی معاملات میں یوں مصروف ہوا کہ حیدر کا خیال اس کے ذہن سے تقریباً محو ہو گیا۔

ایک شام وہ اپنے گھر کی کھڑکی کے پردے کھولے سڑک کے پار واقع پارک میں کھیلتے بچوں کی معصوم حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ حیدر اسے سائیکل سے اتر کر اس کے گھر کی طرف بڑھتی دکھائی دی۔ اس نے اپنی سائیکل کے پیچھے ایک اور غیر مرتب سائیکل لٹکا رکھی تھی۔

اس نے سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے رضوان کے گھر کی بیل بجائی تو رضوان نے تقریباً دوڑتے ہوئے گھر کا دروازہ کھولا۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے ہلمٹ اتار کر صوفے کے سامنے پڑی چھوٹی میز پر رکھا اور پھر "ہائے اجنبی" کہہ کر رضوان سے لپٹ گئی۔

رضوان کے لیے حیدر کا یہ محبت بھرا حملہ حیران کن ہی نہیں تھوڑا پریشان کن بھی تھا۔

اس سے زیادہ پریشانی اسے اس وقت ہوئی جب حیدر نے بغیر کچھ کہے اگلے لمحے اپنے ہونٹ رضوان کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔

چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد رضوان نے بھی حیدر کے بوسے کا جواب بوسے سے دیا۔

یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ رضوان کو یہ سوچنے کا موقع نہ ملا کہ اس نے حیدر کے لیے اپنے دل میں پنپنے والے لطیف جذبات کو اس سے باقاعدہ محبت میں ڈھلنے دینا ہے یا نہیں۔

یہ بجا ہے کہ حیدر اسے اچھی لگی تھی۔ اتنی اچھی کہ اس کے سامنے اسے وائلن بجانے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن اسے حیدر سے محبت نہیں ہوئی تھی۔

ویسے بھی میڈیکل سائنس پڑھنے والے طالب علموں پر انسانی جسم کی سائنسی حقیقتیں ان کے جبلی جذبات پر غالب رہتی ہیں۔ لیکن حیدر کے بوسے نے ایک لمحے میں رضوان کی ایسی سب دشواریوں کو دور کر دیا۔

بوسے کا جواب بوسے سے دینے کے بعد رضوان کے دل میں حیدر کے لیے لطیف جذبات اس کی محبت میں ڈھل گئے۔ وہ اس کی محبت کا جواب محبت سے دینے کی طرف مائل ہو گیا۔

تاہم اس کے ذہن میں اپنا پس منظر، امریکہ آنے کے پیچھے مقاصد اور پاکستان لوٹنے کا عزم تا کہ وہ پاکستان کے عوام کی خدمت کر سکے بدرجہ اتم موجود تھے۔

پہلے بوسے میں رسمی ہچکچاہٹ کے بعد حیدر نے رضوان سے بوسے میں ہچکچاہٹ کا سبب پوچھا:

"کیا میں تمیں اچھی نہیں لگی؟"

"حیدر جان سچ یہ ہے کہ تم نے پہلی نظر میں میرے دل پر قبضہ جما لیا تھا۔ لیکن میں محبت کو ایک پودے کی پیدائش کے عمل سے تعبیر کرتا ہوں۔ جس طرح پودے کا بیج بویا جاتا ہے۔ پھر اس بیج سے انکھوا پھوٹتا ہے۔ پھر وہ انکھوا بڑھ کر توانا درخت میں تبدیل ہو جاتا ہے محبت کو بھی ویسے ہی جنم لینا اور پروان چڑھنا چاہیئے۔ میں نہیں جانتا تھا میکڈانلڈ کی سرزمین میں محبت بھی "ہاٹ فوڈ" کی طرح "ریڈی ٹو گو" ہوتی ہے اور فوراً مل جاتی ہے۔"

رضوان کی وضاحت سن کر حیدر کھل کھلا کر ہنس پڑی اور پھر اس نے رضوان پر بوسوں کی بارش کر دی۔

رضوان نے بھی حیدر کے بوسوں کا جواب اسی طرح نرم و گرم بوسوں سے دیا۔ اس نے دیکھا کھڑکی کے باہر موسم بہار کی پہلی بارش کی بوندیں ہولے ہولے گرنے لگی تھیں۔

حیدر نے آگے بڑھ کر کھڑکی کا پردہ بند کیا اور رضوان کے سینے سے لپٹ کر اس کی قمیض کے بٹن کھولنے لگی۔ رضوان بھی ایک کبوتر کی طرح حیدر کے ہاتھوں کی حرارت میں اس طرح سمٹ کر بیٹھ گیا جیسے کسی زمستان سے اڑتا ہوا آیا ہو اور اب اس نرم گرم ماحول میں چند لمحے استراحت کے گزارنا چاہتا ہو۔ یہ

ایک عجیب کیفیت تھی۔ جس کا رضوان نے اس سے پہلے کبھی تجربہ نہیں کیا تھا۔
اسے لگا حیدر کو اس پر ایک طاقت حاصل ہے۔ اس کی خوبصورتی، اس کے جسم کی راحت افزا حرارت، اس کا بدنی التفات اس سے مطالبہ کر رہا تھا کہ وہ اس چھوٹی سی امریکی لڑکی کے ساتھ اس طرح ایک ہو جائے کہ پھر کبھی اس سے جدا نہ ہو۔

اس خیال سے زمستانی کبوتر نے پر پھڑ پھڑائے اور غٹر غوں کرتے ہوئے پیلیں ڈالنے لگا۔ پھر بالٹی مور میں جانز ہاپکنز کی فیکلٹی کے رہائشی زون میں حیدر اور رضوان یوں ایک ہوئے جیسے زمین اور آسمان آپس میں مل گئے ہوں، جیسے چاندنی دور دراز فضاؤں میں بھٹکتی چاند پر واپس لوٹ آئی ہو، جیسے موسم بہار کی پہلی بارش سے کلیاں دھل کر تر و تازہ ہو کر کھل اٹھی ہوں۔

اس شام نہ ڈھول بجے، نہ کوئی مائیوں بیٹھا، نہ رسم مہندی ہوئی، نہ برات چڑھی، نہ کسی مولوی نے نکاح پڑھایا، نہ ڈولی اٹھی، نہ کسی چرچ میں کسی پادری نے ریاست کی طرف سے دیئے گئے اختیار کے تحت رضوان اور حیدر کو وائف اینڈ ہاسبنڈ ڈکلیر کیا لیکن وہ دونوں ایک ہو گئے۔ رضوان اور حیدر بن بیاہے میاں بیوی بن گئے۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک ساتھ رہیں گے۔

حیدر اپنی سائیکل گھر کے اندر لے آئی۔ رضوان نے دوسری غیر مرتب سائیکل کے بارے میں استفسار کیا تو وہ بولی کہ وہ یہ سائیکل اس کے لیے لائی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ وہ دونوں مل کر سائیکلنگ کے لیے جایا کریں۔

رضوان نے محبت بھری نظروں سے حیدر کی طرف دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگا کہ اسے سائیکل چلانی نہیں آتی۔ حیدر نے حیرانی سے استفہامیہ انداز میں رضوان کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سائیکل چلانی نہ جانتا ہو۔ رضوان نے اسے بتایا کہ وہ پاکستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں جمال پور کا رہنے والا ہے جو اتنا چھوٹا ہے کہ وہاں کسی بھی جگہ پیدل چل کر چند منٹوں میں پہنچا جا سکتا ہے اس لیے اسے کبھی سائیکل چلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

" ٹھیک ہے۔ اگر تب سائیکل چلانی نہیں سیکھی تھی تو اب میری خاطر سیکھنی پڑے گی۔ ورنہ ہم اکٹھے سائیکلنگ کے لیے کیسے جائیں گے ؟ "

حیدر نے ملتجیانہ انداز میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"ہاں، ہاں، اب میری سب سے بڑی ترجیح سائیکل چلانی سیکھنا ہے۔ اور پھر زندگی میں تمہارے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے مجھے ہر وہ کام کرنا ہو گا جو تم کہو گی۔" رضوان نے محبت سے حیدر کو جواب دیا۔

"رضوان میں تمہاری بہت ممنون ہوں۔ تم نے مجھے اپنا جیون ساتھی بنالیا ہے۔ میں زندگی میں بہت اکیلی تھی۔ اب میں صرف تمہارے ساتھ رہوں گی۔ پاپا اور ممی اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ بھیا اپنی وائف کے ساتھ اپنے گھر میں رہتے ہیں۔ میں سائیکلنگ کلب کے ساتھیوں کے ساتھ طویل سائیکل ریسوں میں اپنا ٹائم گزارتی ہوں۔ لیکن اب میں زیادہ وقت تمہارے ساتھ گزاروں گی۔ ہم سائیکلنگ کے لیے جائیں گے تو ایک ساتھ۔ زندگی میں جو کچھ بھی کریں گے ایک ساتھ کریں گے۔"

حیدر بولے جارہی تھی۔ لگتا تھا وہ بچپن سے اب تک کی دی گئی امریکی نظام کی تنہائی کے سب دکھ رضوان کی جھولی میں الٹ دینا چاہتی تھی۔ رضوان بھی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ حیدر بول رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ ہر سوسائٹی کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ پاکستان غیر ترقی یافتہ ہے۔ پسماندہ ہے۔ وہاں ایک کمرے میں گھر کے سات افراد اکٹھے سوتے ہیں۔ امریکہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ یہاں مڈل کلاس کے بچوں کو زندگی کی ہر سہولت میسر ہوتی ہے۔ سونے کے لے الگ کمرہ ہوتا ہے۔ کھیلنے کے لیے ڈھیروں کھلونے ہوتے ہیں۔ لیکن تنہائی دھیرے دھیرے ان کی روحوں کو گھائل کرتی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بچپن کی حدود سے نکلتے اور جوانی کی حدود میں داخل ہوتے ہی اپنی تنہائی سے فرار کے لیے کسی بھی اجنبی کی زندگی کا آسانی سے حصہ بن جاتے ہیں۔

حیدر نے اپنی باتیں کرتے کرتے اچانک رضوان سے پوچھا: "جمال پور کیسا ہے۔ اس کے خاندان میں اور کون ہے۔ اور اس کے ممی اور پاپا زندہ رہنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟"

رضوان نے حیدر کا سوال سنا تو بولا:

"جمال پور جنت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ جو ابھی تک جدید تہذیب کی دسترس سے باہر ہے۔ جہاں کسان کے کھیت میں چلانے والے ہل کے پھل اور کنویں کی چال کے علاوہ کسی چیز میں لوہا شامل نہیں۔ ہر چیز مٹی سے بنی ہے یا لکڑی سے۔

جمال پور میں اس کی ایک ماں ہے، ایک باپو ہے، پانچ گدھے ہیں، جن میں سے ایک اس تصویر میں اس کے ساتھ کھڑا ہے۔" اس نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور تمہارے باپو کیا کرتے ہیں؟" حیدر نے رضوان کی سادہ سی زندگی میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"میرا باپو مٹی سے چیزیں بناتا ہے۔ وہ چاک پر مٹی کا بوتا رکھ کر اُسے کوئی بھی شکل دے سکتا ہے۔ لیکن زیادہ تر وہ کھانا پکانے کے لیے، ہنڈیاں، پانی اسٹور کرنے کے لیے گھڑے، آٹا گوندھنے کے لیے کنالیاں اور پانی پینے کے لیے پیالے بناتا ہے۔"

رضوان کا جواب سن کر حیدر کا منہ حیرانی سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"تمہارا باپو تو بہت بڑا آرٹسٹ ہے۔ کیا تم نے بھی اپنے باپو سے مٹی سے یہ سب کچھ بنانا سیکھا ہے؟" حیدر نے پوچھا۔

"نہیں حیدر جان۔ میں صرف بچپن میں باپو کے لیے مٹی کے بوتے بناتا تھا۔ میں نے کبھی چاک پر بوتے رکھ کر انہیں مخصوص شکل دینے کا ہنر نہیں سیکھا۔ کیونکہ میں نے اسکول میں پڑھائی شروع کر دی تھی۔"

"رضوان میں تمہاری جگہ ہوتی تو باپو سے ضرور سیکھتی کہ مٹی کے بوتے کو مختلف شکلیں کیسے دی جاتی ہیں۔" پھر نہ جانے حیدر کو کیا خیال آیا وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی:

"اگر میں پاکستان جاؤں تو کیا تمہارے باپو مجھے مٹی کے بوتے سے یہ ساری چیزیں بنانی سکھانے پر تیار ہو جائیں گے۔"

حیدر کی بات سن کر رضوان کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ پھر مذاقیہ انداز میں بولا:

"یہ پاکستانی ٹیکنالوجی ہے۔ پتہ نہیں وہ امریکہ کو یہ ٹیکنالوجی ٹرانسفر کرنا پسند کریں گے یا نہیں۔"

حیدر کو رضوان کا یہ مذاق پسند آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک والہانہ بوسے سے رضوان کا منہ بند کر دیا۔ پھر بولی اسے بھوک لگ رہی ہے۔ اور وہ کچھ کھانا چاہتی ہے۔ رضوان نے ریفریجریٹر کا دروازہ کھول کر اس میں رکھی کھانے والی سب چیزیں گنوائیں۔

اس نے ہر چیز پر نفی سے سر ہلایا۔ پھر رضوان سے پوچھنے لگی کیا وہ پیزا کھانا پسند کرے گا۔

رضوان کے ہاں کرنے پر اس نے پہلے مقامی راونڈ ٹیبل کو فون پر پیزے کا آرڈر دیا۔ پھر اپنی ممی کو فون کر کے کہنے لگی کہ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ آج کے بعد وہ رضوان کے ساتھ رہے گی۔

رضوان نے بھی آگے بڑھ کر حیدر کو اپنے بازووں میں سمیٹ لیا۔ اسے لگا کہ حیدر نہیں زندگی اس کے بازووں میں سمٹ آئی ہے۔

فصل 24

حیدر کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم ہونے کے بعد رضوان کی زندگی کے شب وروز بدل گئے۔ بچپن سے اب تک، اسکول سے کے ای تک جس طرح اس کی زندگی تعلیمی سرگرمیوں اور وائلن کے گرد گھومتی تھی اب اس میں تبدیلیاں رُونما ہونے لگی تھیں۔

حیدر اگرچہ خاصی سمجھدار لڑکی تھی لیکن اس کے باوجود عام لڑکیوں کی طرح اس کی خواہش تھی کہ رضوان اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارے۔

وہ چاہتی تھی کہ رضوان وقت پر جانز ہاپکنز جائے اور وقت پر گھر واپس آئے جبکہ رضوان کی افتادِ طبع مطالبہ کرتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت تعلیمی ماحول میں گزارے۔ پھر اس نے جانز ہاپکنز میں آنے کے بعد زندگی کے جینیٹک میک اپ کے بارے میں جتنے پیپر لکھے ان سے اس کی کیمپس پر اسٹینڈنگ میں بے حد اضافہ ہوا اور بہت جلد اس نے میڈیسن کے ایک معمولی طالب علم کے برعکس ایک سنجیدہ ریسرچر کا مرتبہ اختیار کر لیا۔ جانز ہاپکنز کے بہترین اساتذہ اس کے ساتھ تبادلہ خیال میں ایک لذت، ایک سرشاری اور ایک روشنی کی جھلک پاتے۔ وہ چاہتے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اس کی معیت میں گزاریں۔

حیدر بہت قابل لڑکی تھی اس کا تعلیمی ریکارڈ بھی بہت شاندار تھا لیکن اسے میڈیکل شعبے میں بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ ہائی اسکول کے بعد کالج میں دو سال صرف کرنے کے بعد اس نے تعلیم کو تقریباً خیرباد کہہ دیا تھا۔

اس کے والد ڈاکٹر تھامسن نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ جان ہاپکنز میں میڈیسن میں داخلہ لے کر ڈاکٹر بنتی یا اگر ڈاکٹر نہیں بننا چاہتی تھی تو واشنگٹن میں جانز ہاپکنز کے پبلک پالیسی ونگ میں داخلہ لے کر پبلک

پالیسی ایکسپرٹ بن جاتی لیکن وہ برس دو برس آزادی سے گھومنا پھرنا چاہتی تھی۔ پہلے اپنا ملک اچھی طرح دیکھنا چاہتی تھی اور پھر دنیا کے باقی ممالک دیکھنا چاہتی تھی۔

سائیکلنگ کے ساتھ اس کی دلچسپی کی وجہ بھی یہی تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ امریکہ میں سفر کرنے کے لیے سستا ترین طریقہ سائیکلنگ تھا۔ سائیکلنگ کلب میں کئی نوجوانوں کی سوچ اس سے ملتی تھی۔ جب بھی ایسٹ کوسٹ پر موسم کھلتا وہ اپنی سائیکلوں پر ٹینٹ اور ضرورت کا بنیادی سامان رکھ کر بالٹی مور سے نکل کھڑے ہوتے۔ اس طرح وہ اپنے سائیکلنگ کلب کے دوستوں کے ہمراہ اب تک بوسٹن سے فلوریڈا تک تقریباً ہر اسٹیٹ کا سفر کر چکی تھی۔

امریکہ اور دنیا دیکھنے کے علاوہ موسیقی اس کی سب سے بڑی محبت تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ رضوان سائیکلنگ سیکھے اور سائیکلنگ کلب کا ممبر بن کر اس کے ساتھ پرندوں کی طرح ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری جگہ اڑتا پھرے۔

حیدر کی خواہش کے برعکس رضوان کی خواہش ڈاکٹر تھامسن سے ملتی جلتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ حیدر جانز ہاپکنز میں داخلہ لے کر ڈاکٹر بنے اور باقی زندگی اس کے ساتھ پاکستان میں ہسپتال اور ریسرچ سنٹر میں گزارے۔

اس مسئلے پر چند دن کی باہمی گفتگو کے بعد ایک دن حیدر اور رضوان ڈاکٹر تھامسن کے گھر گئے۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اپنا ذاتی سامان رضوان کی رہائش گاہ پر منتقل کرے۔

ڈاکٹر اور مسز تھامسن حیدر اور رضوان کو اپنے گھر اکٹھا دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے خوش دلی سے حیدر اور رضوان کے باہمی تعلق کو قبول کیا اور حیدر کے چناؤ کی داد دی۔

رضوان کے ساتھ پہلے تجربے نے انہیں رضوان کا معتقد کر دیا تھا۔ باقی اعتماد انہیں جان ہاپکنز میں رضوان کی تعلیمی استعداد اور ریسرچ سے متعلقہ اس کی سرگرمیوں سے حاصل ہوا۔ وہ نہ صرف اے کلاس وائلنسٹ تھا بلکہ اے کلاس طالب علم اور ریسرچر بھی تھا۔ ایک لحاظ سے وہ حیدر کی تعلیم کے بارے

میں لاابالی پن سے رضوان کے ساتھ اس کے ازدواجی تعلقات قائم ہونے کی وجہ سے آزاد ہو گئے۔ انہیں پوری توقع تھی کہ رضوان کی معیت میں حیدر واپس تعلیم کی طرف لوٹ آئے گی اور کوئی پروفیشنل کیریر اپنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ لیکن جب انہیں پتہ چلا کہ وہ رضوان کے لیے سائیکل خرید لائی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ بھی سائیکلنگ کلب کا ممبر بنے تو انہیں حیدر کے علاوہ رضوان کے بارے میں بھی تھوڑی تشویش ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ رضوان اپنا فوکس اپنی تعلیم، ریسرچ اور وائلن پر برقرار رکھے اور کسی طرح بھی اسے تبدیل نہ ہونے دے۔

باتوں باتوں میں انہوں نے حیدر کی ضرورت سے زیادہ سائیکلنگ پر توجہ اور مزید تعلیم سے عدم دلچسپی کا ذکر کیا تو رضوان نے انہیں یقین دلایا کہ وہ اس بارے بالکل متفکر نہ ہوں۔ اس نے کہا کہ حیدر اسے سائیکلنگ کی طرف مائل کر رہی ہے۔ اور وہ اسے تعلیم کی طرف لوٹنے کی ترغیب دے رہا ہے لیکن تاحال معاملہ جوں کا توں ہے۔ نہ وہ ایجوکیشن چھوڑ کر سائیکلنگ اپنانا چاہتا ہے اور نہ حیدر فی الحال تعلیم کی طرف لوٹنا چاہتی ہے۔

" حیدر بہت لائق لڑکی ہے۔ اگر وہ اپنی تعلیم مکمل کر لے تو بہت اچھی ڈپلومیٹ یا ڈاکٹر ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ سائیکلنگ کے چکر میں اس طرح الجھی ہے کہ اس سے باہر نہیں آنا چاہتی۔" ڈاکٹر تھامسن نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

" آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن اب حیدر کی زندگی آپ سے زیادہ مجھ سے جڑی ہے۔ میں اسے واپس تعلیمی دنیا میں لاؤں گا۔ اگر وہ ڈائیلاگ اور ترغیب سے واپس لوٹ ائی تو ٹھیک ورنہ میری وائلن اسے واپس تعلیمی دنیا میں کھینچ لانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔" رضوان نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ جواب دیا۔

رضوان کے جواب سے ڈاکٹر تھامسن کی پیشانی پر سوالیہ نشان ابھرا۔ وہ رضوان کی بات کچھ سمجھے کچھ نہ سمجھے۔

رضوان نے ڈاکٹر تھامسن کے چہرے پر سوالیہ نشان پڑھا تو کہنے لگا:

"موسیقی اس کائنات کی روح ہے۔ جو اس کائنات کا توازن قائم رکھتی ہے۔ ایک ازلی نغمہ ہے جو موسیقی کی شکل میں پوری کائنات میں جاری وساری ہے۔

اس کائنات میں ہر چیز موسیقی سے متاثر ہوتی ہے۔ کیونکہ موسیقی میں یہ قابلیت ہے کہ یہ کسی بھی چیز کی تہہ میں اتر کر اس کی ماہیت کو تبدیل کر سکتی ہے۔

شجر، حجر، پرندے، جانور، انسان، ندیاں، نالے، دریا، سمندر، چاند، سورج اور ستارے کچھ بھی اس کی نرم ونازک انگلیوں کی دسترس سے باہر نہیں۔

انسانوں میں مَردوں سے زیادہ عورتیں اس کا اثر قبول کرتی ہیں۔" رضوان کا تخلیقی سرچشمہ ابلتے دیکھ کر ڈاکٹر تھامسن نے کہا کہ انہیں رضوان کی کسی بات سے اختلاف نہیں۔ لیزر کی شعاعوں کی طرح موسیقی کی بھی شعاعیں ہوتی ہیں جو ہر چیز میں سے گزرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ لیکن عورتیں اس سے مَردوں سے زیادہ اثر کیوں قبول کرتی ہیں یہ میرے لیے ناقابل فہم ہے۔

رضوان نے ڈاکٹر تھامسن کی بات سنی تو کہنے لگا: " یہ ٹھیک ہے کہ لیزر کی طرح موسیقی کی شعاعیں کائنات کی ہر چیز پر نہ صرف اثر انداز ہوتی ہیں بلکہ ان میں سے گزرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔ لیکن موسیقی کی اس اثر آفرینی میں مطلوبہ عنصر کی فطرتی استعداد بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔

مرد بنیادی طور پر فطرت کی متشدد قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے برعکس عورتیں فطرت کی لطیف ترین قوتوں کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ چنانچہ موسیقی کی اثر انگیزی ان کی فطرت پر زیادہ قوت کے ساتھ وارد ہوتی اور ان کی قلب ماہیت کر دیتی ہے۔"

پہلی ملاقات میں ڈاکٹر تھامسن، مسز تھامسن اور ان کے دوست رضوان کی وائلن نوازی کے مکمل طور پر گرویدہ ہو چکے تھے لیکن آج موسیقی پر ہونے والی گفتگو نے انہیں رضوان کی دانشورانہ صلاحیتوں کا معترف بھی کر دیا تھا۔

رضوان کی باتیں سن کر انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔ انہیں اعتماد تھا کہ رضوان کی صحبت سے حیدر آزادہ روی کی روش ترک کر کے تعلیمی ماحول میں واپس لوٹ آئے گی۔

انہیں اس بات کی فکر نہیں تھی کہ حیدر کا رضوان کے ساتھ رشتہ کب تک چلتا ہے لیکن وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ حیدر عملی زندگی کے لیے مکمل طور پر تیار ہو جائے۔ سارا امریکہ پروفیشنلزم سے وابستہ تھا۔ سب لوگ پرافیشنل تھے یا غیر پرافیشنل۔ پرافیشنل لوگ زیادہ کامیاب زندگی گزارتے ہیں جبکہ غیر پروفیشنل لوگ زندگی کی نچلی سطحوں پر امدادی فورس کا حصہ بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور تنگدستی سے زندگی گزارتے ہیں۔

ازدواجی تعلق کے حوالے سے بھی انہیں حیدر کے بارے میں کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ ان کی جنریشن ازدواجی تعلقات کے بارے میں زیادہ مستقل مزاجی کی قائل تھی۔

ان کی جنریشن میں شادی کی طوالت کا دوستوں میں فخریہ ذکر کیا جاتا تھا۔ لیکن نئی امریکی نسل کے لیے ازدواجی تعلقات میں استحکام ایک غیر ضروری عنصر تھا۔

تاہم ان کی نسل کے افراد اب بھی بچوں کے پروفیشنلزم کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے ڈاکٹر تھامسن اور ان کی اہلیہ مسز تھامسن چاہتی تھیں کہ حیدر دوبارہ تعلیمی دھارے میں شامل ہو جائے۔ باقی حیدر کو اس کے ہائی اسکول اور کالج کے اچھے ریکارڈ کی وجہ سے جانز ہاپکنز کے ڈپلومیسی یا میڈیکل اسکول میں داخل ہونے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں تھا۔

حیدر اپنا ذاتی سامان سمیٹ کر واپس رضوان کی رہائش گاہ پر جانے کے لیے تیار ہوئی تو ڈاکٹر تھامسن نے رضوان سے کہا کہ وہ ان کے لیے اور حیدر کے لیے وائلن بجائے۔

ڈاکٹر تھامسن کی فرمائش حیدر کو بھی اچھی لگی۔ اس نے بھی مچلتے ہوئے رضوان سے کہا کہ وہ ان کے لیے وائلن بجائے۔

رضوان نے محبت بھری نظروں سے حیدر کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگا کہ وہ حیدر کے لیے وائلن نہیں بجا سکتا کیونکہ اس کی خوبصورتی اسے وائلن پر متوجہ نہیں ہونے دیتی لیکن وہ ڈاکٹر اور مسز تھامسن کے لے ضرور وائلن بجائے گا۔

یہ کہہ کر اس نے وائلن بائیں کندھے پر رکھی اور بائیں ہاتھ کی انگلیاں وائلن پر درست کیں اور دائیں ہاتھ سے باو وائلن پر رکھ کر اسے دھیرے دھیرے حرکت دینا شروع کی۔

جیسے جیسے وائلن پر باو کی حرکت تیز ہوتی چلی گئی ڈاکٹر تھامسن، مسز تھامسن اور حیدر کی حالت غیر ہونا شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر تھامسن اور مسز تھامسن آنکھیں بند کر کے بے سدھ ہو کر قالین پر لیٹ گئے جبکہ حیدر اپنی حقیقت سے لاتعلق ہو کر آنکھیں بند کر کے ڈانس کرنا شروع ہو گئی۔

رضوان کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ وائلن بجاتا رہا۔ ڈاکٹر اور مسز تھامسن آنکھیں بند کئے قالین پر لوٹتے رہے جبکہ حیدر مسلسل ڈانس کرتی رہی۔ آہستہ آہستہ رضوان نے وائلن کی سریں دھیمی کیں تو حیدر ڈانس کرتے کرتے جنگل میں بھٹکی ہرنی کی طرح ممیانے لگی:

تنہائی کا یہ جنگل
خوف اور بے یقینی کے درختوں
میں گم ہوتے یہ راستے
میری منزل کہاں ہے؟
میں نہیں جانتی
مغربی ساحل سے لے کر
مشرقی ساحل تک پھیلی یہ سرزمیں
کبھی میری تھی
اب کس کی ہے میں نہیں جانتی

یہ ستاروں بھرا
سرخ اور نیلا پرچم
کن ہواؤں کے ہاتھوں میں ہے یرغمال
میں نہیں جانتی۔
تنہائی کا یہ جنگل
خوف اور بے یقینی کے درختوں
میں گم ہوتے یہ راستے
میری منزل کہاں ہے
میں نہیں جانتی

رضوان نے وائلن روکی تو حیدر گاتے گاتے دھاڑیں مار کر رونا شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر اور مسز تھامسن نے آنکھیں کھولیں تو حیدر کو روتے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ لیکن رضوان نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں منع کیا کہ وہ اسے تنہا چھوڑ دیں۔

وہ رولے گی تو اس کے تحت الشعور میں چھپے سب منفی جذبے صاف ہو جائیں گے۔ اس طرح وہ حقیقی دنیا کے ساتھ زیادہ صحت مند رشتہ قائم کر سکے گی۔

ہم سب کو اپنی زندگیوں میں ایسے لمحوں کی ضرورت ہوتی ہے جب ہم اپنے آپ سے رابطہ قائم کر سکیں۔ جب اپنے ساتھ ہمارا رابطہ قائم ہو جاتا ہے تو حقیقی دنیا کے ساتھ بہتر رشتہ قائم کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر تھامسن نے رضوان کو تشکرانہ نظروں سے دیکھا اور پھر کہنے لگے "رضوان امریکہ بہت خوش قسمت ملک ہے جہاں دنیا بھر سے تم جیسے ذہین لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔" امریکہ انہیں جو کچھ دیتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ امریکہ کو دے جاتے ہیں۔ پھر کنے لگے رضوان حیدر کی حالت ٹھیک ہوتی ہے تو جانے سے پہلے ڈنر ضرور کر کے جانا۔ رضوان نے مثبت انداز میں سر ہلا کر ڈاکٹر تھامسن سے اتفاق کیا۔

فصل 25

حیدر اپنے روحانی سفر سے واپس لوٹی تو اس کی مکمل ٹرانسفارمیشن ہو چکی تھی۔ اس نے باتھ روم میں جا کر اپنے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور پھر تولیے سے منہ صاف کر کے ڈنر ٹیبل پر آ بیٹھی۔ رضوان اور ڈاکٹر اور مسز تھامس پہلے سے ڈنر ٹیبل پر بیٹھے اس کے منتظر تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھی خاموشی سے رضوان کی طرف محویت سے دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔

وہ دل ہی دل میں رضوان سے کہہ رہی تھی رضوان تم نے یہ میرے ساتھ کیا کیا ہے اور کیوں کیا ہے؟ میں تو ایک آزاد چڑیا تھی اور آزاد چڑیا رہنا چاہتی تھی۔ میں تو امریکہ کے مشرقی ساحل سے مغربی ساحل تک سائیکل پر سفر کرنا چاہتی تھی۔

پنسلوانیا، اوہایو، میسوری، الیانوائے، وائیامنگ، نیواڈا اور کیلیفورنیا کی سڑکوں پر اپنے دوستوں کے ساتھ سائیکل چلاتے ہوئے گروپ کی شکل میں گانا چاہتی تھی: دس لینڈ از مائی لینڈ۔ دس لینڈ از یور لینڈ۔ فرام کیلیفورنیا ٹو نیویارک آئی لینڈ۔

لیکن اب میں سائیکل نہیں چلاؤں گی۔ اب میں جانز ہاپکنز جاؤں گی۔ تم وہاں میڈیکل کی تعلیم مکمل کرنا میں پبلک پالیسی میں ماسٹرز کروں گی۔ تمہاری میڈیکل ڈگری سے پہلے میری پبلک پالیسی میں ڈگری مکمل ہو جائے گی اور پھر میں تمہارے ساتھ تمہاری کبوتری بن کر کھلے آسمانوں میں اڑوں گی۔

ڈاکٹر اور مسز تھامسن کو لگا کہ ان کے سامنے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی لڑکی ان کی بیٹی حیدر نہیں کوئی اور لڑکی ہے۔ وہ اس لڑکی کو حیدر کی حیثیت سے جانتے ضرور ہیں لیکن وہ ان کی حیدر نہیں۔ انہیں وہ کھلنڈری اور شوخ وشنگ حیدر اچھی لگتی تھی لیکں اس حیدر پر انہیں بہت پیار آیا۔ یہ حیدر انہں پہلی حیدر سے زیادہ خوبصورت لگی۔

ابھی ساری فیملی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھی کہ حیدر کا بھائی راجر اپنی بیوی جولی کے ساتھ وہاں آپہنچا۔
راجر اور جولی نے ڈاکٹر تھامسن، مسز تھامسن، حیدر اور رضوان کو خوش دلی سے گڈ ایوننگ کہا۔ سوائے حیدر کے سب نے اسی خوش دلی کے ساتھ انہیں جواب دیا۔
حیدر ابھی تک کھوئی کھوئی بیٹھی تھی۔ راجر نے حیدر کو چھیڑتے ہوئے کہا:
"سس کیا بات ہے۔ رضوان سے ملاقات کے بعد تم اپنے بھائی کی گڈ ایوننگ کا جواب بھی نہیں دینا چاہتی۔"
راجر کی بیوی جولی نے بھی اپنی نند کو تنگ کرنے کے لیے حیدر پر فقرہ کسا:
"حیدر کو رضوان سے اتنی محبت ہے کہ وہ اس محبت میں کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہتی۔"
مسز تھامسن نے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ راجر اور جولی کو اشاروں کنایوں میں سمجھایا کہ وہ اسے تنہا چھوڑ دیں۔ اور اسے تنگ نہ کریں۔
حیدر نے ممونیت سے ماں کی طرف دیکھا اور پھر رضوان سے کہنے لگی کہ اسے کچھ کھانے پینے کی طلب نہیں اور وہ اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہے۔
رضوان بلا چون وچرا حیدر کے حکم پر اپنی جگہ سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔
حیدر نے اپنا ذاتی سامان چند ڈبوں میں ڈال رکھا تھا۔ رضوان نے حیدر کے ساتھ وہ سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھا۔ اور پھر دونوں فیملی کو گڈ نائٹ کہہ کر اپنے گھر آ گئے۔
گھر کے اندر داخل ہوتے ہی حیدر رضوان کی گدھے کے ساتھ تصویر کے سامنے کھڑی ہو کر کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ پھر رضوان کے گلے میں باہیں ڈال کر اس کے سینے میں سر چھپاتے ہوئے بولی:
"رضوان تمہارا شکریہ۔"
"کس چیز کے لیے۔" رضوان نے پوچھا۔

"مجھے مکمل کرنے کے لیے۔ میں تمہارے بغیر ادھوری تھی۔ مجھے اپنی زندگی میں سب کچھ ہونے کے باوجود ایک ادھورے پن کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن جس لمحے تم نے مجھے اپنایا مجھے لگا میں مکمل ہو گئی ہوں۔ میری تمام کمیاں پوری ہو گئی ہیں۔

آج مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری زندگی تمہاری زندگی سے جڑی ہے۔ اب تم میرا حصہ ہو اور میں تمہارا۔ اب میرے لیے تم سے جدائی کا تصور بھی محال ہے۔

آج پہلی بار مجھے اپنے پاپا اور ممی کے گھر میں محسوس ہوا کہ وہ گھر میرا نہیں۔ اب تمہارا گھر میرا گھر ہے۔ جہاں رکھوگے رہوں گی۔ جو کہوگے کروں گی۔ جہاں لے جاؤگے جاؤں گی۔"

رضوان نے حیدر کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنے سینے سے اٹھا کر اس کے ہونٹ اپنے ہونٹوں سے بند کر دیے۔ پھر اسے کہنے لگا:

"حیدر میرے احساسات بھی تمہارے احساسات سے مختلف نہیں۔ میں بھی تمہارے بغیر نامکمل تھا۔ تم نے مجھے اپنی زندگی میں شامل کر کے مکمل کیا ہے۔ تم میری طاقت ہو، میرا سکون ہو، زندگی میں میری کامیابیوں کی ضمانت ہو۔

میری زندگی تمہارے بغیر بے معنی ہے۔ تم ہو تو سب کچھ ہے۔ تم نہیں تو کچھ بھی نہیں۔"

رضوان کی گفتگو سن کر حیدر ایک والہانہ پن سے رضوان کے جسم کو چومنے لگی۔ حیدر کے ہونٹوں کے لمس سے رضوان کے اندر زندگی کی برقی رو شراروں میں ڈھلنے لگی تو وہ اسے اپنے بازوں میں اٹھا کر خواب گاہ میں لے گیا۔

زمین اور آسمان ایک ہوئے

چاند اور سورج ایک ہوئے

حیدر اور رضوان ایک ہوئے

زندگی مسکرا اٹھی۔ شگوفے پھول بنے اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے ساری فضا مہک اٹھی۔

انسانی وجود، چاہے مرد ہو یا عورت، فطرت کا شاہکار ہے۔ مٹی کے کرشموں میں سے بہترین کرشمہ۔ مٹی چاہے بھی تو انسانی وجود سے بہتر شکل اختیار نہیں کر سکتی۔

زندگی ایک سیڑھی ہے جس پر مٹی قدم بقدم اوپر اٹھتی ہے یہاں تک کہ سب سے اوپر والی سیڑھی پر پہنچ کر انسانی وجود میں ڈھل جاتی ہے۔ یہاں بیٹھ کر مٹی کائنات کے ساتھ مکالمہ کرتی ہے۔ سمندروں کی تہہ میں اترتی ہے۔ ستاروں پر کمند ڈالتی ہے۔ کائنات کے نامعلوم گوشوں کی سراغرسانی کرتی ہے۔ فرشتوں کے حمدیہ گیت سنتی ہے۔ خدا کے چہرے پر ابھرنے اور مٹنے والی خوشی اور غم کی لکیروں کا مشاہدہ کرتی ہے۔

اس رات حیدر نے رضوان اور رضوان نے حیدر پر مٹی میں چھپی لذتوں کی اس طرح بارش کی کہ دونوں جل تھل ہو گئے۔

اگلی صبح بیدار ہوئے تو حیدر اور رضوان دونوں کو اپنے اپنے وجود میں ایک ہلکے پن اور لطافت کا احساس ہو رہا تھا۔

رضوان کلاس لینے کے لیے جانز ہاپکنز جانے کے لیے تیار ہوا تو حیدر بھی جانز ہاپکنز جانے کے لیے تیار تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ ایڈمشن آفس جا کر پبلک پالیسی میں ڈگری حاصل کرنے کے لیے داخلے کی درخواست جمع کرائے۔ تاکہ ممکن ہو تو رواں سال کی کلاس کا حصہ بن جائے۔

رضوان حیدر کی کایا پلٹ پر بہت خوش تھا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ حیدر نے اپنی سائیکل گیراج کی دیوار کے ساتھ بنی کیبنٹ پر رکھ کر دیوار پر نصب ایک کیل پر لٹکا دی تھی۔ ساتھ ہی ہلمٹ ایک اور کیل پر لٹکا تھا۔

رضوان نے حیدر کی سائیکل اس طرح گیراج میں کیبنٹ پر رکھی دیکھی تو شرارتاً حیدر سے بولا:

"حیدر جان آج دن بہت خوشگوار اور چمک دار ہے۔ کیا سائیکلنگ کے لیے نہیں جاؤ گی؟" رضوان کے

انداز سے حیدر جان گئی کہ وہ اس کے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔

وہ بھی اسی طرح پُر تفنن لہجے میں بولی:

"رضوان جان سائیکلنگ کے لیے ضرور جاؤں گی۔ کسی ایسے ہی خوشگوار اور چمکدار دن، لیکن پبلک پالیسی میں ڈگری مکمل کرنے کے بعد اور تمہیں ساتھ لے کر۔"

پھر وہ دونوں مسکراتے ہوئے گھر سے نکل کر تھوڑی دیر میں جانز ہاپکنز پہنچ گئے۔

حیدر نے پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک کی تو اسے ڈاکٹر تھامسن اسٹاف کے کار پارکنگ ایریا میں اپنی گاڑی پارک کرتے نظر آئے۔

اس سے پہلے کہ وہ گاڑی پارک کر کے اپنے شعبے کے طرف جاتے حیدر اور رضوان تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے اُن کے پاس پہنچ گئے۔

حیدر آگے بڑھ کر اسی طرح ڈاکٹر تھامسن سے بغلگیر ہو گئی جیسے بچپن میں ہوتی تھی۔ پھر بولی:

"ڈیڈی میں بہت خوش ہوں۔ رضوان بہت اچھا ہے۔ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔"

حیدر کو اس طرح خوش ہوتے دیکھ کر ڈاکٹر تھامسن کی آنکھیں تر ہو گیں۔ انہوں نے پوچھا وہ اتنے دن چڑھے وہاں کیا کر رہی ہے۔ ان کا خیال تھا وہ رضوان کو اسکول چھوڑنے آئی ہے۔ لیکن جب حیدر نے انہیں بتایا کہ وہ پبلک پالیسی میں داخلہ لینے ایڈمشن آفس جا رہی ہے تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

انہوں نے پوچھا وہ کب اسکول جائن کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ جب اس نے انہیں بتایا کہ وہ رواں سال کی کلاس کا حصہ بننے کی خواہش مند ہے تو ڈاکٹر تھامسن خوشی سے کھل اٹھے۔ انہوں نے کہا وہ اپنے آفس پہنچ کر رجسٹرار کو فون کریں گے اور اس سے درخواست کریں گے کہ وہ تمہیں رواں سال کی کلاس کا حصہ بننے کی اجازت دے دیں۔

پھر رضوان سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ "رضوان میرے پاس الفاظ نہیں جن سے میں تمہارا شکریہ ادا کر سکوں۔ تم نے وہ کام سر انجام دیا ہے جس کے بارے میں میں تقریباً ناامید ہو چکا تھا۔"

رضوان نے ڈاکٹر تھامسن کو جواب دیا کہ اس نے ان پر کوئی احسان نہیں کیا۔ حیدر اس سے محبت کرتی ہے اور وہ حیدر سے۔ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ حیدر کے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے ہر ممکن قدم اُٹھائے۔

پھر حیدر، رضوان، اور ڈاکٹر تھامسن نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ حیدر ایڈمشن آفس کی طرف چل دی جبکہ رضوان اور ڈاکٹر تھامسن اپنے اپنے شعبوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

فصل 26

اگلی بہار کی آمد پر شاخوں پر شگوفے پھوٹے تو حیدر کو اپنے وجود کے اندر پلتے ایک اور وجود کی دنیا میں آمد کی تیاری بھی کرنی پڑی۔ چنانچہ اس نے جانز ہاپکنز سے ڈیڑھ ماہ کی رخصت حاصل کی اور دنیا میں آنے والی نئی مہمان کے لیے ضروری اشیا کی خرید میں مصروف ہو گئی۔ رضوان کے ساتھ منتقل ہونے کے چند ہفتوں بعد حیدر کو احساس ہوا کہ وہ رضوان کے بچے کی ماں بننے جا رہی ہے۔

حیدر کو حاملہ ہوئے چند ماہ گزرے تھے کہ ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ وہ ایک عدد بیٹی کو جنم دینے جا رہی ہے۔ حیدر اور رضوان دونوں اس خبر سے بہت خوش تھے۔ دونوں میں کئی دنوں سے بحث چل رہی تھی کہ بیٹی ہونی چاہیے یا بیٹا۔ حیدر چاہتی تھی کہ بیٹا ہو جو بالکل رضوان کی طرح دکھے۔ رضوان چاہتا تھا کہ بیٹی ہو جو ہو بہو حیدر کی شبیہ ہو۔

ڈاکٹر نے بیٹی کی آمد کی نوید سنا کر دونوں کی بحث ختم کر دی۔ اب وہ دونوں نئی مہمان کی آمد سے پہلے گھر کو اس کی متوقع ضروریات کے مطابق اشیا سے بھر رہے تھے۔

اس کوشش میں ڈاکٹر تھامسن اور مسز تھامسن بھی حیدر اور رضوان سے پیچھے نہیں تھے۔ ان کے بیٹے راجر کی شادی کو کئی سال ہو چکے تھے لیکن اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ حیدر کے ہاں بیٹی کی پیدائش کی خبر سے وہ بھی باؤلے ہوئے جا رہے تھے۔

وہ ہر شام بغل میں ایک پیکیج دبائے حیدر اور رضوان کے ہاں چلے آتے اور پھر رات گئے وہیں ان کے ساتھ وقت گزارتے۔

ہر روز بچوں کی پیدائش اور نشوونما سے لیکر پاکستان اور امریکہ کی سیاست پر گفتگو چلتی۔ مڈل ایسٹ میں تبدیل ہوتی صورت حال پر تبصرہ ہوتا۔ یورپ کے حالات زیر بحث آتے۔ ڈاکٹر تھامسن

رضوان کی معلومات پر حیرت کا اظہار کرتے۔ انہیں تعجب تھا کہ کس طرح پاکستان جیسے پسماندہ ملک کے ایک دور دراز گاؤں میں پیدا ہونے اور پروان چڑھنے والا رضوان نہ صرف ایک زبردست وائلنسٹ ہے بلکہ ہمعصر دنیا کے بارے میں بھی مکمل معلومات رکھتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں حیدر کے انتخاب پر فخر محسوس کرتے اور خوش ہوتے۔

ایک شام حیدر نقاہت کی وجہ سے اپنے کمرے میں لیٹی تھی اور رضوان ڈاکٹر تھامسن اور مسز تھامسن کے ساتھ پچھلے لان میں بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا۔

ڈاکٹر تھامسن نے رضوان کو پوچھا کہ وہ کس طرح وائلن کی دھنوں کی مدد سے انسانوں کے ذہنی رجحانات کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

رضوان نے کہا یہ بہت سادہ سا مسئلہ ہے۔ یہ بات عیاں ہے کہ انسان میوزک سنتے ہیں تو ان پر خوشی یا غم کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، وہ شانت ہو جاتے ہیں یا ان کا دل جوش و جذبے سے بھر جاتا ہے اور ان کے قدم خود بخود میوزک کی دھنوں کے ساتھ تھرکنے لگتے ہیں اور وہ رقص کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

یہ میوزک کا صرف سطحی اثر ہے۔ لیکن میوزک زندگی کی مختلف شکلوں پر جن میں انسان بھی شامل ہیں بہت گہرے اثرات مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

یہ چیز صرف وائلن تک محدود نہیں کوئی بھی انسٹرومینٹ یہ معجزہ سرانجام دے سکتا ہے۔ لیکن انسٹرومینٹ کی تاثریت کا دارومدار انسٹرومینٹ بجانے والے کی استعداد پر ہوتا ہے۔ اگر انسٹرومینٹ بجانے والا ظاہری سطح سے اوپر اٹھ سکے تو وہ زندگی کی بنیادی شکلوں کی ماہیت، نوعیت اور فطرت میں تبدیلی کر سکتا ہے۔

پھر اس نے اپنی بات کی وضاحت کے لیے ڈاکٹر تھامسن سے پوچھا کیا انہوں نے کبھی لیزر کی مدد سے دھاتوں کو کاٹنے کے عمل کا مشاہدہ کیا ہے۔

ڈاکٹر تھامسن نے کہا یہ ٹیکنالوجی عام ہے۔ کسی بھی میٹل شاپ میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ہر روز

ہزاروں میٹل ورکرز مختلف دھاتوں کی لیزر شعاعوں کی مدد سے کٹائی کرتے ہیں۔

رضوان نے کہا جس طرح لیزر شعاعوں کی مدد سے دھاتوں کی کٹائی ہوتی ہے اسی طرح میوزک سے ڈی این ایز کے کوڈز میں ردوبدل کیا جاسکتا ہے۔

زندگی کی ہر شکل اپنے ڈی این ایز میں لکھے پروگرام کے مطابق رونما ہوتی اور کام کرتی ہے۔ اگر ڈی ای ایز کے کوڈز کو تبدیل کر دیا جائے تو نہ صرف اس کی شکل وصورت میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے بلکہ ان کے فنکشنز کو بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ ان کی استعداد میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔ اور ان کی زندگی کو کم وبیش کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ کام موسیقی کی دھنوں سے ہو سکتا ہے کیونکہ موسیقی کائناتی زبان ہے جس کے ذریعے زندگی کی تمام اقسام ایک دوسرے سے کے ساتھ پیغامات کی ترسیل کرسکتی ہیں۔ چنانچہ موسیقی کی ظاہری سطح سے اوپر اٹھنے والے فن کار فطرت کے کسی بھی مظہر پر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔

ڈاکٹر تھامسن حیرت سے رضوان کی گفتگو سن رہے تھے۔ ان پر رضوان کی گفتگو سے موسیقی کے نئے پہلو سامنے آرہے تھے۔ وہ خود بھی وائلنسٹ تھے اور وائلن کی سینکڑوں دھنوں پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا۔ لیکن رضوان کی وائلن جیسا اثر انہوں نے کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔

مسز تھامسن بھی پوری توجہ سے ڈاکٹر تھامسن اور رضوان کی باہمی گفتگو سن رہی تھیں۔ انہوں نے رضوان سے پوچھا کہ اس نے وائلن میں ایسی استعداد کیسے پیدا کی ہے؟

رضوان نے کہا اس نے بچپن میں اپنے سکول کے موسیقی کے استاد سے وائلن کو بائیں کندھے پر درست کرنا، بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو وائلن کے تاروں پر درست کرنا اور دائیں ہاتھ سے باؤ کو وائلن کے تاروں پر مناسب انداز میں حرکت دینا سیکھا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے استاد کی بات پلے باندھ لی تھی کہ فن کا کوئی انت نہیں۔ جس طرح آسمان کے ستاروں کی گنتی نہیں کی جاسکتی اسی طرح وائلن کی دھنوں کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ جتنے کائنات کے ذرے ہیں اور ذروں کی جتنی شکلیں ہیں وائلن کی بھی اتنی دھنیں اور اتنی ہی شکلیں ہیں۔

تب سے اب تک ہر رات تاروں کے نیچے کھڑے ہو کر میں وائلن بجاتا ہوں۔ نہ آسمان کے تاروں کا شمار ختم ہوتا ہے نہ میری وائلن کی دھنیں ختم ہوتی ہیں۔

انسانوں کے لیے میرا وائلن بجانا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے جبکہ فطرت اور فطرتی مظاہر کے لیے میں ہر رات وائلن بجاتا ہوں۔

چاند، سورج، ستارے، ندیاں، نالے، پہاڑ، شجر، حجر، چرندے، پرندے، درندے سب میری وائلن سنتے ہیں۔ مجھے داد دیتے ہیں۔ میرے ساتھ ہم کلام ہوتے ہیں۔ مجھ سے فرمائش کرتے ہیں کہ میں ان کے لیے وائلن بجاؤں۔

رضوان، ڈاکٹر تھامسن اور مسز تھامسن کی یہ گفتگو چل رہی تھی کہ ہوا میں خنکی بڑھنے لگی۔ وہ تینوں لان سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ رضوان نے ڈاکٹر تھامسن اور مسز تھامسن سے ڈنر کے لیے پوچھا۔ ان کے اثباتیہ جواب پر اس نے انہیں پوچھا کہ وہ ڈنر میں کیا کھانا پسند کریں گے۔

وہ ابھی ڈنر کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ حیدر کمرے سے اٹھ کر ان کے درمیان آ بیٹھی۔

رضوان نے اسے بتایا کہ وہ ڈنر کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ پھر اس نے حیدر سے پوچھا وہ کیا کھانا پسند کرے گی۔ حیدر نے کہا اس نے بہت دنوں سے اسپگیٹیز نہیں کھائی۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اسپگیٹیز کھائے۔ رضوان نے کہا کہ وہ بیٹھ کر باتیں کریں اور اسے پندرہ منٹ دیں وہ اسپگیٹیز بنا کر پیش کرے گا۔

مسٹر تھامسن، مسز تھامسن اور حیدر گھر میں نئی آنے والی مہمان کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ رضوان نے ڈنر ٹیبل پر سلاد، تازہ بنی اسپگیٹیز اور ریڈ وائن لا کر رکھی اور پھر سب کو کھانے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر تھامسن، مسز تھامسن اور حیدر نے پلیٹ میں سلاد اور اسپگیٹیز ڈالیں تو ڈاکٹر تھامسن کا خیال تھا کہ رضوان کو اسپگیٹیز بنانی نہیں آتی ہوں گی لیکن پہلے نوالے کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ رضوان جتنی اچھی وائلن بجاتا ہے اتنی اچھی اطالوی خوراک بھی تیار کر سکتا ہے۔ مسز تھامسن نے تو باقاعدہ

رضوان سے پوچھا کہ اس نے میٹ بال میں اندر تک مصالحے کے رچاو کے لیے کیا کیا ہے۔ کیونکہ عام طور پر اسپگیٹیز بنانے والے میٹ بالز کے اندر تک مصالحہ رچانے سے قاصر رہتے ہیں جس سے میٹ بالز کا ذائقہ کھِل نہیں پاتا۔

حیدر نے ڈاکٹر تھامسن اور مسز تھامسن کو رضوان کی پکائی ہوئی اسپگیٹیز کی تعریف کرتے سنا تو کہنے لگی کہ ابھی آپ رضوان کی تیار کردہ اسپگیٹیز کی اتنی تعریف کر رہے ہیں اگر کبھی آپ کو اس کے بنائے پاکستانی کھانے کھانے کا اتفاق ہوا تو آپ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔

ڈاکٹر تھامسن نے پاکستانی کھانوں کے بارے میں سنا تو کہنے لگے پاکستانی کھانے ذائقے میں بہت مزیدار ہوتے ہیں لیکن انہیں کھانے کے کئی گھنٹے بعد تک انسان کے لیے سوشل رہنا ممکن نہیں رہتا۔

حیدر نے ڈاکٹر تھامسن کی بات سن کر کہا کہ انہیں پاکستانی کھانے کھانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ریستورانوں میں زیادہ تر کھانے فروزن ہوتے ہیں جنہیں گرم کر کے گاہکوں کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے لیکن تازہ پکے کھانوں کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔

رضوان نے ڈاکٹر تھامسن اور حیدر کی دلچسپ گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ وہ مونا کی پیدائش کے بعد گرینڈ پارٹی رکھے گا اور اس میں پاکستانی کھانے خود بنا کر مہمانوں کے سامنے پیش کرے گا۔

حیدر اور رضوان نے اپنی متوقع بیٹی کا نام موناحیدر رضوان رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ حیدر چاہتی تھی کہ ان کی بیٹی کا نام امریکی ہو۔ رضوان چاہتا تھا کہ اسے پاکستانی نام دیا جائے۔ پھر دونوں میں اس بات پر اتفاق ہوا تھا کہ مونا ایک ایسا نام ہے جو نہ صرف امریکہ اور پاکستان میں استعمال ہوتا ہے بلکہ کئی اور کلچروں میں بھی لڑکیوں کو یہ نام دیا جاتا ہے۔ مونا کے ساتھ حیدر اور رضوان کا اضافہ تینوں ناموں کو ایک نام میں اکٹھا کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر تھامسن اور مسز تھامسن نے حیدر اور رضوان کی متوقع بیٹی کے لیئے مونا نام پسند کیا۔ بلکہ ڈاکٹر

تھامسن نے مونا کے حوالے سے لیونارڈو نچی کی مونالیزا کے بارے میں کہا کہ اس نے مونا نام کو پوری دنیا میں اس طرح متعارف کروادیا ہے کہ کسی کو یہ نام سن کر اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ نام سننے والوں پر مونالیزا کی مسکراہٹ کی طرح ایک خوشگوار اثر چھوڑ جاتا ہے۔

حیدر اور رضوان نے ڈاکٹر تھامسن کی بات سنی تو کہنے لگے کہ جب وہ اپنی پیدا ہونے والی بیٹی کے لیے نام کے بارے میں غور و خوض کر رہے تھا تو لیونارڈو نچی کی مونالیزا یقیناً ان کے ذہن میں نہیں تھی۔ لیکن اس کا نام سن کر انہیں اطمینان ہوا ہے کہ ان کی بیٹی کو دنیا کے کسی ملک میں اپنا نام بتانے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

مسز تھامسن نے حیدر اور رضوان کی بات سنی تو انہیں تنگ کرنے کے لیے کہنے لگیں مونا تو ٹھیک ہے لیکن حیدر اور رضوان کا کیا بنے گا۔ لیکن حیدر اور رضوان صرف امریکہ اور پاکستان تک محدود رہیں گے۔

مسز تھامسن کی بات پر ڈاکٹر تھامسن نے گنگنانا شروع کر دیا:

"موناحیدر رضوان۔

اے ٹرپ ٹو پاکستان۔

مسز تھامسن، حیدر اور رضوان نے بھی اپنی آواز ڈاکٹر تھامسن کے ساتھ شامل کر دی۔

"موناحیدر رضوان

اے ٹرپ ٹو پاکستان"

ابھی انہوں نے 'اے ٹرپ ٹو پاکستان" نہیں کہا تھا کہ حیدر لیبر میں چلی گئی۔

وہ سب اسے گاڑی میں ڈال کر جانز ہاپکنز کے میٹرنٹی وارڈ میں لے گئے جہاں حیدر نے چند گھنٹوں بعد خوبصورت نقوش کی مالک صحت مند موناحیدر رضوان کو جنم دیا۔

رضوان پہلے ہی میٹرنٹی روم میں حیدر کے ساتھ تھا۔ ڈاکٹر کا اشارہ پاتے ہی ڈاکٹر تھامسن اور مسز تھامسن بھی میٹرنٹی روم میں چلے آئے ۔ ڈاکٹر تھامسن نے ننھی منی مونا کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر اس کا ماتھا چوما اور پھر سب نے مل کر آواز لگائی:

"مونا حیدر رضوان

اے ٹرپ ٹو پاکستان

ود گرینڈ ممی اینڈ ڈیڈی

ود حیدر اینڈ رضوان۔"

ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر اور نرس نے بھی ان کی آواز میں آواز ملائی:

"مونا حیدر رضوان۔"

فصل 27

ادھر مونا تیسرے سال میں داخل ہوئی ادھر حیدر اور رضوان نے جانز ہاپکنز میں اپنی اپنی ڈگریاں مکمل کیں۔

حیدر نے پبلک پالیسی میں ماسٹرز کیا جبکہ رضوان نے ایم ڈی کے لیے جانز ہاپکنز میں ہاؤس جاب ختم کیا اور پھر وہیں ریسرچ سنٹر میں ڈی این اے پر مزید ریسرچ کے لیے مصروف ہو گیا۔

ڈی این اے ریسرچ پر اس کے کئی پیپرز امریکہ اور یورپ کے اہم میڈیکل پرچوں میں شائع ہوئے جس کی وجہ سے اسے پوری دنیا میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔

امریکی حکومت نے اسے غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے امریکی شہریت کی پیشکش کی لیکن اس نے پاکستان کی شہریت ترک کرنے سے انکار کر دیا۔

اس نے کہا اس کی زندگی جمال پور سے شروع ہوئی تھی اور جمال پور ہی میں ختم ہو گی۔ امریکہ آنا، جانز ہاپکنز سے ڈگری حاصل کرنا، وقت کی ضرورت تھی۔ اب اس کی ضرورت پوری ہو چکی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ وہ جلد سے جلد پاکستان واپس جائے۔

پاکستان میں سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ بھی ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ڈاکٹر بن چکی تھیں۔ وہ یو ایس اے میں رضوان سے مکمل رابطے میں تھیں اور اس سے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں راہنمائی حاصل کرتی رہتی تھیں۔ ان چاروں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ شادی نہیں کریں گی اور باقی عمر رضوان کے ساتھ اس کے مستقبل کے منصوبوں میں ہاتھ بٹائیں گی۔

رضوان نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ جمال پور میں ایک ہسپتال قائم کریں جہاں پاکستان میں لاعلاج سمجھی جانے والی بیماریوں کے علاج کا سلسلہ شروع کریں۔ ہسپتال کے ساتھ ایک ریسرچ سنٹر قائم کریں جہاں ان بیماریوں کے بارے میں ریسرچ کی جائے۔

رضوان نے کہا کہ ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کے قیام کے لیے اتنی زمین حاصل کریں جہاں ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کے ارد گرد فطرتی ماحول قائم رکھنے کے لیے خاصی جگہ چھوڑی جا سکے۔

سمیرا سے فون پر بات کرتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ جمال پور میں چوہدری نثار سے مل لے تو وہ اس کے لیے گاؤں سے باہر ایسے خطے کا اہتمام کر دے گا جہاں پر ہسپتال اور ریسرچ سنٹر قائم ہو سکے اور اس کے ارد گرد وافر تعداد میں جنگلی پودے اور پھل پھول لگا کر فطرتی ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے۔

پھر سمیرا سے ہنستے ہوئے کہنے لگا وہ چاہتا ہے کہ ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کے مین گیٹ پر ایک طرف کسی اچھے سے مجسمہ ساز سے اس کی گدھے والی تصویر کو مجسمے میں ڈھال کر نصب کیا جائے۔

سمیرا اور اس کی سہیلیوں نے دل و جان سے جمال پور میں ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کے لیے قیام کے لیے تگ ودو شروع کر دی۔

چاروں سہیلیوں نے پراجیکٹ کو عملی شکل دینے کے لیے آپس میں مشورہ کیا۔ ہر ایک نے اپنے ذمہ ایک ایک کام لیا۔ رضوان نے امریکہ سے ہر قسم کی جدید ترین میڈیکل ٹیکنالوجی بھجوانے کی ذمہ داری قبول کی۔ باقی سہیلیوں نے لینڈ اور عمارت کی تعمیر کے لیے ذرائع یکجا کیے۔ اس طرح جمال پور کے باہر نہر کے کنارے ایک بڑے سے خطہ زمین پر ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔

شیر و کمہار روزانہ سارا دن ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کی سائٹ پر گزارتا۔ سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ بھی شیر و کمہار اور رضوان کی ماں سے گھل مل گئی تھیں۔

شام کے وقت اکثر چوہدری نثار بھی وہاں آ نکلتا تو شیر و گھوم پھر کر سارا دن ہونے والے کام کی تفصیلات سے اسے آگاہ کرتا۔ کرنل اکرام نے عمارت کی تعمیر شروع ہوتے ہی سڑکوں کے محکمے کے افسران کو کہہ

کر ہائی وے سے عمارت تک دو رویہ سڑک تعمیر کروادی۔ سڑک کے دونوں طرف اور بیچوں بیچ پاپلر کے درخت لگوائے جن کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے انسان کو احساس ہوتا کہ وہ یورپ یا امریکہ کے کسی شہر کی سڑک پر چل رہا ہے۔

سمیرا اور اس کی سہیلیاں شیر و کمہار اور رضوان کی ماں سے کہتیں کہ وہ ہسپتال کے رہائشی علاقہ میں منتقل ہو جائیں لیکن شیر و ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا کہ یہاں رضوان، حیدر اور مونا رہیں گے جب کہ وہ اور نگو اپنے احاطے میں زندگی گزاریں گے۔ جس طرح ہمیشہ سے مٹی کے بوتوں سے مختلف قسم کے برتن بنا کر بیچتے رہے ہیں ویسے ہی برتن بنائیں گے، بیچیں گے اور اپنی بقیہ زندگی گزاریں گے۔

سمیرا اور اس کی سہیلیاں شیر و اور نگو کو تنگ کرنے کے لیے کہتیں کہ لوگ کیا کہیں گے کہ ڈاکٹر رضوان کے ماں باپ مٹی کے برتن بناتے اور بیچتے ہیں۔

شیر و ہنس کر کہتا کیا تمہیں میرے مٹی کے برتن بنانے سے عار آتی ہے۔ شیر و کے سوال پر چاروں سنجیدہ ہو جاتیں۔ اس کے ہاتھ چومتیں اور کہتیں نہیں بابا ہمیں تم پر بہت فخر ہے۔ تم نے رضوان جیسے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ جس نے دنیا میں اپنا اور پاکستان کا نام روشن کیا ہے۔ ہمیں بھلا تمہارے کام سے عار کیوں آنے لگی۔

شیر و بھی پیار سے ان چاروں کو چمکارتا۔ پگلیو مٹی ہی ہر چیز کی اصل ہے۔ جو جتنا مٹی کے قریب ہے وہ اتنا محترم ہے۔ پھر وہ سیفو حلوائی کی دوکان پر مولوی صاحب کے سنائے ہوئے مولانا روم کے کسی شعر کا حوالہ دے کر کہتا خدا کے محبوب ترین لوگ باغبان ہیں جو زمین پر پھل پھول کاشت کرتے ہیں۔ کسان ہیں جو کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ اور پھر وہ لوگ ہیں جو انسانوں کی بھلائی کے کام کرتے ہیں۔ جیسے تم چاروں کر رہی ہو۔

شیر و کا جواب سن کر وہ چاروں دل ہی دل میں نہال ہو جاتیں۔ انہیں شیر و کے اندر چھپے ایک خوبصورت انسان کا ہیولہ نظر آتا جو بظاہر دنیاوی علم سے بے بہرہ ہونے کے باوجود اتنی اچھی گفتگو کرتا۔ وہ اکثر ایک

دوسرے سے کہتیں اگر پاکستان میں ہر آدمی کے خیالات شیر و کمہار کی طرح ہو جائیں تو یہ دنیا کا بہترین ملک بن جائے۔

سمیرا رضوان کو ہر دوسرے چوتھے روز کال کر کے پراجیکٹ پر ہونے والی ڈویلپمنٹ کے بارے میں مطلع کرتی رہتی۔

شروع شروع میں جب رضوان کو سمیرا، عذرا، یاسمین یا شائستہ میں سے کسی ایک کی کال آتی حیدر اسے شک کی نظروں سے دیکھتی۔ لیکن بہت جلد اسے احساس ہوا کہ جس طرح وہ رضوان کے وائلن کے سحر میں گرفتار ہوئی تھی اسی طرح وہ چاروں بھی اس کے سحر میں گرفتار ہیں۔ پھر وہ سوچتی کہ وہ سمیرا، اور اس کی سہیلیوں کی نسبت زیادہ خوش قسمت ہے کیونکہ رضوان نے اسے قبول کر کے اس سے مونا جیسی ایک خوبصورت بیٹی کو جنم دیا ہے۔ جبکہ وہ چاروں گمنام اور غیر آباد سیاروں کی طرح رضوان جیسے سورج کے گرد چکر لگا رہی ہیں۔ نہ اس کے سحر سے آزاد ہو سکتی ہیں نہ میری طرح اس کے اتنا قریب آسکتی ہیں کہ اس کے بچوں کی ماں بن سکیں۔

آہستہ آہستہ ان چاروں کے ساتھ حیدر کی دوستی ہو گئی۔ اس نے انہیں رضوان کی زندگی کا حصہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ اگر چند دن ان میں سے کسی کی کال نہ آتی حیدر خود انہیں کال کرتی اور ان سے ان کے ہسپتال اور ریسرچ سنٹر پر ہونے والی ڈویلپمنٹ کی تفصیلات دریافت کرتی۔

یوں تو سمیرا اور اس کی سہیلیاں کھاتے پیتے گھرانوں کی بیٹیاں تھیں اور انہیں ہسپتال اور ریسرچ سنٹر بنانے کے لیے وسائل کی کسی کمی کا سامنا نہیں تھا لیکن پھر بھی انہوں نے حیدر کی فنڈز جمع کرنے کی پیشکش قبول کر لی۔

حیدر نے نہ صرف بہت تھوڑے عرصے میں پورے امریکہ میں تمام بااثر کمپنیوں سے کروڑوں ڈالر جمع کیئے بلکہ اس نے ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کو باقاعدہ جانز ہاپکنز اور ہارورڈ میڈیسن اسکول سے وابستہ کرا دیا۔ جس کے نتیجے میں جمال پور میں بننے والے ہسپتال اور ریسرچ سنٹر میں ہونے والی ریسرچ سے جانز ہاپکنز

اور ہارورڈ میڈیسن اسکول کے اسکالرز استفادہ کرتے اور ان سنٹرز میں ہونے والی ریسرچ تک براہ راست جمال پور ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کے اسکالرز کو رسائی کے حقوق حاصل ہوئے۔

سمیرا، عذرا، یاسمیں اور شائستہ کو مونا سے عشق تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ حیدر اور رضوان جلد سے جلد پاکستان آئیں تاکہ وہ مونا کو دیکھ سکیں۔

حیدر کو امریکہ میں جمال پور ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کے لیے فنڈز مہیا کرنے اور جانز ہاپکنز اور ہارورڈ میڈیسن اسکول سے اشتراک پیدا کرنے کے صلے میں حکومت امریکہ نے پیشکش کی کہ وہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں ڈائریکٹر کے طور پر ساوتھ ایشیا ڈیسک سنبھالے لیکن حیدر نے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے معذرت کی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنی بیٹی مونا اور رضوان کے ساتھ گزارنا چاہتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ اس کی بیٹی بڑی ہو کر اکلاپے اور اجنبیت کے انہی احساسات کے ساتھ زندگی گزارے جس کی وجہ سے رضوان سے ملنے سے پہلے اس کی اپنی زندگی شکست وریخت اور بے سمتی کا شکار تھی۔

سمیرا جب بھی حیدر سے مونا اور رضوان کے ساتھ پاکستان آنے کے لیے کہتی حیدر ہمیشہ اسے ڈی این اے کوڈز کے بارے میں رضوان کی ریسرچ کے آخری مراحل پر پہنچنے کے بارے میں بتاتی۔ وہ کہتی کہ رضوان تقریباً ڈی این کوڈز کی الجھی گتھیوں کے حل کے قریب پہنچ چکا ہے۔ جیسے ہی وہ اپنی ریسرچ کو فائنل شکل دے کر اس حل کو بین الاقوامی میڈیکل کمیونٹی کے سامنے پیش کرے گا وہ پاکستان آئیں گے۔ اور پھر باقی وقت وہیں ہسپتال اور ریسرچ سنٹر میں گزاریں گے۔

حیدر اکثر سمیرا سے رضوان کی فیملی کے بارے میں پوچھتی۔ وہ اس کے ماں باپ کی زندگی کی مصروفیات کے بارے میں سوال کرتی۔ پنجابی زبان نہ آنے کی وجہ سے اس کی کبھی شیر و کمہار اور نگو سے بات نہیں ہوئی تھی لیکن رضوان اور سمیرا کی زبانی ان کی باتیں سن کر وہ بھی غائبانہ طور پر ان کی مداح بن چکی تھی۔

رضوان حیدر کا اپنی فیملی کے ساتھ لگاؤ دیکھتا تو اسے ایک گونہ اطمینان حاصل ہوتا۔ وہ اس بات پر خوش

تھا کہ امریکی معاشرے میں پاکستانی معاشرے کی طرح ذات پات کا کوئی تصور نہیں تھا۔ شادی کے بغیر لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک ساتھ رہنے اور بچے پیدا کرنے کے بارے میں وہ سماجی تحفظات نہیں تھے۔

اگرچہ وہ حیدر اور مونا کے ساتھ واپس پاکستان جانا چاہتا تھا اور اسی مقصد کے لے ہسپتال اور ریسرچ سنٹر بھی بنوا رہا تھا لیکن اس کے ذہن میں کے ای میں سمیرا اور اس کی سہیلیوں کے ساتھ ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے ہونے والا رد عمل ہمیشہ کے لیے محفوظ تھا۔ اسے خوف تھا کہ لوگ حیدر کے ساتھ بغیر شادی اس کے تعلقات اور پھر بیٹی کی پیدائش کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔

وہ حیدر اور مونا سے سچے دل سے محبت کرتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں پاکستان میں اس کی وجہ سے کوئی گزند پہنچے۔ پاکستان میں لوگ ویسے بھی امریکہ سے بہت نفرت کرتے تھے۔ اگر انہیں کسی طرح بھنک پڑی کہ اس نے حیدر کے ساتھ بغیر شادی کیئے بیٹی پیدا کی ہے تو وہ اسے، حیدر اور مونا کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔

حیدر اتنی معصوم تھی کہ اسے پاکستان میں امریکیوں کے خلاف پائی جانے والی نفرت یا بن بیاہے ساتھ رہنے اور بچے پیدا کرنے کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔

وہ پاکستان کو رضوان، سمیرا، عذرا، یاسمیں، شائستہ، شیر و کمہار اور نگو کے حوالے سے جانتی تھی۔ اس کے خیال میں جس طرح رضوان، سمیرا اور اس کی سہیلیاں اور شیر و کمہار اور نگو اس سے محبت کرتے ہیں باقی پاکستانی بھی ایسے ہی سادہ دل اور محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ مونا بھی حیدر اور رضوان کی گفتگو سے پاکستان کے بارے میں جاننے لگی تھی۔

اسے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ جس طرح یہاں ڈاکٹر تھامسن اور مسز تھامسن اس کے گرینڈ ڈیڈی اور ممی تھے اسی طرح پاکستان میں اس کے گرینڈ ڈیڈی اور ممی تھے جنہیں اس نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ رضوان

جب بھی جانزہاپکنز ریسرچ سنٹر سے واپس آتا مونا لونگ روم میں پڑا گلوب اٹھالاتی اور پہلے امریکہ اور پھر پاکستان کے نقشے پر انگلی رکھ کر کہتی میرے ایک گرینڈ ڈیڈی اور ممی یہاں ہیں اور دوسرے گرینڈ ڈیڈی اور ممی یہاں۔

رضوان محبت سے اسے اپنے بازوں میں پکڑ کر اوپر اٹھا کر اس کا منہ چومتا تو وہ اصرار کرتی کہ وہ اسے ہوا میں اچھالے۔ جب رضوان ایسا کرتا وہ خوشی سے لوٹ پوٹ ہو جاتی۔

پھر وہ گلوب اٹھا کر پاکستان پر انگلی رکھ کر کہتی ڈیڈی میں پاکستان جا کر اپنے گرینڈ ڈیڈی اور ممی کے ساتھ کھیلنا چاہتی ہوں۔ کیا وہ میرے ساتھ کھیلیں گے؟

مونا کا سوال سن کر رضوان کو لگتا کہ چند سال پہلے اس نے کے ای کو خیر باد کہہ کر اپنے لیے جو نیا دائرہ بنایا تھا اس میں ساری چیزیں آخر کار اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ رہی ہیں اور وہ دائرہ بڑی تیزی کے ساتھ مکمل ہو رہا ہے۔

وہ اس دائرے کی تکمیل سے خوش بھی تھا اور ہلکا سا متفکر بھی۔ اور یہ فکر اسے اپنے بارے میں نہیں تھی بلکہ پاکستان واپسی کی صورت میں حیدر، مونا، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ کے بارے میں تھی۔ اسے اطمینان تھا تو جمال پور میں تیزی سے تکمیل کی منازل طے کرتے ہوئے ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کی وجہ سے۔ وہ جانتا تھا کہ ہسپتال میں جب ہزاروں لوگوں کی لاعلاج بیماریوں کا علاج ہو گا تو اسے سماجی قبولیت کا وہ مرتبہ حاصل ہو جائے گا۔ جس سے اس کی ذاتی زندگی کی قدروں سے کسی کو کوئی تعرض نہیں ہو گا۔ لیکن اسے یہ بھی بخوبی اندازہ تھا کہ پاکستان کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا ایسے ہی ناممکن ہے جیسے اسلام آباد کے سیاسی موسم کے بارے میں جو کبھی بھی اور کسی وقت بھی بدل سکتا ہے۔

فصل 28

رضوان حیدر اور مونا کی زندگی ہم آہنگی کا ایسا شاہکار تھی جس پر ان کے امریکی اور پاکستانی جاننے والوں کو رشک آتا تھا۔ ڈاکٹر رضوان اور اس کی بن بیاہی بیوی حیدر اپنی بیٹی مونا حیدر رضوان کی زندگی کے ابتدائی برسوں میں ہر وہ آسائش فراہم کر رہے تھے جس کے نتیجے میں پروان چڑھنے کے بعد وہ دونوں تہذیبوں میں کامیابی سے فٹ ہو جاتی۔ ایک اچھی اور سمجھ دار ماں کی طرح حیدر پوری کوشش کرتی کہ جس قدر ممکن ہو وہ مونا کو اس کے باپ کے ثقافتی ورثے سے آشنا کرے۔

اسی طرح رضوان ہر کوشش کرتا کہ امریکی ثقافت اور تہذیب کے خدوخال مونا کی شخصیت کا حصہ بنیں۔ گویا مونا کو دونوں دنیاؤں کے بہترین ثقافتی پہلوں کو اپنی شخصیت میں جذب کرنے کے مکمل مواقع فراہم تھے۔

ستمبر کی ایک صبح رضوان، حیدر اور مونا لونگ روم میں بیٹھے ابھی صبح کا ناشتہ کر رہے تھے کہ اچانک ٹی وی کیمروں کا رخ نیویارک میں ٹون ٹاورز کی طرف مڑ گیا۔

ایک مسافر طیارہ ایک ٹاور سے ٹکرا چکا تھا اور اس سے دھواں اٹھ رہا تھا جبکہ دوسرا طیارہ دوسرے ٹاور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ٹی وی کا نیوز کاسٹر پہلا جہاز ٹاور سے ٹکرانے کے بعد کچھ کنفیوز تھا اور کہہ رہا تھا کہ ایک مسافر بردار طیارہ ٹون ٹاور سے ٹکرا کر حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔

چند لمحوں بعد نیوز کاسٹر کو دوسرا طیارہ دوسرے ٹون ٹاور کی بڑھتا دکھائی دیا تب اس نے کہنا شروع کیا کہ لگتا ہے نامعلوم دہشت گردوں نے طیارے اغوا کر لیے ہیں ایک طیارہ ٹون ٹاور سے ٹکرا چکا ہے جب کہ دوسرا دوسرے ٹون ٹاور کی طرف بڑھ رہا ہے۔ رضوان، حیدر اور مونا کے دیکھتے دیکھتے دوسرا طیارہ ٹون

ٹاور سے ٹکرا گیا۔ لوگ دیوانوں کی طرح سڑکوں پر بھاگنا شروع ہو گئے جبکہ دونوں ٹاور رفتہ رفتہ منہدم ہو گئے۔

لوگوں کی چیخ و پکار، زخمیوں کو اٹھاتے اور مدد کے لیے محفوظ جگہوں کی طرف لے جاتے رضا کار، ایمر جنسی سروسز کے اداروں کی گاڑیوں کے سائرن اور جگہ جگہ سراسیمہ بھاگتے لوگ ایک قیامت کا ساماں پیش کر رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہالی ووڈ کی کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔

لیکن یہ کوئی شوٹنگ نہیں تھی ایک حقیقی واقعہ تھا جس نے تین ہزار لوگوں کو آناً فاناً لقمہ اجل بنا دیا تھا۔

نیویارک ایک بین الاقوامی شہر ہے۔ جہاں دنیا بھر سے آئے لوگ زندگی کی دوڑ دھوپ میں صبح سے رات گئے تک مصروف عمل رہتے ہیں۔ چنانچہ ٹون ٹاور میں لقمہ اجل بننے والے تین ہزار افراد میں ہر ملک اور قوم کے لوگ شامل تھے۔

دیکھتے دیکھتے مرنے والوں کے عزیز و لواحقین ہزاروں کی تعداد میں اپنے مرنے والوں کی تصویریں اٹھائے نیویارک کی سڑکوں پر انہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ لیکن جنہیں ڈھونڈھا جا رہا تھا وہ ٹون ٹاور کے لاکھوں ٹن ملبے تلے دبے تھے۔ کہاں سے اپنے پیاروں کی چیخ و پکار کا جواب دیتے۔

لوگوں کو اس طرح ٹی وی پر سراسیمہ اور پریشاں حال دیکھ کر مونا رونا شروع ہو گئی۔ حیدر اور رضوان نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھا لیا اور تسلی دینے لگے۔ لیکن وہ تھی کہ چپ ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ مسلسل کہے جا رہی تھی:

"امی جہاز والے انکل بڑے گندے تھے، انہوں نے جہازوں کو ٹاورز سے ٹکرا کر اتنے لوگوں کو زخمی کر دیا ہے۔"

اس کے ننھے ذہن میں ابھی ان ہزاروں لوگوں کی تصویر نہیں بن پائی تھی جو ٹون ٹاور کے لاکھوں ٹن ملبے تلے دبے تھے۔ جن کی لاشوں کو ایمر جنسی سروسز کے کارکن اور رضاکار ملبہ ہٹا کر نکال رہے تھے۔

رضوان اور حیدر کو بھی ٹون ٹاورز میں ہونے والی دہشت گردی نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ دونوں چاہتے تھے کہ ٹی وی آن رکھ کر واقعہ کی لمحہ بہ لمحہ جاری ہونے والی تفصیلات سے آگاہ رہیں لیکن مونا کے مسلسل روئے جانے کی وجہ سے انہوں نے ٹی وی بند کر دیا تھا۔ اور ریڈیو آن کر کے گاہے بگاہے واقعہ کی جاری ہونے والی تفصیلات سے آگاہی حاصل کر رہے تھے۔

رضوان مسلسل کہے جا رہا تھا کہ یہ بہت برا ہوا ہے اِس کے اثرات اچھے نہیں ہوں گے۔ جس نے بھی ٹون ٹاورز پر اٹیک کیا ہے بہت برا کیا ہے۔

ابھی حیدر، رضوان اور مونا ٹون ٹاورز پر اٹیک کے شاک سے سنبھل نہیں پائے تھے کہ ریڈیو پر خبر نشر ہوئی کہ حملہ آوروں کا تعلق سعودی عرب سے تھا جو افغانستان میں مقیم اسامہ بن لادن کے ساتھی تھے۔ اسامہ بن لادن اور افغانستان کا ذکر آتے ہی رضوان کا ذہن پاکستان کی طرف چلا گیا۔

اگر اس خطرناک واقعہ کا تعلق افغانستان سے جڑ رہا ہے تو یقیناً اس کا تعلق پاکستان سے بھی جوڑا جائے گا۔ چونکہ پاکستان کی خفیہ ایجنسیاں روس کے افغانستان سے چلے جانے کے بعد بھی وہاں سرگرم عمل تھیں اور وہاں پر حکمران طالبان کو ضروری مدد اور راہنمائی فراہم کر رہی تھیں۔

پاکستان میں اس وقت ایک غیر نمائندہ حکومت قائم تھی جس کو قوم کی حمائت حاصل نہیں تھی۔ سارے فیصلے ایک شخص کر رہا تھا۔ رضوان کو خدشہ تھا کہ اس واقعہ کے بعد جس طرح کے حالات پیدا ہونے جا رہے تھے ایسے وقت میں قومی اعتماد پر مبنی حکومت کی عدم موجودگی پاکستان کو سخت خطرات سے دوچار کر سکتی ہے۔

حیدر کی دعوت پر اس نے جانز ہاپکنز میں پبلک پالیسی کی کئی کلاسوں میں برزنسکی سے لے کر ہنری کیسنجر تک کئی اعلی امریکی سرکاری اور غیر سرکاری دانشوروں کی گفتگو سنی تھی۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ وہ سب پاکستان کے بارے میں کیسے سوچتے ہیں۔ اس کا دل ٹون ٹاورز کے واقعات کے نتیجے میں پاکستان کے لیے پیدا ہونے والے خدشات سے لرز اٹھا۔ واشنگٹن میں بھی اتنے بڑے واقعہ کے بعد صورت حال کو سنبھالا دینے کے لیے جس قسم کی سوجھ بوجھ رکھنے والی لیڈرشپ کی ضرورت تھی وہ موجود نہیں تھی۔

واشنگٹن میں وہائٹ ہاوس سے لیکر اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ تک اجتماعی طور پر انسانیت کے مستقبل کے بارے میں ایسے لوگ اتنے بڑے بڑے فیصلے کر رہے تھے جن کی سوچوں پر فراست کی بجائے انتقام اور خوں ریزی کے عناصر زیادہ غالب تھے۔

اس نے پہلی بار دل ہی دل میں دعا کی کہ اگر انسانوں کا کوئی خدا ہے تو وہ واشنگٹن میں حکمرانوں کے دلوں میں انتقام اور خوں ریزی کی بجائے عفو اور درگزر کا جذبہ پیدا کر دے۔

لیکن ایسے معاملات دعاؤں اور اچھی خواہشات سے کب ٹلتے ہیں۔ وہ انسان جو اپنی زندگی کی سب بڑی جدوجہد جرثومے کی شکل میں اپنے والد کے آلہ تناسل سے اخراج کے بعد اپنی ماں کی اندام نہانی میں چھپے اپنے ایگ تک پہنچنے کے لیے اپنے جیسے کروڑوں جرثوموں کے خلاف کرتا ہے زندگی میں آسانی سے کب کسی سے ہار مانتا ہے۔ اس پہلی جدوجہد اور تگ و دو سے شروع ہونے والا سفر ساری عمر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان واپس مٹی کو گود میں پہنچ جاتا ہے۔

حیدر نے رضوان کو پریشان دیکھا تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔ وہ رضوان سے اس قدر محبت کرتی تھی کہ اس کی پیشانی پر پریشانی کے ذرا سے ابھرنے والے تاثرات اس کے دل پر قیامت ڈھا دیتے تھے۔

حیدر ایک غیر معمولی امریکن لڑکی تھی۔ وہ نہ صرف بلا کی حسین تھی بلکہ وفا شعاری اور تابعداری میں پاکستانی خواتین سے کہیں آگے تھی۔ رضوان جب جانز ہاپکنز سے واپس آتا وہ اس کے ہاتھ سے گھڑی اتار کر بیڈ ٹیبل پر رکھتی۔ اس کا کوٹ اور نکٹائی اتار کر کپڑوں کے کلازٹ میں ہینگر پر لٹکاتی۔ جوتے اتار کر کلازٹ میں رکھتی اور اسے گھر میں پہننے والے سلیپر پہناتی۔ جواب میں رضوان کا ایک محبت بھرا بوسہ اسے نہال کر دیتا۔

رضوان سے اس نے تقریباً سبھی پاکستانی کھانے بنانے بھی سیکھ لیے تھے۔ رضوان کے کام سے لوٹنے سے پہلے وہ اکثر اس کے پسندیدہ کھانے تیار رکھتی۔

اسے خوب اندازہ تھا کہ رضوان کونسی خوراک زیادہ رغبت کے ساتھ اور کونسی ہاتھ کھینچ کر کھاتا ہے۔ چنانچہ وہ کوشش کرتی کہ زیادہ سے زیادہ اس کے مرغوب کھانے پکائے۔

ٹون ٹاورز کے واقعہ نے اسے بھی بہت دکھی کر دیا تھا۔ وہ رضوان کی صورتِ حال بھی سمجھتی تھی۔ چنانچہ اس نے رضوان کی دلداری کی پوری کوشش کی۔ اسے تسلی دی کہ جو بھی حالات ہوں وہ اس کے ساتھ ہے۔

رضوان کے ساتھ وہ بھی دیکھ رہی تھی کہ دنیا میں بہت جلد ایک ایسی جنگ کا آغاز ہونے جارہا ہے جس کے انجام کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ یہ جنگ ماضی کی تمام جنگوں سے مختلف ہوگی۔ کیونکہ اس جنگ کے کوئی واضح اہداف اسے نظر نہیں آرہے تھے۔ ایسی جنگیں جن کے اہداف واضح نہ ہوں عموماً انسان ان جنگوں میں جنونیت کی حد تک ایک دوسرے کی تباہی و بربادی کا کارن بنتے ہیں۔

رضوان کا سب سے بڑا اخدشہ ایسی جنگ میں روپذیر ہونے والی متوقع انسانی ہلاکتوں کے بارے میں تھا۔ وہ انسانی زندگی کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ کسی انسان کا کسی بھی وجہ سے کسی دوسرے انسان کے ہاتھوں قتل اسے گوارہ نہیں تھا۔ اس کی اب تک ساری ریسرچ اس چیز پر مرتکز تھی کہ انسانی زندگی کو کس طرح بہتر سے بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

اس صبح نیویارک میں رونما ہونے والے واقعہ نے جس میں ہزاروں انسان آناًفاناً لقمہ اجل بن گئے تھے زندگی میں اس کے اعتماد کو متزلزل کر دیا تھا۔

اس نے حیدر سے کہا کہ نیویارک میں جو کچھ ہوا ہے بہت برا ہوا ہے لیکن میری خواہش ہے کہ اسے بنیاد بنا کر امریکہ کسی ایسی جنگ کا آغاز نہ کرے جس میں لاکھوں انسان مارے جائیں۔ اور وہ بھی ایسے انسان جن کا اس واقعہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ جن کے وہم گمان میں بھی نہیں ہے کہ چند سر پھرے پاگل انسان ایسی حرکت کرنے جارہے ہیں جس کے نتیجے میں ہزاروں انسان موت کی گھاٹ اتر جائیں

گے۔ حیدر نے رضوان کی بات سنی تو اس نے اسے کہا کہ وہ ایسے ماحول میں کسی سے کوئی بات نہ کرے۔ مبادہ کوئی اس کی بات سے کوئی غلط مفہوم اخذ کرے اور بلاوجہ اسے گزند پہنچائے۔

پھر اس نے آگے بڑھ کر رضوان کو اپنی باہوں میں لے لیا جیسے اسے کسی متوقع خطرے سے بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔

مونا صبح روتے روتے سو گئی تھی اور ابھی تک سو رہی تھی۔ رضوان نے حیدر سے کہا کہ وہ مونا کو جگا دے۔ اگر وہ سارا دن یوں ہی سوتی رہی تو رات میں اس کے لیے سونا مشکل ہو گا۔ پھر ساتھ ہی اس نے حیدر سے کہا کہ وہ گیموں وغیرہ سے اس کی دل لگی کرے اور اسے دوبارہ ٹی وی نہ آن کرنے دے۔

پھر کچھ سوچ کر اس نے حیدر سے کہا کہ وہ مونا کو اٹھائے۔ تا کہ وہ تینوں حیدر کے ممی اور ڈیڈی کے ہاں جائیں اور باقی کا دن وہاں گزاریں۔

وہاں دادا دادی کے ساتھ مونا کا دل بہلا رہے گا اور خود ان کا وقت بھی ان کی معیت میں اچھا گزرے گا۔ رضوان کے کہنے پر حیدر نے مونا کو جگایا اور پھر وہ تینوں نیویارک میں ہونے والے واقعہ پر بوجھل دل کے ساتھ ڈاکٹر اور مسز تھامسن کے ہاں روانہ ہو گئے۔

فصل 29

ستمبر گیارہ کے خونی واقعات میں صرف نیویارک میں دو تجارتی ٹاور تباہ نہیں ہوئے تھے بلکہ دوسری جنگ عظیم کی کوکھ سے جنم لینے ولی دنیا کے تمام اصولوں کی عمارت منہدم ہو گئی ۔

ریاستوں کے دوسری ریاستوں کے ساتھ باہمی تعلقات کے تمام روائتی اصول وضوابط منہدم ہو گئے ۔ حکومتوں اور شہریوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت اور فطرت تبدیل ہو گئی۔ اب تک عام شہری ریاستی اداروں کی طرف آخری پناہ دہندہ کی طرح دیکھتے تھے لیکن گیارہ ستمبر کے بعد عام آدمیوں کی حفاظت کرنے والے وہی ادارے ان کی زندگیوں کو اس طرح کھنگال رہے تھے جیسے ہر شخص ایک متوقع حملہ آور ہو۔

ٹون ٹاورز کے سارے حملہ آور سعودی عرب کے باشندے تھے لیکن نیویارک میں خفیہ اداروں نے وسیع پیمانے پر پاکستانیوں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔

جو پاکستانی سرحد پار کر کے کینیڈا جا سکتے تھے وہ کینیڈا چلے گئے جو پاکستان واپس جا سکتے تھے پاکستان چلے گئے۔ بہت سے پکڑے گئے جن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ انہیں کہاں غائب کر دیا گیا ہے۔

رضوان کی جس تاجر پاکستانی سے بات ہوتی وہ اپنا سرمایہ امریکہ سے نکال کر کسی اور ملک میں جا کر آباد ہونے کی بات کرتا۔ وہ انہیں سمجھاتا کہ وہ امریکہ نہ چھوڑیں۔ وہ ان کی دلجوئی کرتا۔ انہیں بتاتا کہ امریکہ دنیا کا بہترین ملک ہے۔ یہاں آئین ہے، قانون ہے، عدالتیں ہیں جو انسانی حقوق پر کسی سے سمجھوتہ نہیں کرتیں۔ یہ عارضی دور ہے جو بہت جلد گزر جائے گا اور زندگی دوبارہ اپنے راستے پر واپس آجائے گی۔

رضوان کے سمجھانے بجھانے پر کئی پاکستانی تاجروں نے امریکہ چھوڑنے کا ارادہ ترک کیا اور جس حد تک ہو سکا قانون نافذ کرنے والے اداروں کی مدد کی تاکہ چیزیں دوبارہ نارمل ہو سکیں۔

لیکن حالات تھے کہ سنبھلنے میں نہیں آ رہے تھے۔ ساری فضا میں ایک خوف اور دہشت چھائی تھی۔ ہر کوئی سہما اور ڈرا ڈرا تھا۔ رضوان اور حیدر نے اپنی بساط کے مطابق جتنے پاکستانیوں کی جتنی مدد ہو سکی کی۔ لیکن انہیں اندازہ تھا کہ یہ ایک غیر معمولی صورت حال ہے۔ جس میں ہر کوئی جیسے مناسب سمجھتا ہے کر رہا ہے۔

ٹون ٹاورز پر حملوں نے عام امریکیوں کو بھی خاصہ ناراض کر دیا تھا۔ کئی شہروں میں لوگ مسلمانوں پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ کئی جگہ کئی سکھ مسلمان ہونے کے دھوکے میں ہلاک کر دیئے گئے۔ اس صورت حال میں صدر امریکہ نے بہت دانش مندی کا مظاہرہ کیا۔ صدر امریکہ نے باقاعدہ اپنی تقریر میں اپنے امریکی ہم وطنوں کو مطلع کیا کہ امریکہ میں رہنے والے مسلمان ان کے ہم وطن ہیں لہٰذا ان میں سے کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچنا چاہیئے۔

صدر امریکہ کی اس اپیل سے فضا میں کچھ اعتدال ضرور آیا لیکن فضا میں تلخی بدستور موجود رہی۔

یہ ماحول دیکھ کر رضوان کا دل دکھی ہو جاتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ کسی طرح ستمبر گیارہ کے بخار کو ہلکا کرے۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ وائلن لے کر جگہ جگہ جائے اور امن کی دُھنیں بجائے تاکہ لوگوں کو اطمینان میسر ہو سکے۔

وہ جب بھی ایسا کرنے کا سوچتا حیدر اسے روک دیتی۔ وہ کہتی کہ ابھی فضا میں بہت تلخی ہے۔ وہ شکل سے پاکستانی نظر آتا ہے۔ کوئی بھی اسے گزند پہنچا سکتا ہے۔ اِس لیے وہ اس کی اور مونا کی خاطر ایسا کوئی کام نہ کرے۔

امریکہ کے اندر غصہ تھا، ناراضگی تھی، زخم خوردگی کا احساس تھا، اور امریکہ کے اندر امریکہ پر اس طرح حملہ آور ہونے کی جرأت کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی خواہش اور جذبہ تھا۔ امریکی بزدل

نہیں۔ وہ قربانی دینا جانتے ہیں۔ اور جس شان سے امریکی قربانی دیتے ہیں اس کی مثال دنیا کے کسی اور کلچر میں نہیں ملتی۔ جس طرح امریکی مائیں، بہنیں، بیویاں اور محبوبائیں اپنے پیاروں کو راہ کارزار میں بھجواتی ہیں اس کی مثال بھی کوئی اور کلچر پیش نہیں کر سکتا۔ امریکی فوجی نہ پیسے کے لیے لڑتا ہے، نہ شہادت کے لیے، نہ دنیا کے لیے نہ دین کے لیے، امریکی فوجی امریکہ کے لیے لڑتا ہے۔ اس کی زندگی اور موت اول و آخر امریکہ سے وابستہ ہے۔ امریکی صدر حکم دیتا ہے اور فوجی اپنی وردی پہن کر دنیا کے کسی بھی خطے میں فتح و کامرانی کا جذبہ دل میں لیے یوں چلا جاتا ہے جیسے پکنک پر جارہا ہو۔ جنگ کرنا اس کے لیے ایک روز مرّہ کا کام ہے جس میں جان جاسکتی ہے۔ جب کام ختم ہوتا ہے تو وہ اسی شان و شوکت سے واپس لوٹتا ہے جس شان و شوکت سے رخصت ہوتا ہے۔ اس کے ننھے منے بچے اپنی ماؤں کی گود سے ہمک کر اسے خوش آمدید کہتے ہیں۔ ان کی بیویاں اور محبوبائیں باہیں پھیلا کر انہیں محبت کے بوسوں سے نوازتی ہیں۔

رضوان جنگ اور جنگ کی تباہ کاریوں سے متنفر ہونے کے باوجود امریکیوں کی اس شان بے نیازی سے بہت متاثر تھا۔ ان کی حب الوطنی کے جذبے کی چمک اسے بہت بھاتی تھی۔

ستمبر گیارہ کے واقعات کے بعد صورت حال دن بدن بگڑ رہی تھی۔ امریکی حکومت کی کوشش تھی کہ طالبان گیارہ ستمبر کے واقعات میں ملوث اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھیوں کو امریکہ کے حوالے کر دیں لیکن طالبان اپنی قبائلی روایتوں کے اسیر ایسا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ جس کی وجہ سے امریکہ نے افغانستان پر بم برسانا شروع کر دیئے یہاں تک کہ افغانستان میں طالبان کی حکومت ختم ہو گئی اور امریکی فوجیں اپنے اتحادیوں کے ساتھ کابل پر قابض ہو گئیں۔

زیادہ تر طالبان اچھے وقتوں کے لوٹنے کی امید میں افغانستان کے دور دراز علاقوں میں روپوش ہو گئے۔ افغانستان میں سرگرم عمل پاکستان کے خفیہ اداروں کے کارکن جہازوں میں بیٹھ کر پاکستان لوٹ گئے۔

اسامہ بن لادن اپنے ساتھیوں سمیت اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے، اس خطے کے جنگجوں کی روائت کے مطابق، کہیں ان جانی وادیوں میں چھپ گئے تا کہ اپنی تتر بتر طاقت کو دوبارہ مرتکز کر سکیں۔

افغانستان میں طالبان کو شکست ہوئی تو عام امریکیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کے دکھ اور غصے میں واضح کمی واقع ہوئی۔ اپنی حکومت کی کارکردگی پر انہوں نے اطمینان کا اظہار کیا۔

رضوان کے خیالات کے اتار چڑھاؤ میں بھی کچھ ٹھہراؤ آیا۔ اس کی روزوشب کی فکر کچھ کم ہوئی۔ حیدر نے بھی سکون کا سانس لیا کہ گیارہ ستمبر کے خونی واقعات نے فضاؤں کو جس طرح خونبار کر دیا تھا اس میں اب کچھ کمی آنے لگی تھی۔

لیکن وائٹ ہاؤس کے اس وقت کے مکین کو ابھی تاریخ کے کچھ اور حساب بھی چکانے تھے۔

صدام حسین ابھی تک بغداد کے گلی کوچوں میں بندوق لہرا کر وائٹ ہاوس کے مکین کو اکسا رہا تھا کہ وہ اپنا حساب صاف کرنے کے لیے بغداد پر فوج کشی کرے۔

افغانستان میں ملنے والی کامیابی کو مکمل طور پر یکجا کئے بغیر وائٹ ہاوس کے مکین نے بغداد پر فوج کشی کے لیے تیاریاں شروع کیں تو امریکہ میں اضطراب کی لہریں پیدا ہونا شروع ہو گیں۔ عام امریکی اور عقل و فکر رکھنے والے امریکی دانشور اب جنگ سے باہر آنا چاہتے تھے۔ لیکن واشنگٹن میں انتظامیہ نے گیارہ ستمبر کے واقعات کے نتیجے میں جس چالبازی کے ساتھ قوانین میں تبدیلیاں کرکے پورے ملک میں خوف کی فضا قائم کی تھی اور جس طرح لوگوں کے حقوق تقریباً ساقط کر دیئے تھے ان حالات میں کوئی بھی حکومت کے عزائم میں مزاحم نہیں ہونا چاہتا تھا۔

لیکن امریکی جتنی محبت اپنی سیاسی آزادی سے کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ محبت انہیں اپنی فکری آزادی سے ہے۔

واشنگٹن میں عراق کے خلاف طبل جنگ بجا تو فکری طور پر آزاد امریکیوں نے اس جنگ کے خلاف طبل جنگ بجا دیا۔ آہستہ آہستہ امریکہ کے مختلف شہروں میں عراق جنگ کے خلاف تحریک منظم ہونے لگی۔

حیدر، رضوان، اور مونا بھی ان لوگوں میں شامل تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا دائرہ حیلے بہانے سے عراق تک بڑھایا جائے۔

رضوان کو صدام کے نام سے چڑ تھی لیکن اس کے خیال میں امریکہ کی دہشت گردی کے حوالے سے عراق پر چڑھائی دہشت گردی کے خلاف جنگ کی بجائے کچھ اور مقاصد کی تکمیل کے لیے تھی۔ چنانچہ اسے جہاں بھی عراق جنگ کے خلاف ہونے والی کسی ریلی کی اطلاع ملتی وہ حیدر کو ساتھ لیکر مونا کو کندھوں پر اٹھائے وہاں پہنچ جاتا اور ریلی میں شرکت کرتا۔

اُسے ایسی ریلیوں میں شرکت کر کے ایک اطمینان حاصل ہوتا کہ وہ جنگ جیسی مکروہ چیز کے خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کرا رہا ہے۔ احتجاج میں اس کے لیے اس سے بھی زیادہ اطمینان کا باعث حیدر اور مونا کی شمولیت تھی۔

رفتہ رفتہ ریلیاں آرگنائز کرنے والے اس چھوٹے سے خوبصورت خاندان سے آشنا ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے اسے بالٹی مور کے ارد گرد بڑے شہروں میں ہونے والی ریلیوں میں دعوت دینی شروع کر دی۔ وہ شوق سے ایسے اجلاسوں میں جاتا۔ ڈی این ایز اور جینز پر اپنی ریسرچ کی وجہ سے وہ امریکہ میں خاصہ جانا پہچانا آدمی بن چکا تھا۔

لیکن اس کی وائلن نوازی کی صلاحیتوں کے بارے میں ابھی ریلیاں آرگنائز کرنے والوں کو کوئی پتہ نہیں تھا۔ جس طرح پاکستان میں گدھے کے ساتھ کھنچی اس کی تصویر ایک سمبل بن چکی تھی اسی طرح امریکہ میں حیدر کے ساتھ مونا کو کندھوں پر اٹھائے جنگ کے خلاف ریلیوں میں شامل کسی موقع پر کسی امریکی اخبار کے کسی رپورٹر کی کھینچی اس کی تصویر بھی ایک سمبل بنتی جا رہی تھی۔

تصویر میں حیدر، رضوان اور مونا نے ایک جیسی نیکریں اور شرٹس پہن رکھی تھیں۔ حیدر کسی بات پر آدھے پہر کے سورج کی طرح کھل کھلا کر ہنس رہی تھی جبکہ مونا رضوان کے کندھوں پر سوار جنگ کے خلاف ریلی میں شامل لوگوں کی طرف ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے جوش و جذبے کا اظہار کر رہی تھی۔

حیدر نے پہلی بار واشنگٹن ٹائمز میں جنگ کے خلاف ہونے والی ریلی کی خبر کے ساتھ یہ تصویر دیکھی تو اُسے وہ تصویر اتنی اچھی لگی کہ اُس نے اپنے ڈرائنگ روم میں سجانے کے لیے اُس تصویر کے حصول کے لیے تگ ودو شروع کر دی۔

جب حیدر کوشش کے باوجود وہ تصویر حاصل نہ کر سکی تو اس نے رضوان سے کہا کہ اسے ڈرائنگ روم میں سجانے کے لیے وہ تصویر چاہیئے۔

رضوان نے کہا اگر وہ اس روز کے اخبارات کے انٹر نیٹ ایڈیشنز دیکھے تو کسی نہ کسی پر اسے وہ تصویر ضرور مل جائے گی۔ پھر رضوان نے خود ہی اپنے لیپ ٹاپ پر واشنگٹن ٹائمز کا اس روز کا ایڈیشن نکالا تو وہاں وہ تصویر موجود تھی۔ حیدر نے اس تصویر کو گدھے والی تصویر کے سائز میں بنوا کر اسی کے ساتھ دیوار پر آویزاں کر دیا۔

عراق جنگ کے خلاف صرف امریکہ ہی نہیں یورپ اور ایشیا میں بھی لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور دنیا کے ہر بڑے شہر میں جنگ کے خلاف مظاہرے، جلسے، جلوس اور ریلیاں نکل رہی تھیں۔ لیکن ساتھ ساتھ وائٹ ہاوس کا کام بھی پورے زور و شور کے ساتھ جاری تھا۔ یو این او کی سکیورٹی کونسل کے پلیٹ فارم پر ضروی کاروائیاں کی جارہی تھیں تا کہ بین الاقوامی قانونی لوازمات پورے کئے جا سکیں۔

جنگ مخالف تنظیموں کو کسی سے رضوان کی وائلن بجانے کی صلاحیتوں کی بھنک پڑی تو انہوں نے اصرار شروع کر دیا کہ وہ نیویارک میں ہونے والی جنگ مخالف ریلی میں امن کے لیے وائلن بجائے۔ وہ لوگ رضوان سے امن کے لیے وائلن بجانے کی درخواست تو کر رہے تھے لیکن انہیں حقیقی معنوں میں اندازہ نہیں تھا کہ رضوان کی وائلن کیا کیا اعجاز دکھانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

حیدر نے انہیں وارننگ دی کہ رضوان کی وائلن لوگوں کی مکمل کایاپلٹ کر دیتی ہے۔ اگر رضوان نے

امن کے لیے وائلن بجائی تو اس کے سننے والوں کے لیے شاید پھر ان اداروں کے لیے کام کرنا ممکن نہ رہے جو جنگ کے معاملات سے ڈیل کرتے ہیں۔ جنگ مخالف آرگنائزیشن کے کارندوں کو حیدر کی بات سن کر حیرت ہوئی۔

وہ یہ بات باور کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ حیدر کی بات کو مسترد کرتے۔ حیدر کے چہرے سے جھلکتی خود اعتمادی انہیں یقین دلانے کے لیے کافی تھی کہ وہ جو کہہ رہی ہے سچ کہہ رہی ہے۔

جانز ہاپکنز سے ایم ڈی ڈگری ملنے اور ڈی این اے پر اپنی ریسرچ مکمل کرنے کے بعد رضوان کی امریکہ آمد کا مقصد پورا ہو چکا تھا اور وہ خود کو پاکستان واپس جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا۔ وہ جنگ مخالف ہونے کی وجہ سے ریلیوں میں شامل ضرور ہو رہا تھا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ یو ایس اے گورنمنٹ کے سرکاری اداروں کے ساتھ کسی قسم کا الجھاؤ ہو۔ اس کا خیال تھا کہ گیارہ ستمبر کے بعد دنیا دیوانہ پن کا شکار ہو چکی ہے اور اس دیوانگی کا حصہ بنے بغیر اس میں سے سلامتی سے گزر جانا ہی بہتر ہے۔

آخر اُسے جنگ مخالف آرگنائزیشن کی درخواست اور حیدر کے کہنے پر نیویارک میں منعقد ہونے والی جنگ مخالف ریلی میں شامل ہونے کی حامی بھرنی پڑی۔

تاہم اس نے ریلی میں پیانو بجانے کے لیے چند شرائط رکھیں۔ اس نے کہا کہ جنگ مخالف ریلی اپنی اشتہاری مہم میں باقاعدہ اعلان کرے کہ یو ایس گورنمنٹ کے جنگ سے وابستہ محکموں میں سے کوئی اس ریلی میں شامل نہ ہو۔

دوسرا اس نے ان سے وعدہ لیا کہ وہ اس کی گدھے والی تصویر کو بڑا کروا کے اسٹیج پر اس طرح نصب کریں کہ وہ اس کے پہلو میں کھڑا ہو کر وائلن بجا سکے۔

جنگ مخالف آرگنایزیشن نے وعدہ کیا کہ وہ اس کی شرائط پر من وعن عمل کریں گے۔ ان سے وعدہ لینے کے بعد اس نے انہیں ریلی میں وائلن بجانے کا عندیہ دے دیا۔

ڈاکٹر رضوان کے ریلی میں وائلن بجانے کے وعدے کے بعد امریکہ بھر کی جنگ مخالف تنظیموں نے مشترکہ طور پر اعلان کیا کہ وہ سب مل کر نیویارک میں جنگ مخالف ریلی کا اہتمام کریں گی اور اسے احتجاج کی تاریخ کا ایک اہم دن بنائیں گی۔

فصل30

جانز ہاپکنز ریسرچ سنٹر میں رضوان کے تمام ساتھی اسکالر اُس سے بہت خوش تھے۔ وہ حقیقی معنوں میں ایک جینیس انسان تھا۔ جس ساتھی اسکالر کو اپنی ریسرچ میں کسی قسم کی کوئی دِمشکل پیش آتی وہ اسے منٹوں سیکنڈوں میں حل کر دیتا۔

وہ سب اس کے پاکستان واپس جانے کے منصوبوں سے ناخوش تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ رضوان جانز ہاپکنز کو خیر باد کہے۔

جیسے جیسے پاکستان جانے کے امکانات بڑھ رہے تھے رضوان خود بھی حیدر اور مونا کے بارے میں پریشان تھا۔

کیا پاکستان جیسے ماحول میں حیدر زندگی گزار سکے گی؟ حیدر ایڈجسٹ ہو بھی گئی تو مونا کی تعلیم کا کیا ہو گا؟ خود اتنے سال یو ایس اے میں زندگی گزارنے کی بعد یو ایس لائف اسٹائیل اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا۔

ایک صاف ستھرے امریکی نظام میں اتنا طویل عرصہ زندگی گزارنے کے بعد دوبارہ پاکستانی نظام میں ایڈجسٹ ہونا اسے دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن جمال پور میں سمیرا، عذرا، یاسمیں اور شائستہ نے ہسپتال کے پراجیکٹ کو تقریباً مکمل کر دیا تھا۔

ایک صبح حیدر، مونا اور رضوان ابھی سو رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ حیدر نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سمیرا بول رہی تھی۔ وہ رضوان سے بات کرنا چاہتی تھی۔ حیدر نے جب اسے بتایا کہ امریکہ میں ابھی بہت صبح کا وقت ہے اور رضوان ابھی سو رہا ہے تو سمیرا نے اسی سے گفتگو شروع کر دی۔ اس نے پہلے ہسپتال کی تعمیر میں اعانت فراہم کرنے کے لیے تہہ دل سے حیدر کا شکریہ ادا کیا۔ پھر کہنے لگی کہ

ہسپتال کا میڈیسن وارڈ اور رہائشی ایریا مکمل ہو گیا ہے۔ اس نے اور اس کی سہیلیوں نے باقاعدہ ہسپتال میں مریضوں کو دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ پاکستان کے ٹی وی، ریڈیو اور اخبارات نے ہسپتال کھلنے کو اپنی خبروں میں نمایاں کوریج فراہم کی ۔ سبھی اخبارات نے رضوان کی گدھے کے ساتھ تصویر دوبارہ شائع کی۔ رضوان کی خواہش ظاہر کی تھی کہ اس تصویر کا مجسمہ بنوا کر ہسپتال کے دروازے پر نصب کیا جائے۔

مجسمہ نصب کئے جانے کے لیے تیار ہے۔ اسے ایرانی مجسمہ سازوں سے بنوایا ہے۔ مجسمہ تصویر سے زیادہ خوبصورت بنا ہے۔ رضوان دیکھے گا تو خوش ہو جائے گا۔

پھر اس نے حیدر سے درخواست کی کہ وہ جلد پاکستان آ جائیں۔ حیدر نے مذاقاً سمیرا سے کہا کہ رضوان اور وہ سب تو ڈاکٹر ہیں ہسپتال میں مریضوں کو دیکھیں گے لیکن وہ پاکستان میں کیا کرے گی۔

سمیرا نے کہا اس پراجیکٹ کو کسی نے چلانا بھی ہے۔ اس کام کے لیے حیدر سے زیادہ موزوں کون ہو سکتا ہے؟

حیدر سمیرا کی بات سن کر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ پھر کہنے لگی کیا جانز ہاپکنز سے پبلک پالیسی میں میں نے ماسٹرز اسی لیے کیا تھا کہ پاکستان میں ہسپتال چلاؤں۔ تاہم رضوان کے لیے یہ کرنا پڑا تو ضرور کروں گی۔ لیکن میں اور رضوان دونوں مونا کی تعلیم کے بارے میں متفکّر ہیں۔ رضوان کا کہنا ہے کہ پاکستان میں امریکی اسکول ہیں لیکن وہ جمال پور سے دور ہیں۔ میں اور رضوان دونوں مونا سے اتنے وابستہ ہیں کہ اسے ہاسٹل میں چھوڑنے کا خیال بھی ہمارے لیے محال ہے۔

سمیرا نے کہا کہ اسے مونا کی تعلیم کے بارے میں متفکّر نہیں ہونا چاہیۓ۔ کیونکہ وہ ہسپتال میں کام کرنے والے فیکلٹی ممبران کے بچوں کے لیے ہسپتال ہی میں اسکول قائم کریں گے۔ اسکول کا الحاق برطانوی تعلیمی اداروں کے ساتھ ہو گا۔ بچوں کی تعلیم برطانوی تعلیمی معیار کے مطابق ہو گی اور امتحانات بھی

برطانوی تعلیمی ادارے لیں گے۔ اس طرح مونا کی تعلیم بین الاقوامی معیار کے مطابق ہو گی اور وہ بڑی ہو کر برطانیہ یا امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے سکے گی۔

سمیرا کی وضاحت سے حیدر کی مونا کی تعلیم کے بارے میں ایک بہت بڑی فکر دور ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ رضوان بھی ہسپتال اور ریسرچ سنٹر میں کام کرنے والے ملازمین کے بچوں کی تعلیم کے اس بندوبست سے خوش ہو گا۔

سمیرا حیدر کو بتا رہی تھی کہ ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کی عمارات فنِ تعمیر کا شاہکار ہیں۔ سینکڑوں ایکڑ پر مبنی نہر کے کنارے درختوں میں گھری یہ عمارات ایک دلہن کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ رہائشی علاقہ بھی امریکی معیاروں کے مطابق بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر رضوان اور اس کی امریکی بیوی اور بیٹی کو ااحساس نہیں ہو گا کہ وہ امریکہ میں رہ رہے ہیں یا پاکستان میں۔ حیدر کو یہ سب باتیں سن اور جان کر بہت اطمینان ہوا۔ اس نے سمیرا سے رضوان کے باپو اور امی کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیسے ہیں اور کیا وہ ہسپتال کے رہائشی علاقے میں منتقل ہو گئے ہیں۔ اس کے استفسار پر سمیرا نے بتایا کہ وہ روزانہ چند گھنٹوں کے لیے ہسپتال آتے ہیں اور اپنا زیادہ تر وقت باغبانی کے عملے کے ساتھ گزارتے ہیں۔ ان کی راہنمائی کی وجہ سے باغبانی کے عملے نے سارے ہسپتال کو ایک خطہ جنت نظیر میں تبدیل کر دیا ہے۔ لیکن وہ اپنی آبائی رہائش اور کام چھوڑنے پر تیار نہیں۔ ہم نے کئی طرح کوشش کی ہے کہ وہ وہاں منتقل ہو جائیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ ان کی زندگی اس گھر اور اس کام سے جڑی ہے۔ جس دن ان کا اس گھر یا اس کام سے ناطہ ٹوٹا وہ دن ان کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔

سمیرا اپنی باتیں کہہ چکی تو اس نے حیدر سے ان کی جنگ مخالف سرگرمیوں کے بارے میں پوچھا۔

حیدر سمیرا کے استفسار پر حیران ہوئِ۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ان کی جنگ مخالف ریلیوں میں شمولیت کی خبریں پاکستان میں جمال پور جیسے دور دراز گاؤں تک پہنچ رہی ہیں۔ سمیرا نے حیدر کے لہجے میں حیرانگی دیکھی تو کہنے لگی، چوہدری نثار کہیں سے حیدر، رضوان اور مونا کی امریکی اخباروں میں چھپنے والی تصویر اٹھا

لائے تھے۔ سارے جمال پور میں اس تصویر کا چرچا ہے۔ تصویر دیکھ کر کئی لوگوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ سب منتظر ہیں۔ حیدر، رضوان اور مونا کو اپنے درمیان دیکھنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر مونا کے بارے میں سب بہت پر جوش ہیں۔ رضوان کے باپو، امی اور چوہدری نثار کی خوشی تو دیکھی نہیں جاتی۔ رضوان کے باپو اور امی بار بار مونا کی تصویر کو چومتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ وہ جلد سے جلد اپنی بیٹی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ سمیرا کی باتیں سن کر حیدر کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اسے لگا کہ ان سب نے اسے اور مونا کو دیکھا نہیں لیکن وہ سب اس کے اپنے ہیں۔ ان سب سے اس کا رشتہ ہے۔ ایک ایسا رشتہ جس کی گہرائی کی کوئی وجہ بیان نہیں کی جاسکتی۔

باتوں باتوں میں حیدر نے سمیرا سے پوچھا کہ اس کی اور اس کی سہیلیوں کی رضوان کے ساتھ اس قدر گہری وابستگی کی کیا وجہ ہے۔ بظاہر ان کا اس کے ساتھ محض دوستی کا رشتہ ہے لیکن وہ اس طرح رضوان کے ساتھ جڑی ہیں کہ دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ خاص طور پر رضوان کے کہنے پر انہوں نے پاکستان کے دور دراز علاقے میں ہسپتال اور ریسرچ سنٹر قائم کرنے کا جو معجزہ سرانجام دیا ہے وہ ناقابل یقین ہے۔ دنیا میں کہیں ایسے نہیں ہوتا۔

سمیرا حیدر کی بات سن کر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ بہت دیر ہنسنے کے بعد جب اس کی ہنسی کچھ کنٹرول ہوئی تو وہ کہنے لگی کہ وہ اور اس کی سہیلیاں رضوان کے ساتھ اپنے رشتے کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ لیکن رضوان ان کے لیے سب کچھ ہے۔ ان کی زندگی کا مقصد رضوان کی خواہشات کی بجا آوری ہے۔ وہ سب محسوس کرتی ہیں کہ ان کی تخلیق رضوان کے لیے کی گئی ہے۔

پھر سمیرا نے کے ای میں رضوان سے ہونے والی پہلی ملاقات سے لیکر نتھیا گلی کے جانوروں کے کنسرٹ اور رضوان کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہنے تک ساری تفصیلات حیدر کے گوش گزار کیں۔ حیدر نے دلچسپی سے ساری تفصیلات سنیں۔ پھر اس نے سمیرا سے پوچھا کہ کیا ان کے دل میں کبھی رضوان سے شادی کرنے اور اس سے بچے پیدا کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی؟

سمیرا نے کہا شروع شروع میں وہ اور اس کی سہیلیاں باہمی دوستی کے باوجود رضوان کے بارے میں ایک دوسرے سے مسابقت کر رہی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ رضوان اس کا شریکِ حیات بنے۔ لیکن جیسے جیسے رضوان کے ساتھ ان کے رشتے میں گہرائی آتی گئی اس سے شادی کرنے کا خیال پس منظر میں جاتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ رضوان کے ساتھ شادی انہیں ایک مہمل بات دکھائی دینے لگی۔ رضوان کے ساتھ ان کی محبت میں کچھ ایسی سرشاری کی کیفیت ہے کہ وہ چاہیں بھی تو اس سے باہر نہیں آ سکتیں۔

رضوان کی محبت اور دوستی وہ قدرِ مشترک ہے جس سے اب وہ چاروں ایک دوسرے کے ساتھ بندھی ہیں۔ لیکن وہ نہیں جانتیں کہ اس کے ساتھ ان کا کیا رشتہ ہے؟

اس رشتے میں نہ جنس شامل ہے، نہ عقیدت، نہ دانشوری، نہ قرب کی خواہش اور جذبہ اور نہ کسی انعام یا صلے کی تمنا۔

اس نے حیدر کو بتایا جب وہ پانچوں لاہور میں ایک ساتھ ایک گھر میں رہ رہے تھے شہر کے ملّاؤں نے ان کے ایک ساتھ رہنے کو ایک بہت بڑا مسئلہ بنا دیا تھا۔ وہ احمق نہیں جانتے تھے کہ جنس، عقیدت، دانشوری، اور قرب کی خواہش کے علاوہ بھی کئی تعلق اور رشتے ہیں جن کا کوئی نام نہیں۔ جن کی نہ تفہیم ممکن ہے اور نہ کسی طرح ان کی کوئی تشریح کی جا سکتی ہے۔ بس یوں ہے کہ رضوان ایک سورج ہے اور ہم چاروں سیاروں کی طرح ہیں جو اس کے گرد نامعلوم وقت سے گھوم رہی ہیں اور تا ابد یونہی گھومتی رہیں گی۔

حیدر نے سمیرا کی تصحیح کرتے ہوئے کہا کہ اب اسے چار نہیں پانچ سیارے کہنا چاہیئے۔ اب رضوان کے گرد گھومنے والے سیاروں میں حیدر بھی شامل ہے اور حیدر کے ارد گرد گھومنے والی چاند سی مونا بھی۔

حیدر کی فون پر مسلسل گفتگو سے رضوان کی آنکھ کھلی تو اس کی باتوں سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ سمیرا سے بات کر رہی ہے۔ حیدر نے رضوان کو آنکھیں ملتے دیکھا تو اس نے سمیرا کو خداحافظ کہہ کر فون اسے تھما دیا۔

علیک سلیک کے بعد سمیرا نے رضوان کو ہسپتال کے پراجیکٹ کی تکمیل کا مژدہ سنایا۔ پاکستان کے میڈیا میں اس کی تشہیر کی خبر سنائی۔ لوگوں میں ہسپتال کی پذیرائی کی تفصیلات بتائیں۔ جمال پور کے لوگوں میں ہسپتال کے حوالے سے پائے جانے والے جوش و جذبے کا ذکر کیا۔ اس نے رضوان کو بتایا کہ ایک نامور ایرانی مجسمہ ساز نے اس کی گدھے والی تصویر کو ایک شاہکار مجسمے میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس کی تنصیب بھی کر دی گئی ہے۔ افتتاح کے وقت اس کی رونمائی کی جائے گی۔

افتتاح کے لیے مختلف لوگوں کی طرف سے مختلف نام تجویز کیے جا رہے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کا افتتاح باپو سے کرایا جائے۔ لیکن وہ مانتے نہیں۔ وہ کہتے ہیں اس کا افتتاح رضوان کے پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کریں گے جنھوں نے شیر و کمہار جیسے بے مایہ انسان کے بیٹے کو راجو سے رضوان بنایا۔

رضوان نے سمیرا سے کہا اسے اپنے باپو کی بات سے اتفاق ہے۔ اس نے کہا اس کے باپو کے بعد اس کی زندگی میں تین اشخاص بہت اہم ہیں۔ پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر، ہائی اسکول میں اس کے موسیقی کے استاد، اور گورنمنٹ کالج میں اس کے بیالوجی کے استاد ڈاکٹر نذیر احمد۔ ان میں سے کوئی ایک اکیلا یا اس کے باپو کے ساتھ مل کر مجسمے کی رونمائی کرے تو اسے خوشی ہو گی۔ لیکن انہیں اس موقع کے لیے اس کا، حیدر کا اور مونا کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس کی خواہش ہے کہ اس اہم موقع پر وہ حیدر اور مونا پاکستان میں ہوں۔

سمیرا نے فون بند کیا تو حیدر نے رضوان سے کہا وہ چاہتی ہے کہ وہ سب پاکستان جائیں۔ وہ ملنا چاہتی ہے رضوان کے ممی ڈیڈی سے، سمیرا سے، عذرا سے، یاسمین سے اور شائستہ سے۔ اس دنیا میں جانا چاہتی

جہاں رضوان نے جنم لیا تھا۔ اس مٹی کی خوشبو سونگھنا چاہتی ہے جو رضوان کے رگ و ریشے میں سمائی ہے۔ رضوان نے آگے بڑھ کر حیدر کو بازووں میں تھام لیا اور کہا جانم ہم سب پاکستان جائیں گے اور بہت جلد جائیں گے۔

مونا بھی اپنے بستر پر بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے بھی حیدر اور رضوان کی بات سن لی تھی۔ وہ بھی اپنی توتلی زبان میں بولی:" اور پاپا میں بھی۔"

"ہاں بیٹی تم بھی۔" اور اس نے آگے بڑھ کر مونا کو اپنے بازووں میں اٹھا لیا۔

فصل 31

عراق جنگ کی مخالفت امریکہ سے نکل کر دنیا بھر کے عوام میں پھیل رہی تھی۔ شاید ہی کوئی ملک ہو جہاں عوام نے اس جنگ کی مخالفت نہ کی ہو۔

پوری دنیا میں ہر بڑے شہر میں عراق جنگ کے خلاف مظاہرے شروع ہو چکے تھے۔ لاطینی امریکہ، یورپ، افریقہ، مڈل ایسٹ، وسطی ایشیا اور ایشیا بعید کے عوام اپنے اپنے شہروں میں عراق جنگ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

امریکی عوام کی بڑی تعداد بھی اس جنگ کے خلاف ملک بھر میں ریلیاں نکال رہے تھے۔ کہیں کہیں جنگ کے حامی بھی امریکی فوجیوں کی حمایت کے نام پر جنگ کی حمایت میں ریلیاں نکال رہے تھے۔ کئی جگہ جنگ مخالف اور جنگ کے حامیوں کا آمنا سامنا بھی ہوا لیکن قانون نافذ کرنے والے اداروں کے مناسب انتظام کی وجہ سے کہیں بھی حالات ان کے قابو سے باہر نہ ہوئے۔

نیویارک میں ریلی کے دن مین ہیٹن میں ایک بڑا اسٹیج سجایا گیا۔ اسٹیج کے اوپر رضوان کی خواہش کے مطابق اس کی گدھے کے ساتھ کھنچی بہت بڑی تصویر آویزاں کی گئی۔ یہ اسٹیج ایسے مقام پر بنایا گیا تھا جہاں جنگ مخالف ریلی نے منتج ہونا تھا۔ مین ہیٹن نیویارک کا حقیقی معنوں میں بین الاقوامی علاقہ ہے۔ نہ صرف یہاں پر یو این کے دفاتر ہیں بلکہ تمام ملکوں کے قونصلیٹ بھی مین ہیٹن میں ہی ہیں۔ نیویارک اور نیویارک کے گرد و نواح میں رہنے والے مختلف قومیتوں کے لوگ اکثر یہاں پر اپنے اپنے قومی اہمیت کے دن مناتے ہیں۔ پولیس کے چاق و چوبند دستے ہر قسم کی صورت حال سے نپٹنے کے لیے ہر ریلی کے ارد گرد موجود ہوتے ہیں۔ ریلیوں میں شامل لوگ پولیس کے ساتھ طے کردہ اصول و ضوابط کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے جذبات کا بھرپور انداز میں اظہار کرتے ہیں۔

سال کا شاید ہی کوئی دن ہو گا جب امریکہ میں دنیا بھر کے آباد کار اپنے خاص اہمیت کے دن منانے کے لیے مین ہیٹن میں جلسوں، جلوسوں اور میلوں ٹھیلوں کا اہتمام نہ کرتے ہوں۔

جنگ مخالف تنظیموں کے چیدہ چیدہ راہنما چاہتے تھے کہ وہ حسبِ روایت ریلی کے اہتمام پر ریلی کے شرکا سے خطاب کریں گے۔ رضوان نے ان سے طے کر رکھا تھا کہ انہوں نے جو کچھ کہنا ہو وہ اس کے وائلن بجانے سے پہلے کہہ لیں۔ اس نے انہیں یہ بھی تجویز کیا کہ اگر وہاں وہ صرف وائلن بجائے تو یہ کافی ہو گا اس کے وائلن بجانے کے بعد کسی کو سرے سے تقریر کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ جنگ مخالف تنظیموں کے نمائندے رضوان کی بات سمجھنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے آج تک جتنے کنسرٹ دیکھے تھے، جتنے کنسرٹوں میں حصہ لیا تھا کوئی ایسا نہیں تھا کہ جہاں ایسی صورت حال درپیش ہوئی ہو کہ کچھ کہنے سننے کی گنجائش باقی نہ رہے۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ رضوان کوئی عام وائلنسٹ نہیں ہے۔ اس کی وائلن صرف دھنیں نہیں بجاتی بلکہ اپنی اثر آفرینی سے مٹی میں جان پیدا کر دیتی ہے۔

جنگ مخالف تنظیموں نے امریکہ کے طول و عرض میں سین فرانسسکو اور لاس اینجلس سے لے کر شکاگو اور واشنگٹن تک تقریباً ہر بڑے شہر میں جنگ کے خلاف کامیاب ریلیاں نکالیں تھیں جن میں ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی تھی۔ لیکن مین ہیٹن ریلی کی بات ہی کچھ اور تھی۔

جنگ مخالف تنظیموں نے بھرپور کوشش کی تھی کہ اس ریلی کے ذریعے ثابت کریں کہ انہیں حقیقی معنوں میں عوام کی حمایت حاصل ہے۔ اور لوگ جنگ نہیں امن کے خواہاں ہیں۔ ایک ایسا امن جہاں وہ سکون اور چین سے اپنی زندگیاں گزار سکیں۔ اپنے بچوں کو پروان چڑھا سکیں اور اپنے خاندانوں کی کفالت کر سکیں۔

پولیس نے پوری کوشش کی تھی کہ اس جنگ مخالف ریلی میں جنگ کے حامی نہ آنے پائیں لیکن پولیس کی کوشش کے باوجود جنگ کے حامی چند بڑے بڑے گروپوں کی شکل میں جنگ مخالفوں کی ریلی میں آ گھسے

تھے اور مختلف جگہوں پر کھڑے ہو کر مسلسل جنگ کی حمایت میں نعرے لگا رہے تھے۔ پولیس کوشش کر رہی تھی کہ انہیں وہاں سے باہر نکال دے لیکن جنگ مخالفوں کی ریلی میں اتنے زیادہ لوگ تھے اور جنگ کے حامی ان میں اس طرح بکھرے تھے کہ پولیس ایک گروپ کے پاس جاتی تو دوسرا گروپ جنگ کی حمایت میں نعرے بازی شروع کر دیتا۔

اس صورت حال سے جنگ کے مخالفین خاصے پریشان تھے اور مسلسل پولیس کے ساتھ الجھ رہے تھے۔ لیکن جنگ کے حامی پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی میں مصروف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جنگ مخالفوں کی اس ریلی کو بہر صورت ناکام بنایا جائے۔

ٹی وی چینلز اس دلچسپ صورت حال کی اپنی نشریات میں مسلسل تشہیر کر رہے تھے۔ جنگ مخالف تنظیموں کے نمائندے اسٹیج پر اپنے حامیوں سے اپیل کر رہے تھے کہ اپنے اندر گھسے ہوے جنگ کے حامیوں کو نکال باہر کریں۔

حیدر، رضوان اور مونا اسٹیج کے پاس کھڑے تھے۔ مونا رضوان کے کندھوں پر سوار تھی۔ اور ریلی کے شور وغل سے محظوظ ہو رہی تھی۔ گاہے گاہے وہ بھی اپنی توتلی زبان سے ان کے نعروں کو دہرا رہی تھی۔ جب صورت حال خاصی مضحکہ خیز ہو گئی اور بدمزگی پیدا ہونے لگی تو رضوان نے مونا کو حیدر کے کندھوں پر سوار کیا اور خود وائلن کے باکس سے وائلن نکال کر اسٹیج پر چلا گیا۔

چونکہ اسٹیج کے پیچھے گدھے کے ساتھ اس کی زندگی سے بڑی تصویر آویزاں تھی جنگ مخالفوں اور جنگ کے حامیوں نے اسٹیج پر اس کی آمد کا نوٹس لیا اور خاموش ہو گئے۔ ویسے بھی امریکی فنون لطیفہ کے بہت رسیا ہیں۔ خاص طور پر کنسرٹ کی شکل میں موسیقی سننا انہیں بہت پسند ہے۔ اس کے اسٹیج پر آنے سے لوگوں کی کچھ ہلڑبازی رکی تو ریلی کے منتظمین کو موسیقی کی طاقت اور افادیت کا اندازہ ہوا۔ انہوں نے تقریروں کا فارمیٹ ختم کر کے اسٹیج رضوان کے حوالے کیا اور خود الگ سے کھڑے ہو گئے۔

منتظمین میں سے ایک نے آگے بڑھ کر رضوان کا تعارف کروانے کا عندیہ دیا لیکن رضوان نے اسے یہ کہہ کر ہاتھ کے اشارے سے روک دیا کہ وہ اپنا تعارف آپ ہے۔ اسے کسی فارمل تعارف کی ضرورت نہیں۔ پھر اس نے اپنی وائلن اپنے بائیں کندھے پر رکھی، بائیں ہاتھ کی انگلیاں وائلن پر درست کیں اور دائیں ہاتھ سے باؤ وائلن کے تاروں پر رکھ کر چند بار اسے ہلا کر چند ٹیونیں بجائیں اور پھر اسپیکر میں حاضرین سے مخاطب ہوا:

"حاضرین، اس سے پہلے کہ میں آج کے دن مین ہیٹن میں جنگ مخالف ریلی میں وائلن کی پرفارمنس شروع کروں میں ایک وارننگ جاری کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

یہ وارننگ ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو اپنے گھروں میں بیٹھے اپنے ٹی وی چینلز پر یہ پرفارمنس دیکھنے جا رہے ہیں۔

آج میں وائلن کے ذریعے ہر سننے والے کے ان ڈی این ایز میں ایڈجسمنٹ کرنے جا رہا ہوں جس سے وہ وائلنس پر آمادہ ہوتے ہیں یا وائلنس کرتے ہیں۔

جنگ ایک تشدد آمیز کام ہے۔ یہ وہ تشدد آمیز کام ہے جس میں انسان ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ انسانی بستیاں ویران کرتے ہیں، ملک تاراج کرتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے وسائل پر قابض ہونے کے لیے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے سے دریغ نہیں کرتے۔ آج جتنے لوگ بھی اس ریلی میں موجود ہیں یا اپنے گھروں میں کسی ٹی وی چینل پر یہ پرفارمنس دیکھ رہیں اگر وہ آج کے بعد بھی جنگ کی حمایت کرنا چاہتے ہوں، یا زندگی میں تشدد جاری رکھنا چاہتے ہوں وہ یہ پرفارمنس نہ دیکھیں۔ جو لوگ فوج میں ملازمت کرتے ہیں اور اپنی ملازمت جاری رکھنا چاہتے ہیں وہ بھی یہ پرفارمنس نہ دیکھیں کیونکہ آج کی پرفارمنس دیکھنے کے بعد ان کے لیے فوج کی ملازمت جاری رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے دھیرے دھیرے وائلن پر باؤ کو حرکت دینی شروع کی۔ پہلے اس نے ڈیوشنل دھنیں بجائیں۔ ڈیوشنل دُھنوں کے آغاز کے بعد سننے والوں کی آنکھیں بند ہونا شروع ہوئیں۔ وائلن کی

ڈیو شنل ٹیونوں سے نہ صرف ریلی میں موجود سب لوگوں کی آنکھیں موند گئیں بلکہ جو لوگ گھروں میں ٹی وی چینلز پر یہ پرفارمنس دیکھ رہے تھے ان پر بھی ان دھنوں کا یکساں اثر ہو رہا تھا۔
پندرہ بیس منٹ تک ڈیو شنل دھنیں بجانے کے بعد اس نے رفتہ رفتہ وائلن کے آہنگ اور دھنوں میں تبدیلی کا عمل شروع کیا۔ سب سامعین کی آنکھیں بند تھیں۔ چاہنے کے باوجود بھی وہ اپنی آنکھیں کھولنے پر قادر نہیں تھے۔

دھنوں میں تبدیلی سے وہ اپنی روحوں کی گہرائیوں میں اترنا شروع ہو گئے۔ نیچے، نیچے اور نیچے جاتے چلے گئے۔ سب نے محسوس کیا کہ وہ پانی میں کھڑے ہیں اور پانی کی سطح پر تیرتے کاسنی رنگ کے ایک لوٹس کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ جیسے جیسے لوٹس کے قریب جاتے ہیں لوٹس اور آگے چلا جاتا ہے۔ وہ چند قدم لوٹس کی طرف آگے بڑھاتے ہیں تو لوٹس اور آگے چلا جاتا۔
جیسے جیسے وہ لوٹس کے تعاقب میں آگے بڑھتے ہیں پانی گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود کو گردن تک پانی میں پاتے ہیں۔ اس وقت لوٹس عین ان کی آنکھوں کے سامنے رک جاتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ لوٹس کو پکڑ لیں لیکن وہ پکڑ نہیں سکتے۔
یہاں رضوان پھر وائلن کی دھنوں کو پلٹا دیتا ہے۔ اپنی اپنی روحوں کی گہرائی میں پہنچے سامعین محسوس کرتے ہیں کہ لوٹس کا کاسنی رنگ رفتہ رفتہ تبدیل ہونے لگا ہے۔ پہلے لوٹس کے کاسنی رنگ میں ہلکی ہلکی سفید شیڈز نمودار ہوتی ہیں۔ پھر اس کے رنگ میں سفیدی آنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا رنگ دودھیا سفید ہو جاتا ہے اور وہ پوری طرح کھل اٹھتا ہے۔ اس کی بیرونی پتیاں پانی کو چھونے لگتی ہیں۔
سب سامعین کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کا سفید رنگ کا لوٹس ان کی نظروں کے سامنے پانی میں ان کے اتنا قریب ہے کہ وہ آسانی سے اسے اپنے ہونٹوں سے چھو سکتے ہیں۔
اس گہرائی میں رضوان وائلن کی دھنوں کی مدد سے ان کے ڈی این ایز میں تشدد اور جنگ کے کوڈز کو اس طرح تبدیل کرتا ہے کہ ان کی شخصیات میں سے تشدد اور جنگ کی خواہش اور جذبہ ختم ہو جاتا

ہے۔ وہ سب پر امن انسان بن جاتے ہیں۔ انہیں جنگ کے نام سے گھن آنے لگتی ہے۔ وہ سب سفید پورے کھلے ہوئے لوٹس کو اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں۔

اس سارے عمل کے بعد رضوان وائلن پر ایسی دھنیں بجاتا ہے جن کے زیر اثر وہ سب اپنے اپنے سفید لوٹس اپنے ہاتھوں میں تھامے رفتہ رفتہ الٹے قدموں پانی سے باہر آنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ انہیں روح کی گہرائیوں سے کھینچ کر پہلے ہلکی اور پھر مکمل شعوری حالت میں واپس لے آتا ہے۔

مونا جو حیدر کے کندھوں پر بیٹھی اس کیفیت سے گزرتی ہے آنکھیں کھولتے ہی اپنے بازو اس کی طرف پھیلا دیتی ہے۔ وہ وائلن اسٹیج پر ایک طرف رکھ کر مونا کو اپنے بازوں میں اٹھالیتا ہے۔ ریلی کے سب شرکا اپنی اپنی جگہ پر کھڑے زبردست تالیاں بجاتے ہیں۔ پھر سب ایک کورس کی شکل میں گانا شروع ہو جاتے ہیں:

جنگ ایک جرم ہے
انسانیت کے خلاف
جنگ ایک جرم ہے
روح کائنات کے خلاف
ہم جنگ نہیں ہونے دیں گے
جنگ ایک جرم ہے
ان معصوم گلوں کے خلاف
جو بارود کے حبس سے
کھلنے سے پہلے
مرجھا جاتے ہیں
جنگ ایک جرم ہے

ان نوبیاہتا دلہنوں کے خلاف
جن کے سہاگ
اپنے سہروں کے پھول
مرجھانے سے پہلے
آسماں سے برستے بموں
یا میدان جنگ میں
سنسناتی گولیوں سے
اپنے لہو میں شنا کرتے ہیں
جنگ ایک جرم ہے
ان غمزدہ ماؤں کے خلاف
جن کے اپنے بچوں کی
سلامتی کے لیے
دعا مانگتے ہونٹ
مجبور ہوتے ہیں
بوسہ دینے کے لیے
موت کی ٹھٹھرتی گود میں
سوئے ہوئے بچوں
کی پیشانیوں پر
جنگ ایک جرم ہے
ان غمزدہ بوڑھے باپوں کے خلاف

جن کی دھندلائی آنکھیں
اپنے بچوں کے
بموں سے سڑے
ہوئے جسموں کو دیکھ کر
ہمیشہ کے لیے
ڈوب جاتی ہیں تاریکیوں میں
جنگ ایک جرم ہے
انسانیت کے خلاف
جنگ ایک جرم ہے
روحِ کائنات کے خلاف
ہم جنگ نہیں ہونے دیں گے

لوگ کورس کی شکل میں جنگ کے خلاف گیت گا رہے تھے۔ رضوان مونا کو کندھوں پر اٹھائے، اپنی وائلن کا باکس ہاتھ میں پکڑے، حیدر کے ساتھ ریلی سے باہر جارہا تھا۔

ریلی کے شرکا اس کے احترام میں جنگ کے خلاف گیت گاتے ہوئے اُسے ریلی سے باہر جانے کا راستہ دے رہے تھے۔

اس دن سینکڑوں فوجیوں نے جو اسی جنگ مخالف ریلی میں موجود تھے آرمی سے استعفی دے دیا۔

اگلے دن یو ایس اے کے سب اخباروں نے رضوان، حیدر اور مونا کی تصویر اسٹیج پر آویزاں گدھے والی تصویر کے ساتھ سرورق شائع کی۔ سب نے اس کی پرفارمنس پر اسے زبردست خراج تحسین پیش کیا۔

ایک اخبار نے اس کی تصویر کے ساتھ کیپشن لگایا:

"جادو گر پاکستانی وائلنسٹ۔ جس نے وائلن کی دھنوں سے لاکھوں لوگوں کے ڈی این اے کوڈز تبدیل کر دیئے۔"

دوسرے اخبار نے تصویر کے ساتھ کیپشن لگایا:

" وائلن کا معجزہ: لاکھوں انسانوں کے ڈی این ایز تبدیل"

ایک اور اخبار کا تصویر کے ساتھ کیپشن تھا:

"وائلن برائے امن۔"

حیدر نے یہ سب اخبارات دیکھے تو بے اختیار رضوان سے لپٹ گئی:

"رضوان تمہارا شکریہ۔ تم نے ہماری دنیا کو اپنے وائلن کی دھنوں سے پہلے سے کچھ محفوظ بنا دیا ہے۔"

رضوان نے بوسے سے حیدر کا منہ بند کر دیا اور پھر کہا:

"جانم، محبت میں شکریہ ادا نہیں کیا جاتا، صرف محبت لوٹائی جاتی ہے۔"

فصل 32

رضوان کی وائلن نے جنگ مخالف قوتوں کی ریلی کے لیے جو کارنامہ سرانجام دیا اس سے متاثر ہو کر تمام جنگ مخالف تنظیموں نے اس کے اعزاز میں ایک ڈنر کا اہتمام کیا۔

جمال پور میں ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کی تکمیل کے بعد رضوان کی خواہش تھی کہ وہ جلد سے جلد پاکستان لوٹے اور ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کے نظام کو موثر انداز میں متحرک کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کرے۔

نیویارک ریلی میں بجائی جانے والی وائلن کے اثرات کی خبریں شائع ہونے کے بعد یو ایس اے میں موسیقی کے اسرار و رموز اور انسانی فطرت پر اس کے اثرات کے حوالے سے نئی بحث چھڑ گئی۔ ٹی وی ٹاک شوز اور اخبارات میں زندگی کے مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے دانشور رضوان کی پرفارمنس کے حوالے سے اس مسئلے پر بحث میں مصروف ہو گئے۔

کئی ٹی وی ٹاک شوز کے میزبانوں نے رضوان کو دعوت دی کہ وہ اس مسئلے پر ان کے پروگرام میں شامل ہو لیکن رضوان نے ان پروگراموں میں شمولیت سے احتراز کیا۔

اسے اندازہ تھا کہ اگر ایک بار وہ اس بحث میں الجھا تو پھر ایسے نئے امکانات کھلتے چلے جائیں گے جن سے وہ زندگی کے اس موڑ پر ڈیل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اسی وجہ سے جنگ مخالف تنظیموں کی طرف سے اس کے اعزاز میں مجوزہ ڈنر میں شمولیت کے لیے ملنے والی دعوت پر بھی اسے کچھ تحفظات تھے۔ وہ زندگی میں اپنی غیر معمولی کامیابیوں کے باوجود ایک منکسر المزاج آدمی تھا۔ اپنے باپو کی نصیحت کے مطابق مٹی سے جُڑے رہنے میں عافیت سمجھتا تھا۔

نیویارک میں وائلن کی پرفارمنس کی دھوم میں ایک بڑا واقعہ فوج کی ملازمت سے ان سینکڑوں فوجیوں کا استعفی تھا جو وائلن سننے کے بعد فوج کی ملازمت جاری نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

ان کا کہنا تھا کہ فوج کا حصہ رہتے ہوئے انہیں کسی بھی وقت جنگ لڑنے کے احکامات مل سکتے ہیں اور اب وہ جنگ لڑنے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔

ایک آدھ فوجی تو ہمہ وقت مختلف وجوحات کی بنیاد پر جنگ میں شمولیت سے دور رہنے کی لیے عذر تراشی کر تا رہتا ہے لیکن سینکڑوں افراد کا بیک وقت فوجی ملازمت سے مستعفی ہو جانا حکمرانوں کے لیے ایک تعجب کی بات تھی۔ جس پر ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ ان کا خیال تھا اگر وائلن کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تو ان کے لیے فوج میں بھرتی کرنے کے لیے نوجوانوں کی فراہمی کا عمل رُک جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو ریاست کے لیے اپنی جنگیں جاری رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔

اس پس منظر میں ایک دن نیویارک کے اٹارنی جنرل نے رضوان کو ایک نوٹس کے ذریعے اپنے آفس میں طلب کیا۔

اٹارنی جنرل صاحب چاہتے تھے کہ وہ رضوان کے مستقبل کے ارادوں اور منصوبوں کا جائزہ لیں۔

نیویارک کے اٹارنی جنرل قانوناً اسے طلب نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ نیویارک کا رہائشی نہیں تھا۔ اس مقصد کے لیے انہیں بالٹی مور کے اٹارنی جنرل کے ذریعے جانا چاہیے تھا لیکن چونکہ یہ کوئی قانونی کاروائی نہیں تھی اس لیے انہوں نے اسے براہِ راست خط لکھا تھا کہ وہ فون پر ان سے رابطہ کرے۔

جس دن اٹارنی جنرل کا خط آیا، رضوان گھر پر نہیں تھا۔ حیدر نے خط کھولا تو پڑھنے کے بعد اس نے فون پر اٹارنی جنرل کے دفتر سے رابطہ کیا اور ان سے استفسار کیا کہ انہیں کس سلسلے میں رضوان سے ملاقات درکار ہے۔

اٹارنی جنرل نے کہا کہ نیویارک میں وائلن کی پرفارمنس سننے کے بعد سینکڑوں فوجیوں نے فوج سے استعفی دے دیا ہے۔ کئی محکموں کے افسران اس واقعہ کے بعد متفکر ہیں کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو اس سے ریاست کی جنگ لڑنے کی اہلیت کمزور ہو گی جس سے ریاست کے مفادات خطرے میں پڑ جائیں

گے۔ چونکہ یہ پرفارمنس نیویارک میں منعقد ہوئی تھی اس لیے انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا ہے کہ میں رضوان سے ملاقات کروں اوراس سے اس کے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں استفسار کروں۔

حیدر نے اٹارنی جنرل کی بات سن کر اطمینان کا سانس لیا۔ اور پھر ان سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ ہفتے کسی دن رضوان کو لے کر ان کے دفتر آئے گی پھر وہ رضوان سے جو کچھ بھی پوچھنا چاہیں پوچھ لیں۔

رضوان جانز ہاپکنز سے واپس لوٹا تو حیدر نے اسے اٹارنی جنرل کا خط دکھا کر اسے بتایا کہ اس نے فون پر ان سے گفتگو کی ہے۔ پھر اس نے اسے گفتگو کی تفصیلات بتائیں۔ اس نے کہا کہ وہ اٹارنی جنرل سے ضرور ملے گا۔ اور نیویارک کی پرفارمنس کے حوالے سے اس کے سوالوں کا جواب دے گا۔ اگلے ہفتے رضوان حیدر اور مونا کے ہمراہ اپنی گاڑی پر نیویارک گیا اور اٹارنی جنرل سے ملا۔

اٹارنی جنرل نے خندہ پیشانی سے اسے اپنے دفتر میں خوش آمدید کہا۔ اور پھر نیویارک میں اس کی وائلن کی پرفامنس کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس دن اس نے واقعتاً کمال کر دیا تھا۔ جس طرح جنگ مخالف اور جنگ کے حامی صورت حال کو خراب کرنے پر تلے ہوئے تھے اس نے وائلن بجا کر انہیں ٹھنڈا کر کے قانون نافذ کرنے والوں کی بہت مدد کی تھی جس کے لیے وہ سب اس کے شکر گزار ہیں۔

لیکن اس کی وائلن کے اس دن کچھ منفی اثرات بھی مرتب ہوئے جس پر مختلف حکومتی محکموں کے سربراہان کو خاصی تشویش ہے۔ رضوان نے اٹارنی جنرل کے الفاظ "منفی اثرات" اور "تشویش" کی ان سے وضاحت چاہی۔

"منفی اثرات" یہ کہ وائلن سننے کے بعد سینکڑوں فوجیوں نے اپنی ملازمتوں سے استعفی دے دیا ہے۔ اب وہ جنگ نہیں لڑنا چاہتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے اندر جنگ لڑنے کی اُپج ختم ہو گئی ہے۔ اور "تشویش" اس بات پر کہ اگر وائلن بجانے کا یہ سلسلہ چلتا رہا تو ریاست کو فوج میں بھرتی کرنے کے لیے نوجوان ملنا بند ہو جائیں گے۔"

اٹارنی جنرل کے استدلال پر رضوان نے قہقہہ لگا کر ہنسنا چاہا لیکن پھر دفتری آداب کے پیش نظر صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

اٹارنی جنرل نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

فوج ریاست کا ایک ضروری ادارہ ہے۔ ہر ریاست کو اپنے دفاع کے لیے فوج کی ضرورت ہوتی ہے۔ فوج جنگ لڑتی ہے تو قتل و غارت بھی ہوتی ہے۔ لوگ بھی مرتے ہیں۔ کئی لوگوں کا مرنا جنگی ضابطوں کے مطابق ہوتا ہے کئی بے گناہ بھی مر جاتے ہیں۔ لیکن ریاست کا کاروبار اسی طرح چلتا ہے۔

رضوان نے اٹارنی جنرل کی گفتگو سنی تو اس نے کہا کہ اٹارنی جنرل صاحب اسے یہ بتائیں کہ اس نے کوئی کام اصول یا قانون کے خلاف سرانجام دیا ہے۔

ریلی اور موسیقی کی پرفارمنس کے لیے پولیس سے اجازت نامہ حاصل کیا گیا تھا۔ وائلن بجانے سے پہلے اس نے سامعین کو وارننگ دی تھی کہ فوج کے شعبے سے وابستہ لوگ یہ پرفارمنس نہ دیکھیں کیونکہ یہ پرفارمنس دیکھنے کے بعد اُن کے لیے جنگ یا کسی اور تشدد آمیز واقعات میں حصہ لینا ممکن نہیں رہے گا۔ اگر اُس کی وارننگ کے باوجود کچھ فوجی وہاں بیٹھے رہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے؟

اٹارنی جنرل نے رضوان سے اتفاق کیا۔ بلکہ اس کی تحسین کی کہ اس نے اپنی وائلن سے اِتنے بڑے مجمع کو خلفشار سے بچایا اور لوگوں کو تشدد کی راہ اختیار کرنے سے باز رکھا۔

اٹارنی جنرل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اُن کے سب حکومتی اہل کار رضوان کے ٹیلینٹ کے بہت مداح ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے یو ایس اے میں مقیم رہے اور اس ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کرے۔

رضوان نے اٹارنی جنرل کی پیشکش کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس نے اپنے پیدائشی گاؤں میں ایک ہسپتال اور ایک ریسرچ سنٹر قائم کیا ہے۔ ریسرچ سنٹر جانز ہاپکنز اور ہارورڈ سے منسلک ہے۔ اس طرح وہاں جتنا

ریسرچ ورک ہو گا سب جانز ہاپکنز اور ہارورڈ سے اور جو ریسرچ ورک یہاں ہو گا وہ جمال پور ریسرچ سنٹر سے شئیر کیا جائے گا۔ اس طرح اس کے یہاں یا وہاں ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

رضوان کی وضاحت سے اٹارنی جنرل کی تسلی ہوئی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ رضوان اپنی میڈیکل ریسرچ جاری رکھنا چاہتا ہے۔ اور جنگ مخالف سرگرمیوں میں حصہ لینا اس کی اولین ترجیح نہیں ہے۔ اٹارنی جنرل سے رضوان کی میٹنگ ختم ہوئی تو حیدر کے غیر ضروری خدشات دور ہوئے۔

اتفاق سے جنگ مخالف تنظیموں نے اسی دن نیویارک میں ڈنر کا اہتمام کر رکھا تھا۔ رضوان نے ابھی تک ان سے ڈنر میں شمولیت کے لیے ہاں یا نہ نہیں کی تھی۔

شہر میں موجود ہونے کے وجہ سے اس نے حیدر سے کہا کہ وہ رات کو جنگ مخالف تنظیموں کے ڈنر میں شامل ہوں گے اور ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد واپس بالٹی مور جائیں گے۔

حیدر نے رضوان کے فیصلے سے اتفاق کیا۔ رضوان کی دفتری مصروفیات کی وجہ سے سوائے ریلیوں کے کئی دنوں سے وہ کہیں آئے گئے نہیں تھے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ ڈنر میں جانے سے پہلے وہ مونا کو مجسمہء آزادی دکھائیں گے۔ ہیلی کاپٹر پر نیویارک کا ائیر ویو لیں گے۔ پھر ٹور بس پر بیٹھ کر نیویارک کی تمام معروف جگہیں دیکھیں گے۔ اور رات کو جنگ مخالف تنظیموں کے ڈنر میں شامل ہونے کے بعد بالٹی مور لوٹیں گے۔

رضوان، حیدر اور مونا جیسے ہی اٹارنی جنرل کے دفتر سے باہر نکلے اخبارات کے رپورٹروں کی ان پر نظریں پڑیں۔ رپورٹروں نے ان کی بے تحاشا تصاویر کھینچنا شروع کر دیں اور پھر ان سے اٹارنی جنرل کے دفتر جانے کی وجوحات پوچھتے رہے۔

حیدر نے رضوان کو رپورٹروں سے بات کرنے سے منع کر دیا اور پھر خود ان کے سوالوں کے جواب دینے شروع کر دیئے۔ اس نے بڑے سلیقے کے ساتھ رپورٹروں کو یقین دلایا کہ اٹارنی جنرل کے ساتھ یہ روٹین کی ملاقات تھی۔

اٹارنی جنرل رضوان سے ریلی کے بارے میں تبادلہ خیال کرنا چاہتے تھے۔

ایک دفعہ سپاٹ ہو جانے کے بعد رضوان اور حیدر کے لیے رپورٹروں سے جان چھڑانا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ وہ شہر میں جہاں گئے رپورٹر ان کے آگے پیچھے گھومتے رہے۔

اگلے دن نیویارک کے سبھی اخباروں نے رضوان اور حیدر کی دن بھر کی مصروفیات کی رپورٹ شائع کی تھی۔

رضوان، حیدر اور مونا ایک سلیبرٹی فیملی بن چکے تھے۔ خاص طور پر جنگ مخالف تنظیموں کے ڈنر میں ان کی شمولیت کو ہائی لائٹ کیا گیا تھا۔

امریکہ میں رضوان اور اس کی فیملی کے سلیبرٹی اسٹیٹس کا نوٹس پاکستانی میڈیا نے بھی لیا۔ کے ای کالج کے زمانے میں اسلام پسند قوتوں کے اخباری رپورٹروں نے رضوان کے بارے میں امریکی اخباروں میں شائع ہونے والی رپورٹیں اور چھپنے والی تصویروں میں خاص دلچسپی لی۔ رضوان، حیدر، اور مونا کی نیکروں میں تصویر ان کی خاص توجہ کا مرکز بنی۔

ان سب حالات سے بے خبر رضوان، حیدر اور مونا پاکستان جانے کے تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ ان کی آئندہ چند روز کی سرگرمیوں اور توجہ کا مرکز صرف جمال پور ہسپتال اور ریسرچ سنٹر تھا۔

فصل 33

رضوان نے جب سے پاکستان جانے کا پروگرام بنایا تھا حیدر بہت خوش تھی۔ وہ تمام جاننے والے پاکستانیوں سے پاکستان میں سماجی زندگی کا رکھ رکھاؤ اور سلیقہ سیکھ رہی تھی۔

مقامی پاکستانی اسٹوروں سے اس نے اپنے اور مونا کے لیے پاکستانی شلوار قمیض، دوپٹے اور چادریں خریدیں۔ انہیں پہننا اور اوڑھنا سیکھا۔ گھر اور باہر والوں سے گفتگو کے آداب سیکھے۔ لینا دینا سیکھا اور اظہار محبت اور نفرت کے طریقے سیکھے۔

گویا وہ کسی بھی پاکستانی ائیرپورٹ پر ایک آئیڈیل پاکستانی خاتون کی طرح اترنے کے لیے تیار تھی۔ اگر وہ اپنی اُردو اور پنجابی درست کر لیتی تو سوائے اس کے بُھورے بالوں اور گورے رنگ کے کسی کو اندازہ نہ ہوتا کہ وہ غیر پاکستانی ہے۔

پاکستان میں بھی شیر و کمہار، اس کی بیوی نگو، چوہدری نثار، سمیرا، عذرا، یاسمین، شائستہ اور ہسپتال اور ریسرچ سنٹر میں کام کرنے والے عملے کے تمام ارکان ان کی پاکستان میں متوقع آمد کے بارے میں بہت پرجوش طریقے سے تیاریوں میں مصروف تھے۔ جمال پور کے لوگ بھی اپنے اس ہونہار و کامیاب بیٹے کی آمد پر اس کا اور اس کی فیملی کا بھرپور استقبال کرنا چاہتے تھے۔

لیکن کئی سال پہلے جو اسلام پسند اس کے طرز زندگی سے شاکی تھے اب وقت کے ساتھ پاکستان میں مزید توانا ہو چکے تھے۔ کئی ایک اپنے اخبار چلا رہے تھے۔ ان کی مذہبی تنظیمیں بھی پہلے سے زیادہ با اثر ہو چکی تھیں۔ جو ہر مسئلے پر حکومت کو ڈکٹیشن دیتی تھیں۔ ہر چیز کا تعلق مذہب سے جوڑتی تھیں۔ ہر ذی روح اور غیر ذی روح چیز کو انہوں نے مذہب کی رسی سے باندھ دیا تھا۔ کوئی چیز مذہب سے ذرا اِدھر اُدھر ہوتی تو یہ جماعتیں ملک میں طوفانِ بدتمیزی برپا کر دیتیں۔ اسلام کو انہوں نے ایسے قید خانے میں تبدیل کر دیا

جس میں کسی کے لیے نہ آزادی سے سانس لینا ممکن تھا نہ کوئی سماجی کام کرنا۔ ایک دیوانگی تھی جو انہوں نے پورے ملک میں طاری کرر کھی تھی۔

امریکی اخباروں میں رضوان اور اس کے چھوٹے سے خاندان کی چھپنے والی تصویروں نے ان کے کان کھڑے کر دیئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ رضوان پاکستان واپس آئے۔ اور اپنے آزادانہ لائف اسٹائل سے نوجوانوں کی توجہ کا مرکز بنے۔

اس مقصد کے لیے انہوں نے رضوان کی آمد سے قبل اس کے، اسکی بیوی اور بیٹی کے بارے میں میڈیا پر منفی تشہیر شروع کردی۔ ان کے لیے رضوان کی تمام صلاحیتیں بے معنی تھیں۔ دنیا کا جدید ترین صلاحیتوں سے مالا مال ہسپتال اور ریسرچ سنٹر بے معنی تھا۔ اس نے ذاتی زندگی میں ایک معمولی خاندان سے ہونے کے باوجود جو ترقی کی تھی، جو مرتبہ اور مقام حاصل کیا تھا، سب بے معنی تھا۔ انہوں نے اللہ رسول اور اسلام کو جو جاہلانہ معنی پہنا رکھے تھے رضوان اس میں فٹ نہیں ہوتا تھا اس لیے وہ گردن زدنی تھا۔

پاکستان میں امریکی سفارت خانے نے رضوان اور اس کی فیملی کے بارے میں میڈیا مہم دیکھی تو انہوں نے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ذریعے رضوان کو ساری صورت حال کے بارے میں مطلع کیا۔ رضوان پاکستانی پاسپورٹ ہولڈر تھا۔ وہ اسے صرف مشورہ دے سکتے تھے کہ وہ پاکستان آنے کا ارادہ ترک کردے۔ لیکن روک نہیں سکتے تھے۔ حیدر اور مونا امریکی شہری تھے۔ ان کے تحفظ کے بارے میں بھی وہ متفکر تھے۔ ان کے خلاف اسلام پسند جس طرح کے مضامین اخباروں میں لکھ رہے تھے اور جیسی زبان استعمال کر رہے تھے اس سے پاکستان میں ان کی سیفٹی کے بارے میں امریکی سفارت خانے کو بھی خدشات لاحق تھے۔

مونا تو خیر ابھی معصوم تھی۔ اپنے والدین کے ساتھ بندھی تھی۔ لیکن رضوان اور حیدر تو سمجھ دار تھے۔ انہیں یہ خبریں سن کر بہت تشویش ہوئی۔

ڈاکٹر اور مسز تھامسن، حیدر کے بھائی راجر، راجر کی بیوی اور ان کے سب ملنے جُلنے والوں کا خیال تھا کہ ان حالات میں رضوان کو پاکستان نہیں جانا چاہیئے۔ جہاں تک ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کا سوال تھا وہ امریکہ رہ کر ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اسے چلا سکتا ہے۔ لیکن رضوان پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ اپنا ذہن تبدیل کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

ڈاکٹر اور مسز تھامسن نے حیدر کو الگ سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ رضوان کے ساتھ پاکستان نہ جائے۔ لیکن حیدر نے یہ کہہ کر ان کا مشورہ ماننے سے انکار کر دیا کہ اس کا مرنا جینا رضوان کے ساتھ ہے۔ رضوان یہاں رہے گا تو وہ اس کے ساتھ یہاں رہے گی۔ اگر وہ پاکستان جائے گا تو وہ اس کے ساتھ پاکستان جائے گی۔ اگر اسے وہاں کسی ناخوشگوار صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اس کے ساتھ کھڑی ہو کر اس صورت حال کا مقابلہ کرے گی۔

پاکستان سے آنے والی اطلاعات پر سب پریشان تھے لیکن رضوان کے چہرے پر ایک سکون تھا۔ سمندر جیسا سکون۔ جو ہر طوفان کو سہارنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

رضوان کے سکون کی جھلک حیدر کے چہرے سے بھی عیاں تھی۔ اسے رضوان کی غیر معمولی صلاحیتوں پر مکمل بھروسہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ رضوان ایک اچھے لائف پارٹنر کی طرح اس کی اور اپنی بیٹی مونا کی حفاظت کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔

انہی تشویشناک خبروں کے درمیان آخر وہ دن آ پہنچا جب رضوان، حیدر اور مونا پاکستان کے لیے روانہ ہوئے۔ امریکہ چھوڑنے پر رضوان کا دل بہت دکھی تھا۔ سالہا سال امریکہ میں رہتے ہوئے اس کے دل میں امریکہ کے لیے ایک عجیب سی محبت پیدا ہو چکی تھی۔ امریکہ سے اس کی یہ محبت کچھ پاکستان کی محبت سے ملتی جلتی تھی۔ بعض اوقات وہ اپنے آپ سے پوچھتا کہ اسے پاکستان سے زیادہ محبت ہے یا امریکہ سے؟ لیکن وہ فیصلہ نہ کر پاتا۔ امریکہ نے جس طرح اس کے لیے اپنی باہیں پھیلائی تھیں اس وجہ سے اس کے دل میں امریکہ کے لیے تشکر کے جذبات پائے جاتے تھے۔ جبکہ پاکستان میں پھیلی غربت،

جہالت، پسماندگی اور لوگوں کی دشواریوں پر اس کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے طور پر اگر وہ پاکستان کے ان مسائل میں کسی طرح کوئی کمی لا سکے تو وہاں جا کر اس کی کوشش کرے گا۔

حیدر اور مونا دونوں بہت خوش تھیں۔ حیدر نے کاسنی رنگ کی شلوار اور آسمانی رنگ کی قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پر کاسنی رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اور دوپٹے کے رنگ کی ملتی جلتی چادر کندھوں پر ڈال رکھی تھی۔ تاکہ بوقت ضرورت اسے سر پر کھینچ سکے۔

مونا کو بھی اس نے آسمانی رنگ کی شلوار قمیض پہنا رکھی تھی۔ رضوان البتہ پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے جین کی پینٹ اور آدھے بازوں کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ دیکھنے میں لگتا تھا کوئی نوجوان طالب علم ہے جو چھٹیاں گزارنے پاکستان جارہا ہے۔

رضوان حیدر کے اٹل ارادے کے بعد کہ وہ پاکستان ضرور جائیں گے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے پاکستان میں اپنی ایمبیسی کو ہدایات جاری کر دی تھیں کہ وہ پاکستان میں رضوان، حیدر اور مونا کی سیفٹی کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کریں۔ انہی وجوحات کی بنا پر انہوں نے ایئر لائن کو الرٹ کر دیا تھا کہ کسی کو رضوان اور اس کی فیملی کے سفر کی تفصیلات کی بھنک نہ پڑنے دی جائے۔ لیکن ان سب احتیاطوں کے باوجود لاہور میں اسلام پسندوں کو اطلاع مل چکی تھی کہ رضوان اور اس کی فیملی کس فلائٹ سے پاکستان پہنچ رہے ہیں۔ لیکن یہ اطلاع انہیں اتنی دیر سے ملی تھی کہ وہ ایئر پورٹ پر کسی ناروا حرکت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

علاوہ ازیں ایئر پورٹ پر ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے امریکی ایمبیسی کا عملہ اپنی گاڑیوں سمیت موجود تھا۔

جب لاہور ایئر پورٹ پر کوئی اسلام پسند دکھائی نہ دیا تو رضوان کو قدرے حیرت ہوئی لیکن اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایئر پورٹ سے امریکی ایمبیسی کی گاڑی پر سوار ہو کر رضوان، حیدراور مونا جمال

پور میں تعمیر کردہ ہسپتال میں پہنچے تو ہسپتال کے طرز تعمیر اور باغبانی کے سلیقے اور آرائش سے ان کی نگاہیں چکاچوند ہو گئیں۔

اگرچہ وہ بغیر اطلاع وہاں پہنچے تھے لیکن اتفاق سے شیر و کمہار، نگو، سمیرا، عذرا، یاسمیں اور شائستہ سبھی وہاں موجود تھے۔ شیر و کمہار ہسپتال کے گیٹ کے اندر باغبانوں کے ساتھ پھولوں کی کیاریوں میں زمین کی ترائی کر رہا تھا۔ نگو بھی وہیں اس کے پاس موجود تھی۔ سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ ہسپتال کے وارڈز میں مریضوں کے ساتھ مصروف تھیں۔

شیر و کو دیکھتے ہی رضوان نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ رضوان نے حیدر کو بتایا کہ وہ اس کا باپو اور ماں ہیں۔ پھر گاڑی سے اتر کر اس نے سجدے کے انداز میں اپنے باپو شیر و کمہار اور اپنی ماں نگو کے قدموں پر بوسہ دیا۔ اس کے دیکھا دیکھا حیدر اور مونا بھی ان کے قدموں پر بوسہ زن ہوئے۔

شیر و اور نگو نے رضوان، حیدر اور مونا کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا اور زار و قطار رونے لگے۔ رضوان انہیں تسلی دیتا رہا لیکن شیر و اور نگو کے آنسو تھے کہ تھمنے میں نہیں آرہے تھے۔ وہ آنسو خوشی کے آنسو تھے، اطمینان کے آنسو تھے، بے پایاں محبت کے آنسو تھے جو ہر ماں اور باپ کو اپنے بچوں سے ہوتی ہے۔

حیدر نے امریکہ میں اپنی زندگی میں ایسا سین کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ماں باپ کی اپنے بیٹے کے لیے ایسی محبت اور بیٹے کا اپنے ماں باپ کا اتنا احترام اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ اس انوکھے تجربے پر اس کی آنکھیں بھی تر ہو گئیں۔

ابھی شیر و، نگو، رضوان، حیدر اور مونا محبت کی آندھیوں اور جھکڑوں سے گزر رہے تھے کہ سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ اپنے وائٹ کوٹوں میں ملبوس دوڑتی ہوئی وہاں آئیں اور رضوان سے لپٹ کر اس کی پیشانی پر بوسہ زن ہوئیں۔

حیدر حیرت سے سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ کا رضوان سے والہانہ اظہار محبت دیکھ رہی تھی۔ اس محبت میں اسے ایک عجیب پاکیزگی اور اپنائیت محسوس ہوئی۔

نگو اور شیر و نے آگے بڑھ کر مونا کو بازووں میں اُٹھالیا۔ وہ محبت سے اُسے چوم رہے تھے۔ اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مونا کو انگریزی کے سوا کوئی زبان نہیں آتی تھی۔ لیکن جیسا کہ کہتے ہیں کہ محبت کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ وہ اپنے دادا اور دادی کی محبت کی حرارت دل کی گہرایوں میں محسوس کرتے ہوئے ان کے گلوں میں باہیں ڈالے ان کے بازووں میں جھول رہی تھی۔

سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ نے رضوان اور حیدر کی ہسپتال کمپلیکس میں ان کی لیے تعمیر کی گئی رہائش گاہ کی طرف راہنمائی کی۔ ڈرائیور کو گاڑی رہائش گاہ کی طرف لانے کا اشارہ کر کے رضوان، شیرو، نگو، حیدر، مونا، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ پیدل چلتے ہوے رہائش گاہ تک پہنچے۔

رضوان اور حیدر رہائش گاہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انہیں رہائش گاہ کا اندرونی اور بیرونی اسٹائل بہت اچھالگا۔

یوں تو سارا ہسپتال بنیادی سہولتوں سے لیس تھا لیکن رضوان کی رہائش گاہ میں ان سہولتوں کا دوہرا انظام بنایا گیا تھا کہ اگر کسی وجہ سے کوئی ایک سسٹم خراب ہو جائے تو دوسرا سسٹم فوراً چالو ہو جائے۔

حیدر کو گھر کا کچن خاص طور پر بہت پسند آیا۔ اتنا کشادہ اور ہوادار کچن اسے اتنا اچھا لگا کہ اس نے فوراً سب کے لیے کھانا بنانے کا اعلان کر دیا۔ لیکن رضوان نے حیدر کو کھانا پکانے سے منع کر دیا۔ اس نے کہا کہ آج شام وہ اپنے آبائی گھر جائے گا اور اپنے ماں کے ہاتھ کا بنا کھانا باقی سب کے ساتھ مل کر ویسے ہی کھائے گا جیسے وہ بچپن میں کھاتا تھا۔ سب نے اس کی خواہش کا احترام کیا۔ وہ کئی برسوں کے طویل سفر سے لوٹا تھا۔ جو کئی برس پہلے گورنمنٹ کالج سے شروع ہوا تھا پھر کے ای اور جانز ہاپکنز سے ہوتے ہوئے اب آ کر مکمل ہوا تھا۔ پھر اس نے اور حیدر نے ایمبیسی کے اسٹاف کا شکریہ ادا کیا۔ جانے سے پہلے مشن کے ڈپٹی چیف نے اسے اپنا ذاتی فون نمبر دیا اور ہدایت کی کہ اگر انہیں کسی قسم کی کوئی سیکورٹی تھریٹ محسوس ہو تو وہ فوراً اسے کال کریں۔ وہ اور اس کا عملہ کوشش کرے گا کہ جلد سے جلد مقامی سیکورٹی کے

عملے کو اُن کی مدد کے لیے روانہ کریں۔ رضوان نے مسکراتے ہوئے اُسے خدا حافظ کہا۔ اور پھر اپنے باپو شیر و کمہار، اپنی ماں نگو، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہو گیا۔

فصل 34

رضوان تو جمال پور واپس پہنچ کر خوش تھا ہی حیدر اور مونا کا جوش و جذبہ بھی دیدنی تھا۔ پاکستانی لباس پہننا اور زندگی کے جو طور طریقے انہوں نے بالٹی مور میں ملنے جلنے والے پاکستانیوں سے سیکھے تھے ان کی بنا پر وہ جمال پور کی زندگی میں اس طرح گھل مل گئیں جیسے سدا سے یہیں کی باسی ہوں۔

حیدر کو مٹی سے برتن بنانا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ رضوان کے ہسپتال جانے کے بعد مونا کو وہیں ہسپتال کمپلیکس میں ہسپتال کے ملازمیں کے بچوں کے لیے بنے اسکول میں چھوڑ کر رضوان کے آبائی گھر پہنچ جاتی۔

تھوڑی دیر نگو کا کام کاج میں ہاتھ بٹاتی پھر شیرو کے ساتھ مل کر مٹی کے برتن بنانے میں اس کی مدد کرتی اور ساتھ ساتھ برتنوں کے لیے مٹی تیار کرنا، مٹی سے بوتے بنانا، بوتوں کو چاک پر رکھ کر پیروں سے چاک چلانا اور ہاتھوں سے بوتوں کو برتن کی شکل دینا سیکھتی۔ چند ماہ میں وہ شیرو کی مدد کے بغیر مٹی تیار کرنے سے لیکر برتن بنانے تک ایسے ماہر ہو گئی جیسے بچپن سے یہی کرتی آ رہی ہو۔

رضوان کی آمد کے بعد ہسپتال میں مریضوں کی آمد و رفت بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ کچھ تو رضوان کی اعلی سطح کی ریسرچ کی وجہ سے اور کچھ جانز ہاپکنز اور ہارورڈ میڈیکل سنٹرز سے وابستگی کی وجہ سے پورے پاکستان سے ڈاکٹرز پیچیدہ بیماریوں کے حامل مریضوں کو مسلسل جمال پور بھجوا رہے تھے۔

اچانک جمال پور ہسپتال پاکستان کے صحت کے مسائل کے حوالے سے سرفہرست ہسپتال کے طور پر جانا جانے لگا۔ اشرافیہ کے ممبران یورپ اور امریکہ جانے کی بجائے جمال پور ہسپتال آنا شروع ہو گئے۔ ہر وہ سہولت اور علاج جو انہیں یورپی اور امریکی ہسپتالوں میں مل سکتا تھا جمال پور ہسپتال میں میسر تھا۔

خاص طور پر جینیٹک کوڈز میں تبدیلی کے ہنر سے بیماریوں کے علاج اور مکمل خاتمے کا جو سلسلہ رضوان نے شروع کیا تھا اس کی وجہ سے اس کی شہرت پاکستان سے باہر بھی ہونے لگی تھی۔

کئی ملکوں کے طبّی ماہرین جمال پور ریسرچ سنٹر آ کر اس طریقہ علاج کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔

حیدر مٹی کے برتن بنانے کے ہنر میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اب زیادہ وقت ہسپتال کے انتظامی امور پر توجہ دے رہی تھی۔ ہسپتال کے انتظامی امور حیدر کے ہاتھوں میں آنے کے بعد انتظامیہ کا شعبہ بھی امریکی ہسپتالوں کے انتظامی شعبوں کی طرح موثر، متحرک اور فعال ہو چکا تھا۔ ہر چیز اپنے وقت پر اور صحیح طریقے سے ہونے لگی تھی۔ چنانچہ ہسپتال کی سروسز اور سروسز کے نتیجے میں وسائل میں بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا تھا۔ پاکستان بھر سے اشرافیہ کے ممبران کی علاج کے لیے آمد میں اضافے کی وجہ سے جمال پور ہسپتال کے ارد گرد کئی اعلی قسم کے رہائشی کمپلیکس تعمیر کر دیئے گئے تا کہ ایسے مریضوں کے لواحقین کو رہنے سہنے کے لیے مناسب سہولتیں میسر رہیں۔

ایک اعلی پائے کے ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کی وجہ سے جمال پور جس طرح پاکستان اور دنیا کے نقشے پر نمایاں ہونے لگا تھا اس کی مثالیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔

سمیرا اور اس کی سہیلیوں نے جس طرح زمین کے انتخاب، اس کے حصول اور اسے ہسپتال فیسیلٹی میں ترقی دینے میں جو کردار ادا کیا تھا اس سے رضوان اور حیدر بہت متاثر تھے۔

حیدر نے سمیرا اور اس کی سہیلیوں کو جس طرح اپنی زندگی کا حصہ بنایا اور خود ان کی زندگی کا حصہ بنی یہ بھی بے مثال تھا۔ رضوان، حیدر، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ کے باہمی اشتراک سے ان کا حلقہ ایک کمیون میں بدل گیا جس میں موناسب کی بیٹی تھی۔ وہ بھی ان سب سے اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے وہ ان سب کی بیٹی ہو۔ شیر و کمہار اور نگو وہاں آ جاتے تو وہ بھی اس گروپ کا حصہ بن جاتے۔ نگو کم گو تھی لیکن شیر و کمہار میں ایک دیہاتی دانش پائی جاتی تھی جس کا اظہار وہ مسلسل اپنی گفتگو سے کرتا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے حیدر اس کی اور نگو کی سب باتیں سمجھ جاتی تھی لیکن زبان نہ جاننے کی

دشواری کی بناپر ان سے گفتگو کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ ایسے موقعوں پر سمیرا یا اس کی سہیلیوں میں سے کوئی ایک ترجمانی کے فرائض ادا کرتی اور حیدریا مونا کی بات کا شیر وا اور نگو کے لیے اور ان کی باتوں کا اس کے لیے ترجمہ کرتی۔

شیر وا اکثر حیدر سے امریکہ میں لوگوں کے رہن سہن، سماجی عادات اور اجتماعی زندگی کے بارے میں سوال کرتا۔ حیدر اپنی تصویروں کی البم میں سے انہیں مختلف تصویریں دکھا کر اپنی بات کی وضاحت کرتی تو وہ ہنس کر ہسپتال کے ارد گرد کے ماحول کے بارے میں اشارہ کر کے کہتا کہ ہم نے بھی یہاں چھوٹا سا امریکہ تو پہلے ہی بنا دیا ہے بہت جلد باقی سارے پاکستان کو بھی ایسا ہی بنا دیں گے۔ حیدر کہتی کیوں نہیں کیوں نہیں۔ پھر وہ کہتی کہ وہ رضوان کے ساتھ اسی لیے یہاں آئی ہے کہ پاکستان کو امریکہ کی طرح ترقی یافتہ ملک بنادے۔

ہسپتال کے حوالے سے رضوان کی شہرت کی وجہ سے اسلام پسندوں کو بھی پتہ چل چکا تھا کہ وہ آج کل پاکستان میں ہے۔ وہ مسلسل اس کی ٹوہ میں رہتے کہ اس کے موجودہ لائف اسٹائل کے بارے میں جانیں اور پھر اس کے خلاف مہم چلائیں۔

ان کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی اور اب بھی وہ رضوان کے ساتھ ہسپتال کمپلیکس میں رہتی تھیں۔ جبکہ وہ امریکہ سے ایک گوری بیوی بھی ساتھ لے آیا ہے جس میں سے اس کی ایک عدد بیٹی ہے۔

اتفاق سے اسلام پسندوں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ حیدر کی رضوان سے کبھی باقاعدہ شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کبھی مذہبی اور قانونی اعتبار سے اس کی بیوی نہیں بنی تھی ۔ بس ان دونوں نے ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو کر ایک ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا اور پھر باہمی اتفاق سے ایک عدد بیٹی پیدا کی تھی۔

ان کا خیال تھا کہ حیدر کرسچین ہے اور رضوان نے اس سے کرسچین طریقے سے شادی کر رکھی ہے۔ چونکہ مسلمان مردوں کو عیسائی اور یہودی عورتوں سے مذہبی طور پر شادی کی اجازت ہے اس لیے انہیں

حیدر سے اس کے شادی کے بارے میں کوئی خاص اختلاف نہیں تھا۔ لیکن وہ جب بھی حیدر کا ذکر کرتے اسے امریکی کتیا کہہ کر اس کا حوالہ دیتے۔

رضوان اور حیدر اپنے ہسپتال اور ریسرچ سنٹر میں اس طرح مصروف تھے کہ انہیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ شہر کے اسلام پسندوں میں ان کے خلاف کیا کھچڑی پک رہی ہے۔

ان کے خلاف متحرک عناصر کا سرغنہ وہی مولانا تھا جسے رضوان کے امریکہ جانے سے قبل رینجرز کے کرنل نے اغوا کرایا تھا۔ اس کے ساتھ وہ جرنلسٹ تھے جن سے رضوان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے سمیرا کی منہ ماری چلتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی کے وہ کارکن تھے جن کے ساتھ ڈیفنس کے مولانا کا رابطہ تھا۔

جس دن سے انہیں پتہ چلا تھا کہ رضوان امریکہ سے واپس آ چکا ہے انہوں نے جمال پور کے چکر لگانا شروع کر دیئے تھے۔ وہ جمال پور جا کر مسلسل کوشش کر رہے تھے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ رابطہ استوار کریں جنہیں وہ رضوان کے خلاف استعمال کر سکیں۔ لیکن سارے جمال پور میں انہیں کوئی شخص نہ ملا جو رضوان کے خلاف انہیں اپنے کندھے پیش کرتا۔

رضوان اگرچہ جمال پور میں ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن گاؤں کے سارے مکین اس کی کامیابیوں کو اپنی کامیابی سمجھتے تھے۔ اب رضوان صرف شیرو کمہار کا بیٹا نہیں تھا سارے گاؤں کا بیٹا تھا اور سب اس کے دفاع میں کھڑے ہونے کے لیے ہمہ وقت آمادہ اور تیار تھے۔

ایک جمعے کے دن ڈیفنس کی مسجد کے مولانا اپنے ساتھیوں سمیت جمال پور تشریف لائے اور جمعے کی نماز سے پہلے مقامی مسجد کے مولانا سے ملے۔

انہوں نے مقامی مسجد کے مولانا سے کہا کہ وہ جمعے کی نماز کے بعد ایک اہم مسئلے پر نمازیوں سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

جمال پور کی مسجد کے مولانا نے اپنے خطبے کے دوران نمازیوں سے کہا کہ وہ جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد دس پندرہ منٹ مسجد میں تشریف رکھیں کیونکہ شہر سے آئے ڈیفنس کی مسجد کے مولانا ان سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

جمعہ کی نماز ہو چکی تو مقامی مسجد کے مولانا کے اعلامیے کے مطابق سبھی نمازی مسجد میں بیٹھے رہے۔ شہر سے آے مولانا نے اسپیکر سنبھالا اور مسجد میں بیٹھے نمازیوں سے اس طرح مخاطب ہوئے:

"حضرات ہم اپنے مسلمان ہونے پر اللہ تعالی کی ذات بابرکات کا جس قدر شکریہ ادا کریں کم ہے۔ اس کے بعد اسلام کی نعمت ہم تک پہنچانے کے لیے ہم محمدِ عربی پر جتنا درود و سلام بھیجیں ہم ان کے احسان حق ادا نہیں کر سکتے۔

اللہ کے شکر اور نبی کریم پر درود و سلام بھجوانے کے بعد میں آپ لوگوں کی توجہ ایک اہم مسئلہ کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔

آپ میں سے ہر ایک کو قیامت کے دن خدا کے حضور پیش ہونا ہے۔ اللہ تعالی نے آپ کے اعمال کے حساب کے علاوہ آپ کے خاندان، آپ کے گلی محلے اور آپ کے شہر کے معاملات کے بارے میں آپ سے پوچھنا ہے کہ کیا آپ نے ان کے بارے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کیں۔ آپ کے خاندان کے افراد نے اللہ کے احکام کی پیروی کی۔ آپ کے محلے کے لوگوں نے شعائر اسلام کا خیال رکھا۔ آپ کے شہر اور ملک میں لوگوں نے اپنی زندگیوں میں شریعت کے احکام کا نفاذ کیا۔

آج آپ سب اپنے اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ کیا آپ کے خاندان، آپ کے محلے، آپ کے شہر اور آپ کے ملک میں احکامات شریعت پر عمل ہو رہا ہے؟

اگر عمل ہو رہا ہے تو آپ کامیاب ہیں۔ ملک تو بڑی بات ہے، لیکن اگر آپ کے خاندان، محلے یا شہر میں کہیں بھی شریعت کے احکام پر عمل نہیں ہو رہا یا شعائر اسلام کا عملاً مذاق اڑایا جا رہا ہے تو مجھے قسم ہے اس

رب ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ آپ سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ جب آپ سے سوال ہو گا تو آپ اس وقت خواہش کریں گے کہ زمین پھٹ جائے یا آسمان ٹوٹ پڑے اور آپ اس سوال سے بچ جائیں لیکن آپ نہیں بچ پائیں گے۔ آپ اللہ کے پہلو میں بیٹھے محمد عربی کی طرف دیکھیں گے کہ وہ آپ کی سفارش کریں لیکن وہ اس وقت آپ کی طرف سے منہ پھیر لیں گے اور آپ کو اس ہلاکت کا سامنا کرنا پڑے گا جو آپ کے خاندان، محلے، یا شہر میں ہونے والے خلاف شریعت احکام پر آپ کی خاموشی کی وجہ سے نازل ہو گی۔ اس دن آپ کو کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ اور آپ کو اپنے ارد گرد شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کی سزا اٹھانا پڑے گی۔

حضور پر میرے ماں باپ قربان جائیں انہوں نے فرمایا ہے کہ مومن وہ ہے جو برائی ہوتی دیکھے تو اپنے ہاتھوں سے روکے، ہاتھوں سے نہ روک سکے تو منہ سے روکے، منہ سے نہ روک سکے تو دل سے اسے برا جانے۔

آج تمہارے جمال پور میں تمہاری آنکھوں کے سامنے شعائر اسلام کی تذلیل کی جارہی ہے۔ لیکن تم لوگ نہ ہاتھ استعمال کر رہے ہو، نہ زبان اور نہ دل سے اسے برا سمجھتے ہو۔ کل قیامت کے دن خدا جب تم سے اس برائی کے بارے میں پوچھے گا اور محمد عربی تمہاری طرف سے منہ پھیر لیں گے تو تم اسے کیا جواب دو گے۔"

مولانا کی تقریر سن کر کئی لوگ زارو قطار رونا شروع ہو گئے۔ مسجد میں آہ و زاری کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ لوگوں کی آنسوں سے داڑھیاں تر ہو گئیں۔

منصوبے کے مطابق مولانا، رضوان سے نفرت کرنے والے چند اسلام پسند نوجوانوں کو شہر سے ساتھ لیکر آئے تھے، جب مولانا کی تقریر سے لوگوں کا جوش و جذبہ ایسے مقام پر پہنچ گیا کہ انہیں کسی بھی پُر تشدّد کاروائی کے لیے آمادہ کیا جاسکتا تھا انہوں نے اجتماع میں کھڑے ہو کر واویلا شروع کر دیا۔

"مولانا آپ اشارہ کریں کون منکر خدا، گستاخ رسول، یہاں شعائر اسلام کی توہین کر رہا ہے۔ ہم ابھی، اسی وقت، جاکر اسے جہنم واصل کریں گے۔"

مولانا آنکھوں میں آئے جعلی آنسو صاف کرتے ہوئے دوبارہ گلوگیر آواز میں اجتماع سے گویا ہوئے:

"مبارک ہیں یہ نوجوان، جن کے دلوں کو اللہ تعالی نے اسلام کے نور اور عشق نبی کے سرور سے بھر دیا ہے۔ آفریں ہو ان ماؤں پر جنھوں نے ایسے فرزندان اسلام کو جنم دیا ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کے جذبۂ صادق سے عرش پر اللہ تعالی خوش ہو کر فرشتوں سے کہہ رہا ہے کہ جاؤ اپنے پر ان نوجوانوں کے قدموں تلے بچھا دو۔ ان کی سات اگلی اور سات پچھلی نسلوں کے لیے جنت میں طلائی محلات کھڑے کر دو کیونکہ وہ میرے سپاہی ہیں جو میرے دین اور میرے نبی کی حرمت کے لیے مر مٹنے کے لیے تیار ہیں۔"

مولانا کے ان جملوں سے مجمع میں موجود سب نمازیوں کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ مسجد میں آہ وبکا سے ایک کہرام مچ گیا۔

مولانا کے ساتھی اسلام پسند نوجوانوں نے مسجد میں نعرے لگانے شروع کر دیے۔

"ماریں گے مر جائیں گے

دشمنان دیں کو مار گرائیں گے

ماریں گے مر جائیں گے

دشمنان دیں کو مار گرائیں گے"

نوجوانوں کے نعروں کے جواب میں مولانا نے بھی "اللہ اکبر" کا ایک طویل نعرہ لگایا اور پھر فرمایا:

" میں جس فتنہ اسلام کی بات کر رہا ہوں اس کا نام رضوان ہے، پہلے امریکی اسے اپنے خرچ پر امریکہ لے گئے تھے۔ اب وہ ایک امریکی کتیا کے ساتھ واپس لوٹ آیا ہے اور ہم سب کے درمیان چار بن بیاہی پاکستانی ڈاکٹر لڑکیوں کے ساتھ بے شرمی اور ڈھٹائی سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہودیوں کے پیسے

اور سازش سے اس نے ایک ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کھڑا کر دیا ہے تا کہ وہ پاکستانی مسلمانوں کے جسموں میں ایسے جراثیم داخل کرے جن سے ان کی نسلیں تباہ و برباد ہو جائیں۔" مولانا کا اتنا کہنا تھا کہ ان کے ساتھ آئے نوجوانوں نے نعرہ لگایا:

"چلو چلو نوجوانو چلو

یہودیوں کے ایجنٹ

رضوان اور اس کے

ہسپتال کو جلانے چلو

چلو چلو نوجوانو چلو"

جمال پور کے نمازیوں نے جیسے ہی مولانا کے منہ سے رضوان کا نام سنا سب نے اپنی آہ و زاری بند کی مولانا کے اللہ کے تخت، ساتھ بیٹھے رسول پاک، اور ارد گرد کھڑے فرشتوں کے فرضی منظر کو ایک طرف رکھ کر مولانا اور ان کے ساتھ آئے اسلام پسند نوجوانوں کو پکڑ کر زدو کوب شروع کر دیا۔

جس کسی نے مولانا کو چھڑانے کی کوشش کی اس کو انہوں نے اپنے گھونسوں اور لاتوں کا نشانہ بنایا۔ چند نوجوان نمازی فوراً گئے اور شیر و کمہار کے احاطے سے پانچوں گدھے ہانک لائے۔ ایک گدھے پر انہوں نے مولانا کو، ان کا منہ کالا کر کے، گلے میں جوتوں کا ہار ڈال کر، بٹھایا۔ دوسرے گدھوں پر انہوں نے مولانا کے ساتھ آئے نعرے لگانے والے لڑکوں کو ان کے منہ کالے کر کے، ان کے گلوں میں جوتوں کے ہار ڈال کر بٹھایا، اور پھر جلوس کی شکل میں جمال پور کے بازار میں گھما کر ہسپتال کے طرف لے گئے۔

راستے میں اور لوگ آتے گئے اور جلوس میں شامل افراد کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ہسپتال تک پہنچتے پہنچتے مسجد کے نمازیوں کا جلوس ایک بہت بڑے انسانی مجمع میں تبدیل ہو گیا۔

جب انسانوں کا وہ جم غفیر جلوس کی شکل میں ہسپتال کی طرف جا رہا تھا چند لوگوں نے جلدی سے جا کر رضوان کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ رضوان نے فوراً حیدر، مونا، سمیرا اور اپنی دیگر دوستوں کو ساتھ لیا اور اپنی وائلن اٹھا کر ہسپتال کے باہر جلوس کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد جلوس ہسپتال کے سامنے کھلی گراونڈ میں پہنچا تو جمال پور کے باسیوں نے مولانا اور ان کے ساتھی نوجوانوں پر جوتوں کی بارش کر دی۔

حیدر، سمیرا، عذرا، یاسمیں اور شائستہ یہ سین دیکھ کر ڈر گئیں جبکہ مونا رونا شروع ہو گئی۔ سمیرا نے مونا کو گود میں اٹھالیا۔ اس کے چمکارنے سے مونا چپ ہو گئی لیکن سہم کر اس کے ساتھ چمٹ گئی۔

جب جلوس بالکل ان کے سامنے پہنچا تو رضوان، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ نے مولانا کو پہچان لیا۔ یہ وہی مولانا تھے جن کی وجہ سے رضوان نہ چاہتے ہوئے بھی پاکستان سے کے ای چھوڑ کر امریکہ میں واقع جانز ہاپکنز چلا گیا تھا۔

لوگوں نے جوش و جذبے سے بھرپور بلند آوازوں میں رضوان کو بتایا کہ یہ مولانا ہمیں آپ کو مارنے اور ہسپتال کو جلانے پر اکسانا چاہتا تھا۔ رضوان نے ایک ہاتھ میں وائلن اور دوسرے میں باو بلند کر کے کہا کہ وہ مولانا اور ان کے ساتھیوں کو چھوڑ دیں۔ اس کے کہنے سے لوگوں نے مولانا اور ان کے ساتھیوں کو چھوڑا تو انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن رضوان نے فوراً وائلن بجانا شروع کر دی۔ وائلن کی آواز سے تمام مجمع پر سکون ہو گیا۔ مولانا اور ان کے ساتھی نوجوانوں کے قدم بھی وہیں جم گئے۔ چند لمحوں میں وہ سب رضوان کی وائلن کی دھنوں کے ساتھ جھوم رہے تھے۔

پھر رضوان نے وائلن بجاتے بجاتے لوگوں سے کہا کہ وہ مولانا اور ان کے ساتھیوں سے پیچھے ہٹ جائیں۔ لوگ پیچھے ہٹے تو رضوان نے وائلن کی دُھنیں تبدیل کر دیں۔ مولانا اور ان کے ساتھیوں نے وائلن کی دھنوں پر رقص شروع کر دیا۔ رقص کرتے کرتے پہلے ان کے منہ سے بندروں کی طرح خو خو کی آوازیں نکلنا شروع ہوئیں پھر ان کی شکلیں بندروں کی شکلوں میں تبدیل ہو گئیں۔ بندر بھی ایسے

ویسے نہیں کالے سیاہ بندر۔ جیسے ہی ان کی شکلیں بندروں کی شکلوں میں تبدیل ہوئیں۔ رضوان نے وائلن روک دی۔ لوگوں نے مولانا اور ان کے ساتھیوں کو بندروں میں تبدیل ہوتے دیکھا تو ان کے پیچھے بھاگے۔ سارے بندر بھاگ کر درختوں پر چڑھ گئے۔ اور درختوں پر جھولتے مجمع سے دور چلے گئے۔ رضوان حیدر، سمیرا، عذرا، یاسمین، شائستہ اور مونا کے ساتھ ہسپتال کے اندر چلا گیا جب کہ گاؤں کے لوگ اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے۔

فصل 35

مولانا اور ان کے ساتھیوں کا بندروں میں تبدیل ہونا ایک اہم واقعہ تھا۔ اس سے پہلے نہ کبھی کسی نے ایسا واقعہ دیکھا نہ سنا۔ چنانچہ اس واقعہ کے بارے میں سب پاکستانی اخباروں نے خبر چھاپی۔ بعض اہم بین الاقوامی اخباروں نے پاکستانی اخباروں سے لفٹ کر کے یہ خبر اپنے ایڈیشنوں میں رضوان کی میڈیکل بیک گراونڈ اور ڈی این اے کوڈنگ میں ریسرچ اور مہارت کے حوالے سے چھاپی۔ پاکستان کے ملّاوں نے اخبارات میں یہ خبر پڑھی تو ان کی ناراضگی اور غصے کی انتہا نہ رہی۔

انہوں نے پاکستان بھر کے علما کا کنوینشن طلب کیا تا کہ رضوان سے جان چھڑانے کا طریقہ ڈھونڈا جائے۔

کنونشن کے اختتام پر انہوں نے متفقہ اعلامیہ جاری کیا کہ رضوان دائرہ اسلام سے باہر ہے۔ ایک مسلم معاشرے میں چار عورتوں کے ساتھ بغیر شادی کے زندگی گزارنے کی سزا سنگساری ہے۔ رضوان، اس کی بیوی، بیٹی اور ان چاروں عورتوں کو سنگسار کیا جانا چاہئے۔ تا کہ آئندہ کوئی اس طرح سرعام شعائر اسلام کی توہین کی جرأت نہ کر سکے۔

واشنگٹن میں اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے رضوان اور اس کے خاندان کے بارے میں مولویوں کا اعلامیہ سنا تو انہیں رضوان، حیدر اور مونا کی سخت فکر لاحق ہوئی۔

انہوں نے فوراً اسلام آباد میں اپنی ایمبیسی کو ہدایات جاری کیں کہ جلد سے جلد رضوان، حیدر اور مونا کو پاکستان سے نکال کر امریکہ لایا جائے۔

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے ملنے والی ہدایات کے بعد ایمبیسی کے ڈپٹی چیف نے رضوان سے رابطہ کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنی فیملی اور دوستوں کے ساتھ جلد سے جلد امریکہ واپس چلا جائے۔ رضوان

اور حیدر نے اس کی بات انتہائی تحمل اور توجہ کے ساتھ سنی۔ رضوان نے جواب دینے کے لیے ابھی لب نہیں کھولے تھے کہ حیدر بول اٹھی۔ اس نے ڈپٹی مشن کو جواب دیا کہ وہ کسی قیمت پر ان حالات میں یو ایس اے نہیں جائیں گے۔

رضوان نے بھی حیدر کی بات کی تائید کی اور ساتھ ہی کہا کہ وہ ایمبیسی کے تعاون کے لیے ان کا اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا مشکور ہے لیکن وہ اور اس کا خاندان جمال پور میں مکمل طور پر محفوظ ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر مولوی حضرات اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ جو بھی سوچ رہے تھے، کہہ رہے تھے یا کر رہے تھے مگر جمال پور میں مولانا اور ان کے اسلام پسند پیروکاروں کی بندروں میں تبدیلی کے بعد لوگوں کے موج میلے کے لیے ایک نیا سامان پیدا ہو گیا تھا۔ سب لوگوں کو پتہ تھا کہ ان بندروں میں سے مولانا کون ہے اور اس کے پیروکار کون کون ہیں۔ مولانا کی بندر بننے کے بعد بھی داڑھی موجود تھی۔ اگرچہ یہ داڑھی ویسی نہیں تھی جیسی انسانی شکل میں تھی لیکن پھر بھی داڑھی اتنی نمایاں تھی کہ اس سے واضح طور پر مولانا کی شناخت ہو جاتی تھی۔

لوگ بھی جب کسی چھت یا درخت کی شاخ پر انہیں باقی بندروں کے ٹولے کے ساتھ دیکھتے تو مولانا کہہ کر مخاطب کرتے۔ مزے دار بات یہ ہے کہ داڑھی والے بندر کو اندازہ تھا کہ اس کا نام مولانا ہے اور لوگ اسے مخاطب کر رہے ہیں۔

پنجاب میں بندر نہیں ہوتے۔ کبھی کبھار کوئی مداری ایک یا ایک سے زیادہ بندروں کے ساتھ گلیوں اور محلّوں میں آ نکلتا ہے اور بچوں کا دل بہلانے کے لیے ڈگڈگی بجا کر پہلے انہیں اکٹھا کرتا ہے اور پھر اپنے بندروں کی مضحکہ خیز حرکتوں کا تماشا دکھا کر ان سے پیسے اکٹھے کرتا ہے۔ یا کوئی جانوروں کا شوقین اپنے گھر میں ایک بڑا سا پنجرہ بنوا کر کہیں سے ایک آدھ بندر لا کر اپنے اور اپنے بچوں کے شوق کے لیے رکھ لیتا ہے۔

جمال پور میں اتنے سارے بندروں کی موجودگی سے لوگوں کے لیے ایک نیا تماشا پیدا ہو گیا تھا۔

بندروں کا روزانہ کا معمول تھا کہ وہ رات درختوں پر بسر کرنے کے بعد صبح صبح ہسپتال کے بڑے دروازے کے ارد گرد جمع ہو جاتے۔ آنے جانے والے لوگ ان کے سامنے کھانے کی چیزیں پھینکتے تو وہ اچھل کر ان چیزوں کو پکڑ لیتے اور پھر مزے لے لے کر کھاتے۔

کبھی کبھار رضوان، حیدر، مونا، سمیرا، عذرا، یاسمین یا شائستہ میں سے کوئی ایک ادھر آنکلتا تو بندروں کا جوش و خروش دیدنی ہوتا۔ وہ انہیں دیکھتے ہی ان سے ایک مناسب فاصلہ رکھ کر ان کے ارد گرد رقص شروع کر دیتے۔ رقص دیکھنے والوں کو احساس ہوتا کہ بندروں میں ایک احساس پشیمانی ہے جس کا اظہار وہ رقص سے کرتے ہیں۔ ان کا یہ رقص خاص طور پر اس وقت دیکھنے والا ہوتا جب رضوان ادھر آنکلتا۔

رضوان جب انہیں اس طرح اپنے ارد گرد رحم طلب انداز سے رقص کرتے دیکھتا تو انہیں مخاطب کر کے کہتا کہ " ازدام وود ملولم وانسانم آرزواست " تو ایسے لگتا کہ بندروں کی آنکھوں میں امید کی کرن چمکنے لگی ہے اور انہیں توقع بندھ گئی ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی دوبارہ انسانی وجود میں لوٹ آئیں گے۔

پاکستان کے اخبارات مسلسل جمال پور کے بندروں کے حوالے سے رونما ہونے والے واقعات کی خبریں شائع کرتے رہتے تھے۔

وہ مولانا حضرات جنھوں نے رضوان اور اس کی دوستوں کو سنگسار زدنی قرار دیا تھا مسلسل ان واقعات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ باہم دگر مشورے کرتے رہتے کہ کس طرح رضوان کو سنگسار کیا جائے۔ جمال پور کے باسی انہیں اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ نظر آتے۔

انہوں نے جس طرح رضوان اور ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کے خلاف مولانا کی سازش کو ناکام بنایا تھا اس سے مولوی صاحبان کو ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ جمال پور کا رخ کریں اور رضوان اور اس کی دوستوں پر شرعیت کی حد لاگو کریں۔

دریں اثنا رضوان کی جمال پور ہسپتال اور ریسرچ سنٹر میں موجودگی کی وجہ سے جمال پور مسلسل پاکستان اور بین الاقوامی میڈیا کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔

ہارورڈ اور جانز ہاپکنز کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے پوری دنیا میں میڈیکل سائنسز میں ہونے والے ارتقا میں جمال پور کا نام ایک خاص اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ بھارت، چین، روس، یورپ اور امریکہ کے تمام میڈیکل ادارے مسلسل جمال پور ریسرچ سنٹر سے رابطے میں تھے اور رات دن کمپیوٹرز کے ذریعے ڈیٹا ٹرانسفر ہو رہا تھا۔

پاکستانی ملّاوں کے برعکس بیرونی دنیا کے لوگ ڈی این اے کوڈز میں بذریعہ میوزک تبدیلی سے انسانوں کی بندروں میں تبدیلی کے عمل میں خاص دلچسپی لے رہے تھے۔ وہ اس بات میں بھی دلچسپی رکھتے تھے کہ آیا اس عمل کو ریورس کیا جا سکتا ہے؟

رضوان جانتا تھا کہ یہ ممکن ہے۔ بنیادی طور پر زندگی کی مختلف صورتوں میں سوائے معمولی فرق کے ڈی این ایز ایک ہی تھے۔ اس معمولی فرق کو موسیقی سے پیدا ہونے والی لہروں سے نہ صرف تبدیل کیا جا سکتا ہے بلکہ زندگی کی ان صورتوں میں شعور کے معیار کو کمتر اور بہتر بھی بنایا جا سکتا ہے اور اگر ضرورت در پیش ہو تو ڈی این ایز میں تبدیلی سے شعور تخلیق بھی کیا جا سکتا ہے۔

چند روسی میڈیکل لیبارٹریوں نے خواہش ظاہر کی کہ جمال پور میں انسانوں سے بنائے گئے چند بندر انہیں بھجوائے جائیں تاکہ وہ ان پر اس حوالے سے مزید تجربات کر سکیں۔

رضوان نے ان لبارٹریوں کو منع کر دیا کہ چونکہ یہ بندر انسانوں سے بنائے گئے ہیں اس لیے ان کے حقوق عام بندروں کی بجائے انسانوں کی طرح ہیں۔ انہیں ان کی مرضی کے بغیر تجربات کے لیے روس بھجوانا ممکن نہیں۔ لیکن اگر روسی ریسرچر پاکستان آ کر ان پر اپنے تجربات کرنا چاہیں تو ان سے تعاون کیا جائے گا۔

پاکستانی ملّاوں نے جب مولانا اور ان کے ساتھیوں سے بنے بندروں کی بیرون ممالک لیبارٹریوں میں ترسیل کے بارے میں خبریں سنیں تو انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے سارے شہروں میں ملّاوں نے احتجاج کے لیے کال دی لیکن اس کال پر سوائے ان کے زیر اثر طالب

علموں کے کسی نے شمولیت نہ کی۔ لوگوں کا ملّاوں کی احتجاج کی کال پر عدم تعاون ان کے لیے کسی شاک سے کم نہیں تھا۔ عام طور پر لوگ مذہب کے نام پر کسی بھی احتجاج میں ہزاروں کی تعداد میں شامل ہو جاتے ہیں لیکن رضوان کے خلاف عام پبلک نے ملّاوں کی کال رد کر کے ثابت کر دیا کہ وہ رجعت پسندی کے خلاف ہیں اور اگر کوئی پاکستان میں تعمیر و ترقی کا کام کرتا ہے تو وہ اس کے خلاف متحرک ہونے کے لیے تیار نہیں۔

اس ناکامی کے بعد ملاوں نے رضوان کے ماضی میں گہری چھان پھٹک کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ لوگوں کو اس کے خلاف متحرک کرنے کے لیے کوئی ایسا جواز تلاش کریں جس سے لوگوں کے جذبات کو اتنا بھڑکایا جائے کہ وہ رضوان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اس طرح اس سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑالی جائے۔

اس مقصد کے لیے ملّاوں نے جمال پور اور بالٹی پور میں اپنے رابطوں کو متحرک کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ رضوان کے بچپن سے لیکر زمانہ ٔحال تک اس کی زندگی کو چھلنی کی طرح کھنگالیں اور کوئی نہ کوئی ایسی چیز نکالیں جس کو سنتے ہی لوگوں کے جذبات آگ کی طرح بھڑک اٹھیں۔

چند ماہ کی دوڑ دھوپ کے بعد آخر ملّاوں کے ہاتھ دو باتیں ایسی آئیں جن سے ان سب کی باچھیں کھل اٹھیں۔ انہوں نے خوشی سے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر ایک دوسرے کے منہ میں لڈو ڈالے اور باقاعدہ ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کی۔

جمال پور اور بالٹی مور میں ان کے رابطوں سے انہیں پتہ چلا کہ بچپن میں رضوان کی ولدیت کا مسئلہ اٹھا تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ شیر و کمہار کا نہیں چوہدری نثار کا بیٹا ہے۔ ان کے مطابق چوہدری نثار کے رضوان کی ماں سے ناجائز تعلقات تھے جن کے نتیجے میں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس مسئلے پر کئی برس قبل جمال پور میں ایک بندے کا قتل بھی ہوا تھا۔ جس کا معاملہ کسی کرنل کی مداخلت کے بعد دبا دیا گیا تھا۔

بالٹی مور سے انہیں اس سے بھی بڑی خبر ملی۔ انہیں پتہ چلا کہ رضوان سے حیدر کی کسی چرچ یا عدالت میں کبھی باقاعدہ شادی نہیں ہوئی۔ دونوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے ایک ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کی بیٹی مونا بھی بغیر شادی کے پیدا ہوئی ہے چنانچہ اپنے باپ کی طرح وہ بھی حرامی اولاد ہے۔

رضوان کے خلاف عوام کے جذبات بھڑکانے کے لیے یہ دو اہم خبریں ملنے کے بعد ملّاؤں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جمال پور کے عوام کو اس کے خلاف کیسے متحرک کیا جائے۔

جمال پور کے عوام نہ صرف ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کی وجہ سے جمال پور کی ملک کے اندر اور باہر بڑھنے والی قدر و منزلت کے لیے رضوان کے گرویدہ تھے بلکہ اس نے جمال پور کے باسیوں کے لیے جس طرح تعلیم اور صحت کے دروازے کھولے تھے اس کی بنا پر بھی وہ دل جمعی سے اس کے ساتھ کھڑے تھے۔

رضوان نے چند ماہ میں جمال پور کے تمام رہائشیوں کا ڈیٹا اپنے ہسپتال کے کمپیوٹرز میں ڈال دیا تھا۔ جس سے ان کے علاج معالجے کے لیے ایک ایسا موثر نظام معرض وجود میں آ چکا تھا جس کی بنا پر ان کے صحت کے مسائل تقریباً ختم ہو چکے تھے۔

اسی طرح اس نے ہسپتال اور ریسرچ سنٹر سے متعلقہ لوگوں کے بچوں کے لیے بنائے گئے اسکول کے جمال پور کے تمام ذہین بچوں کے لیے دروازے کھول دیئے جہاں ان کی بین الاقوامی معیار کے مطابق تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔

اس کے علاوہ پاکستان بھر اور ارد گرد کے ملکوں کی اشرافیہ کے ممبران کی جمال پور علاج کے لیے آمد کی وجہ سے حکومت نے ان کی سہولت کے لیے مجبوراً کئی ایسے کام کئے تھے جن کا براہ راست جمال پور کے عوام کو فائدہ پہنچ رہا تھا۔ اتنی بڑی واضح اور مثبت تبدیلی کے بعد جمال پور کے عوام کو رضوان کے خلاف بھڑکانا ممکن نہیں تھا۔ اس سے پہلے ایک مولانا یہ کوشش کر کے دیکھ چکے تھے، ان کا حشر سب ملّاؤں کے

سامنے تھا۔ اب وہ سارا دن اپنے ساتھیوں سمیت بندروں کی شکل میں جمال پور میں ہسپتال کے سامنے اچھلتے کودتے رہتے تھے اور یوں آنے جانے والوں کے لیے باعثِ عبرت بنے ہوئے تھے۔

اس لیے ملّاؤں نے فیصلہ کیا کہ رضوان کے خلاف تمام ضروری بارود میسر آنے کے باوجود وہ اس کے خلاف احتیاط اور مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ کاروائی کریں گے اور اس کے فتنے سے پاکستان کو ہمیشہ کے لیے پاک کر دیں گے۔

اس بار وہ کسی غلطی کا چانس نہیں لینا چاہتے تھے۔

فصل36

ایک صبح جمال پور کے باسی کاموں پر جانے کے لیے اپنے گھروں سے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ گاؤں سے باہر ایک جگہ پاکستان بھر سے ہزاروں کی تعداد میں آئے ملّاں جمع ہیں اور کسی جگہ لشکر کشی کی تیاری کر رہے ہیں۔

چونکہ اب تک جمال پور کے سب لوگوں کو رضوان پر ہونے والے مختلف حملوں کی وجہ سے اندازہ ہو چکا تھا کہ پاکستان بھر کے ملّاں رضوان کے خلاف سرگرم عمل ہیں انہوں نے فوراً سارے جمال پور میں ہر گلی محلے میں جا کر گھروں میں موجود لوگوں کو گاؤں سے باہر ملّاوں کے اجتماع کے بارے میں مطلع کر دیا۔

جیسے ہی لوگوں کو گاؤں سے باہر ملّاوں کے اجتماع کی اطلاع ملی سب جس کے ہاتھ جو لگا اٹھا کر گھروں سے باہر نکل آیا۔ چند لمحوں میں جمال پور کے ہزاروں لوگ ملّاوں کے اجتماع کے سامنے لاٹھیوں، گنڈاسوں، درانتیوں اور ٹوکوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

اس سارے ڈرامے میں سب سے اہم رول بندروں نے ادا کیا۔ سارے کے سارے بندر مولانا بندر کی قیادت میں جمال پور والوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

انہوں نے بھی اپنے ہاتھوں میں پتھر اٹھا رکھے تھے۔ اور لگتا تھا کہ وہ جمال پور والوں کے فیصلے کے منتظر ہیں۔ جیسے ہی جمال پور والے مولویوں کے لشکر سے ٹکرائیں گے بندر بھی ان کے ساتھ مل کر ان پر پتھراؤ کریں گے۔

ملّاوں نے بندروں کو جمال پور والوں کے ساتھ کھڑے دیکھا تو ان کے لیڈر نے بندروں کو اسپیکر پر مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ سارے پاکستان سے ان کا انتقام لینے کے لیے جمال پور آئے ہیں۔ رضوان

نے جادو کے زور سے انہیں انسانوں سے بندر بنا دیا ہے۔ وہ انہیں بندروں سے واپس انسان تو نہیں بنا سکتے لیکن رضوان، اس کی بیوی، بیٹی اور دوستوں کو سنگسار کر کے ان سے انہیں بندروں میں تبدیل کرنے کا انتقام ضرور لے سکتے ہیں۔

مولانا بندر نے باہر سے آنے والے مولویوں کے لیڈر کی تقریر سنی تو بھاگ کر سب سے اونچے درخت پر چڑھ گیا۔ پھر ایک ایسی شاخ پر بیٹھ کر جہاں سے اسے جمال پور والے اور باہر سے آنے والے واضح طور پر دیکھ سکتے تھے بندروں کی طرح خوخیا کر اور اچھل کود کر انہیں سمجھا رہا تھا کہ وہ ایسا نہ کریں۔ کافی دیر اس طرح چیخنے اور اچھل کود کرنے کے بعد آخر وہ مولویوں کی طرف منہ کر کے، دانت نکال کر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ گویا کہہ رہا ہو کہ ہمارے حال سے عبرت پکڑو اور اپنے احمقانہ خیال سے باز آ جاؤ ورنہ تمہارا حال ہم سے مختلف نہیں ہو گا۔

جمال پور سے باہر یہ سین چل رہا تھا کہ کسی نے جا کر رضوان کو جمال پور والوں اور باہر سے آئے ہوئے ہزاروں مولویوں کے درمیان میدان جنگ سجنے کی اطلاع دی۔

رضوان نے خاموشی اور اطمنان کے ساتھ یہ اطلاع وصول کی اور اپنی وائلن اٹھا کر ملاؤں کے اجتماع کی طرف چل پڑا۔ حیدر، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ نے بھی اس کے ساتھ جانا چاہا لیکن اس نے انہیں وہیں رکنے کے لیے کہا۔

ابھی وہ ملاؤں کے اجتماع کی طرف جا رہا تھا کہ مولانا بندر باقی ساتھیوں کو ساتھ لیے اس کے ساتھ ساتھ اس سے آگے چلنے لگا۔ ایسے لگ رہا تھے کہ سارے بندر اس کے ہراول دستے کے طور پر اس کے ساتھ چل رہے ہیں۔

ملاؤں نے یہ منظر دیکھا تو پریشان ہو گئے۔ جمال پور والے اگر رضوان کے دفاع میں ڈٹ گئے تھے تو یہ قابل فہم تھا لیکن بندروں میں تبدیل ہونے والے مولانا اور ان کے ساتھیوں کی رضوان کے ہراول دستے کے طور پر پیش قدمی ان کے لیے ناقابل فہم تھی۔

اس کے باوجود آخری بار لوگوں کے جذبات بھڑکانے کے لیے ملاؤں کے لیڈر نے وہاں رکھے گئے اسپیکر پر اپنے ساتھیوں سے خطاب شروع کر دیا:

"آپ سب قابل مبارک باد ہیں کہ پاکستان کے دوردراز علاقوں سے فقط اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس فتنہ رضوانی کو نیست ونابود کرنے کے لیے آئے ہیں۔

یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں اس کی تفصیل تمام روایات میں موجود ہے۔ آئمہ نے ہمیں ان کے بارے میں اپنے اپنے زمانوں میں پہلے سے خبر دار کر دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ قیامت آنے سے پہلے ایسے محیر العقول واقعات رونما ہوں گے جن کی تم کوئی وضاحت نہیں کر پاؤ گے۔ پس تم جان لینا کے ایسے سب واقعات شیطان رجیم کی طرف سے ہیں۔

اگر تم ایسے واقعات دیکھو تو سمجھ جانا کہ قیامت قریب ہے اور تم اپنی سی کوشش کرنا کہ ایسے فتنوں کا بذریعہ طاقت خاتمہ کر سکو۔ اگر تم ایسے فتنوں کا خاتمہ کرنے میں کامیاب رہے تو انعام میں جنت ملے گی۔ اگر مارے گئے تو بھی سیدھے جنت میں جاؤ گے۔"

اپنے سامعین کو جنت کا جھانسہ دینے کے بعد مولانا اپنی تقریر میں اصل بات کی طرف آئے:

"جمال پور والو میں اللہ اور رسول سے بری الذمہ ہونے کے لیے تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ جس کی تم حفاظت کر رہے ہو وہ شریعت محمدی کے تحت سنگسار کئے جانے کے قابل ہے۔

ہم نے تحقیق کی ہے کہ وہ شیر و کمہار کا بیٹا نہیں۔ بلکہ وہ چوہدری نثار اور نگو کے ناجائز تعلقات کی پیداوار ہے۔ وہ پیدائشی حرامی ہے۔ گناہ کی کوکھ سے جنم لیے والے اس ڈاکٹر کا یہی گناہ کافی ہے کہ پہلے اسے سنگسار کیا جائے اور اس کے بعد اس کی نعش کو جلا دیا جائے تاکہ اس کی موجودگی سے پاکستان کے سماج پر برے اثرات مرتب نہ ہوں۔

لیکن ہماری تحقیق صرف یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس سے پہلے کہ یہودی اور نصرانی اسے امریکہ لے گئے تھے یہ لاہور ڈیفنس میں اپنی چار ہم مکتب لڑکیوں کے ساتھ بغیر شادی کئے ایک چھت تلے رہتا تھا۔ اس

طرح اس نے اس وقت بھی اپنے ناپاک وجود اور شرمناک حرکتوں سے شعائر اسلام کی توہین کی۔ جب ڈیفنس کے مولانا نے اس کو روکنے کی کوشش کی تو اس نے اپنے سرپرستوں کے ساتھ مل کر مولانا کو اغوا کرایا، ان پر دن رات تشدد کیا، جب وہ مرنے لگے تو انہیں چھوڑ دیا۔

اس کے بعد اس کے یہودی اور نصرانی آقا اسے امریکہ لے گئے۔ وہاں انہوں نے اپنی ایک کتیا اس کے ساتھ لگادی جس سے اس نے بغیر نکاح کئے ایک بیٹی کو جنم دیا۔

اب یہ سارے مل کر یہاں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ اس کا ہسپتال اور ریسرچ سنٹر دراصل یہودیوں اور نصرانیوں کا خفیہ اڈہ ہے جس کے ذریعے وہ پاکستان کے لوگوں میں ایسے جراثیم پھیلانا چاہتا ہے جس سے وہ شرعی غیرت سے آزاد ہو کر ہمیشہ کے لیے بے غیرت ہو جائیں۔ یاد رکھو دینی غیرت اور حرمت ہی تمہارا وہ اثاثہ ہے جس سے تم اس دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو۔ اگر تم سے دینی غیرت اور حرمت چھن گئی تو سمجھ لینا کہ دنیا تو تم سے گئی ہی ہے تمہارے ہاتھ سے دین بھی نکل جائے گا اور کل روز قیامت اللہ کے حضور تمہیں شرمسار ہونا پڑے گا۔"

جو ملّا باہر سے آئے تھے وہ اپنے راہبر کی تقریر پر اللہ اکبر اور نعرۂ رسالت کے نعرے بلند کرتے رہے۔ جبکہ جمال پور والے اپنی لاٹھیاں، گنڈاسے، درانتیاں اور ٹوکے لہرا کر ان کے نعروں کا جواب دیتے رہے۔ وہ مکمل طور پر آمادہ تھے کہ اگر ملّاوں نے قدم آگے بڑھایا تو اس سے پہلے کہ وہ رضوان کی طرف بڑھیں یا ہسپتال کی طرف جائیں وہ ان پر یلغار کریں گے اور ان کو تہس نہس کر دیں گے۔

ملّاوں نے جب جمال پور والوں کی لاٹھیاں، گنڈاسے، درانتیاں اور ٹوکے دیکھے تو کچھ نرم پڑ گئے۔ وہ آئے تھے رضوان، اس کی بیوی، بیٹی اور اس کی ساتھیوں کو سنگسار کرنے کے لیے لیکن یہاں سین ہی مختلف تھا۔ پورا جمال پور رضوان کی حمایت میں ان کے مدّ مقابل تھا۔ مولانا بندر اور ان کے ساتھی بھی ہاتھوں میں پتھر پکڑے رضوان کی طرف کھڑے ہو کر باہر سے انے والے ملّاوں کی طرف دیکھ کر دانت نکوس رہے تھے۔

ملّاوں نے رضوان کو جمال پور اور اور بندروں کے درمیان دیکھاتو اسپیکر پر اعلان کیا کہ وہ اپنے آپ کو، اپنی بن بیاہی بیوی، بیٹی اور اپنی ساتھیوں کو ان کے حوالے کر دے تو وہ ان کو اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق سنگسار کر کے پر امن طریقے سے واپس چلے جائیں گے لیکن اگر اس نے اپنے آپ کو ان کے حوالے نہ کیا تو وہ اس وقت تک وہاں خیمہ زن رہیں گے جب تک وہ اپنے مقصد کے حصول تک نہیں پہنچتے۔

رضوان نے ملّاوں کا مطالبہ سنا تو اس نے انہیں وارننگ دی کہ وہ جلد سے جلد وہاں سے چلے جائیں ورنہ ان میں سے جو اندر سے جیسا ہے اسے باہر سے ویسا بنا دیا جائے گا۔

ملّاوں نے رضوان کی وارننگ سنی تو لا الہ کا ورد کرتے ہوئے پتھر اٹھائے اس کی طرف بھاگے۔ جمال پور والے لاٹھیاں، گنڈاسے، درانتیاں اور ٹوکے لہراتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔

مولانا بندر اور اس کے ساتھیوں نے درختوں پر چڑھ کر باہر سے آئے ملّاوں کی طرف پتھر پھینکنے شروع کر دیئے اور پھر دھڑ ادھڑ اپنا سینہ پیٹنے لگے۔

رضوان نے صورت حال ہاتھ سے نکلتی دیکھی تو فوراً بائیں کندھے پر وائلن سیدھی کی اور دائیں ہاتھ سے باو کو اس پر حرکت دینی شروع کر دی۔

وائلن کی سروں کے ساتھ ہی رضوان کی طرف بھاگتے ہوئے ملّاوں کے قدم رک گئے۔ ان کے ہاتھوں میں پکڑے پتھر گر گئے۔ اور وہ رفتہ رفتہ رضوان کی وائلن کی سروں کی گرفت میں آ گئے۔

جمال پور والے بھی اپنی اپنی جگہ پر ٹھہر گئے۔ جس کے ہاتھ میں جو تھا وہ اسے پکڑے پکڑے وائلن کے سحر میں کھو گیا۔ تھوڑی دیر میں جمال پور کے باہر بننے والی رزم گاہ امن گاہ میں تبدیل ہو گئی لیکن یہ امن گاہ صرف ان کے لیے تھی جو رضوان کے ساتھ تھے۔ جو اس کے مخالف تھے ان کے ڈی این ایز میں تبدیلی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ درختوں پر چڑھے مولانا بندر اور ان کے ساتھی بھی شانت ہو چکے تھے۔

ایک عجیب سماں تھا۔

رضوان کی وائلن کی دُھنیں بلند سے بلند تر ہوتی جارہی تھیں اور پاکستان بھر سے آے ملّاوں کی شکلیں تبدیل ہونے لگی تھی۔ کوئی بندر بن چکا تھا، کوئی گیدڑ، کوئی بھیڑیا، کوئی لومڑ، کوئی لگڑبگا، کوئی بلا، کوئی کتا، کوئی بھالو، کوئی ہاتھی۔ ایسے لگتا تھا کسی جنگل میں آگ لگی ہے اور سارے جانور بلا تمیز ایک ساتھ آگ سے بھاگ رہے ہیں۔ جس ملاّنے جو شکل اختیار کی تھی وہ اسی جانور کی آواز میں چیخ رہا تھا۔ سارے علاقے میں ایک کہرام برپا تھا۔

رضوان نے آہستہ آہستہ وائلن بجانا بند کی تو مولانا بندر اپنے ساتھیوں سمیت انسانی شکلوں میں درختوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ سارے جمال پور والے رضوان کے گرد جمع تھے۔

چند دن پہلے انہوں نے رضوان کی وائلن سے ایک مولانا اور ان کے ساتھیوں کو بندر بنتے دیکھا تھا آج تو سین ہی اور تھا۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کر رضوان سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

مولانا بندر اپنے ساتھیوں سمیت انسانی شکل میں درختوں سے اتر کر رضوان کے سامنے جھک گئے۔ ان کی داڑھیاں آنسوں سے تر تھیں۔ وہ روتے جاتے اور رضوان سے کہتے جاتے کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ دین کا مطلب کیا ہے۔ اس نے انہیں بندر بنا کر حقیقت آشنا کر دیا ہے۔ اصل جج اللہ تعالی کی ذات ہے۔ اگر کوئی اور داڑھی بڑھا کر، گلا پھاڑ کر واعظ کر کے، یا جگالی کرتے بکروں کے انداز میں عربی بول کر یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے علاوہ باقی سب انسانوں کا جج ہے تو وہ غلط سمجھتا ہے۔

پھر انہوں نے ارد گرد پھیلے ملاّوں کے لشکر کو بندروں، بھالووں، لگڑ بھگوں، بھیڑیوں، کتوں، بلوں اور ہاتھیوں کی شکل میں چیختے چنگاڑتے دیکھا تو ہاتھ باندھ کر رضوان سے بولے کہ وہ انہیں معاف کر دے۔ وہ خود غرض جاہل علما نہیں جانتے کہ اصل علم کیا ہے۔ رضوان نے کہا جس طرح چند دن بندر بننے کے بعد ان کی تعلیم ہوئی ہے اسی طرح وہ انہیں بھی چند دن تک تنہا چھوڑ دے گا تا کہ وہ بھی حقیقت آشنا ہو جائیں۔

پھر وہ سب کو وہیں چھوڑ کر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا اپنے ہسپتال کی طرف واپس چلا گیا۔

فصل 37

پاکستان کے مثالی علما میں سے کسی نے رضوان کے خلاف تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا۔ لیکن سارے کے سارے شر پسند علما اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور اور رضوان دشمنی میں چُور جمال پور کھنچے چلے آئے تھے جن کی داخلی سرشت کے مطابق رضوان نے اپنے وائلن کی سروں سے قلب ماہیت کر کے ان کا اندر باہر ایک کر دیا تھا۔ رضوان نے اپنے تجربے سے یہ بات سیکھی تھی کہ ارتقا کی منازل طے کرنے کے باوجود انسان میں زندگی بھر ان سب حیوانوں کی وہ صفات موجود رہتی ہیں جن سے وہ اپنے لاکھوں برسوں کے حیاتیاتی سفر سے گزرا ہوتا ہے۔ اس لیے بعض انسان اکثر اوقات دوسرے انسانوں سے برتاؤ میں انسانوں کی بجائے کتوں، خنزیروں، ریچھوں، چیتوں یا شیروں کی طرح ایکٹ کرتے ہیں۔

سادہ دل انسان نہیں جانتے کہ ان انسانوں کا رویہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ حالانکہ ایسے رویے اس حیاتیاتی رو کے ذریعے ان کی ذات سے رو پذیر ہو رہے ہوتے ہیں جس نے اب بھی انہیں زندگی کی اس سطح سے باندھ رکھا ہوتا ہے جس سے وہ اپنے ارتقائی سفر میں لاکھوں برس پہلے گزرے تھے۔

جن شر پسند ملّاوں کو رضوان نے اپنے وائلن کی دُھنوں سے بندروں، بھالوؤں، لگڑ بھگوں، بھیڑیوں، کتوں، بلوں، ریچھوں اور ہاتھیوں میں تبدیل کیا تھا وہ سارا دن جمال پور کے گرد و نواح میں پھرتے رہتے۔

جمال پور کے بچے بوڑھے انہیں دیکھ کر ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے اور لطف اندوز ہوتے۔ مولانا بندر اور ان کے ساتھی انسانی ہیت میں لوٹنے کے بعد شہر واپس جانے کے بجائے وہیں جمال پور میں رہائش پذیر ہوئے اور وہیں وعظ و نصیحت اور درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔

جس مافوق الفطرت تجربے سے وہ گزرے تھے اس سے ان کی ایسی کایاپلٹ ہوئی تھی کہ اب وہ لوگوں کو خدا سے ڈرانے دھمکانے کی بجائے خدا سے محبت کا درس دیتے۔ لوگوں کو مذہب کے نام پر لڑانے کی بجائےُ انہیں صلح کل اور انسان دوستی کا سبق دیتے۔

وہ اس مافوق الفطرت تجربے سے ناخوش بھی تھے اور خوش بھی۔ ناخوش اس لیے کہ اس تجربے سے گزرنے سے پہلے والے اپنے اعمال پر انہیں دکھ تھا۔ انہیں افسوس تھا کہ دین کے نام پر انہوں نے جو کچھ کیا اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

خوش اس لیے کہ ان پر زندگی کی یکتائی کا راز کھل گیا تھا۔ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ پتھر کے نیچے سے اگنے والے گھاس کی پتی سے لیکر انسان تک زندگی ایک ہے۔ اور زندگی کے ہر مظہر کو زندگی کے دوسرے مظہر کا احترام کرنا چاہیئے۔

رضوان کو جمال پور لوٹے اب کئی سال ہو چکے تھے۔ ملّاوں کی شورش دم توڑ چکی تھی۔ ایک دن سمیرا نے اسے کہا کہ ہسپتال کے گیٹ کے پاس اس کی گدھے کے ساتھ بنائی گئی تصویر پر مبنی مجسمے کی نقاب کشائی کا فریضہ ابھی باقی ہے۔

رضوان کو یو ایس اے سے رخصت ہونے سے قبل اس ضمن میں سمیرا سے فون پر کی گئی اپنی بات چیت یاد آئی۔

"ہاں، ہاں، سمیرا جان میں جمال پور لوٹنے کے بعد یکے بعد دیگرے ایسے گورکھ دھندوں میں الجھا کہ مجھے اس مجسمے کی نقاب کشائی کے بارے میں کچھ یاد نہ رہا۔ ہسپتال، ریسرچ سنٹر اور ان بندروں اور بھالوؤں نے مجھے یوں اُلجھائے رکھا کہ اس بارے مجھے سوچنے کا بالکل موقع نہ ملا۔"

" اس سارے عمل سے گزرنا بھی ضروری تھا۔ اب سارا کچھ طے ہونے کے بعد ہمیں اس مجسمے کی نقاب کشائی پر بھرپور توجہ دینی چاہیے۔"

"سمیرا تم ٹھیک کہتی ہو۔ اس سلسلے میں میں نے تمہیں چند نام دیئے تھے۔ کیا ان میں سے کسی سے تمہارا رابطہ ہوا؟

"ہاں، رضوان، تم سے بات ہونے کے بعد میں نے تمہارے پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر، تمہارے میوزک ٹیچر اور گورنمنٹ کالج میں تمہارے استاد ڈاکٹر نذیر احمد کا پتہ کرایا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی تمہاری کامیابیاں دیکھنے کے لیے اب اس دنیا میں موجود نہیں۔"

اپنے محبوب آئیڈیلز کی دنیا سے رخصتی کی خبر سن کر رضوان کا دل بجھ گیا۔ اس نے سمیرا سے پوچھا کیا وہ مجسمہ ساز ابھی موجود ہے جس نے اس کی گدھے کے ساتھ تصویر کو اس مجسمے کا روپ دیا تھا۔ سمیرا نے بتایا کہ وہ اس کے والد کرنل اکرام کا اچھا دوست ہے اور ابھی شہر میں موجود ہے۔ رضوان نے سمیرا سے کہا کہ وہ اس سے رابطہ کرے اور پوچھے کہ وہ کس طرح اس کی آئیڈیل شخصیتوں کی تصویروں کو اس مجسمے کا حصہ بنا سکتا ہے؟

سمیرا اور رضوان کے درمیان یہ گفتگو ہسپتال میں فیکلٹی کمپلیکس کے گارڈن میں بچھی کرسیوں پر بیٹھ کر ہو رہی تھی۔

سردیاں تقریباً ختم ہو چکی تھیں اور گرمیوں کا ابھی آغاز نہیں ہوا تھا۔ ہوا نہ گرم تھی نہ سرد۔ ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کے ارد گرد بنائے گئے گارڈنوں میں لگے پودے پھولوں سے لدے رہے تھے۔ ان پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سارے ماحول میں پھیل رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد حیدر، مونا، عذرا، یاسمین اور شائستہ بھی وہاں آ گئیں تو ہسپتال کا گارڈن قہقہوں سے گونجنے لگا۔

عذرا اور حیدر رضوان اور سمیرا کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئیں جبکہ یاسمین اور شائستہ مونا کے ساتھ گارڈن میں آگے پیچھے دوڑنے اور کھیلنے لگیں۔

حیدر نے رضوان سے پوچھا کہ وہ اور سمیرا کس چیز کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اس نے حیدر اور

عذرا کو بتایا کہ وہ ہسپتال کے گیٹ کے پاس نصب شدہ مجسمے کی نقاب کشائی کے بارے میں پروگرام بنا رہے ہیں۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا اس کی خواہش تھی کہ اس کی زندگی میں اہم کردار ادا کرنے والے تین اساتذہ اس مجسمے کی نقاب کشائی کریں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ تینوں فوت ہو چکے ہیں۔ اب سمجھ نہیں آرہی کہ ان کی اس اہمیت کو کیسے نمایاں طور پر اس اہم کام کا حصہ بنایا جائے۔ حیدر نے رضوان کی بات سنی تو کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ پھر کہنے لگی اس کا ایک امریکی حل ہے۔ رضوان، سمیرا اور عذرا نے دلچسپی اور تجسس سے حیدر کی طرف دیکھا۔

حیدر نے رضوان کو پہاڑ پر بنے امریکہ کے ابتدائی بانیوں کے مجسموں کے بارے میں یاد دہانی کراتے ہوئے کہا کہ وہ اسی اسٹائل میں اس مجسمے کے پس منظر میں اپنے ان اساتذہ کے مجسمے اس طرح نصب کروائے کہ وہ موجودہ مجسمے کا حصہ بن جائیں۔

حیدر کی تجویز سن کر رضوان، سمیرا اور عذرا کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ انہیں یہ خیال اچھا لگا۔ رضوان نے کہا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ اور اس مجسمے کے پیڈیسٹل پر ان کی تصویریں کھدوانے کے بجائے ان کے مجسمے نصب کرے گا۔

حیدر نے رضوان کو اپنی تجویز سے متفق پایا تو کہنے لگی بہتر ہو گا کہ وہ اپنے اساتذہ کے مجسموں کے علاوہ اپنے باپو اور امی کے مجسمے بھی وہاں نصب کروائے۔

سمیرا اور عذرا کو حیدر کا یہ خیال بھی اچھا لگا۔ انہوں نے کہا اس طرح رضوان کی زندگی میں تمام اہم کردار ایک جگہ جمع ہو جائیں گے۔

رضوان نے حیدر، سمیرا اور عذرا کی بات سن کر کہا کہ وہ سب اس کا ماضی ہیں۔ اگر تاریخ کو محفوظ کرنا ہے تو وہ سب بھی اس میں کیوں شامل نہ ہوں جو حال میں اس کے ساتھ اہم کردار ادا کر رہے ہیں؟ پھر اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس کا اشارہ حیدر، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ کی طرف ہے۔

عذرا نے حیدر کی طرف شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور ہماری ننھی منی مونا کو آپ کیوں بھول رہے ہیں؟

رضوان نے عذرا کی بات سن کر کہا کہ مونا اس سے باہر کیسے رہ سکتی ہے۔ وہ ہم سب کی زندگیوں کا حصہ ہے۔ جہاں ہم ہیں وہاں وہ ہے۔ اور جہاں وہ ہے وہاں ہم سب ہیں۔

جب یہ بات ہو رہی تھی مونا بھاگتی ہوئی آئی اور رضوان کے زانوؤں پر بیٹھ گئی۔ یاسمین اور شائستہ بھی اس کے پیچھے بھاگ رہی تھیں وہ بھی آ کر باقیوں کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

رضوان نے مجسموں کی تنصیب کی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اگر ہم اتنے سارے مجسمے بنوائیں گے تو شاید اس کے لیے ہمیں کافی وقت چاہیئے ہو گا۔

ہمارے پاس دو آپشنز ہیں کہ ہم فی الحال اس مجسمے کی نقاب کشائی کریں یا باقی مجسموں کی ساخت اور تنصیب تک اس کی نقاب کشائی کو معرض التوا میں ڈال دیں۔

سمیرا اور عذرا کا خیال تھا کہ اس مجسمے کی نقاب کشائی کر دی جائے جبکہ باقی مجسمے بعد میں نصب کر دیئے جائیں۔

حیدر کا خیال تھا کہ باقی مجسموں کی ساخت اور تنصیب تک انتظار کیا جائے۔ جب سارے کے سارے مجسمے ہماری تسلی کے مطابق نصب ہو جائیں تو اس کے بعد ان کی نقاب کشائی کی جائے۔

پھر کہنے لگی چونکہ پاکستان میں مجسمہ سازی اور ایسی جگہوں پر مجسموں کی تنصیب کا کوئی رواج نہیں، ہو سکتا ہے کچھ لوگوں کو یہ چیز پسند نہ آئے اور وہ اس پر معترض ہوں۔ ہمیں لوگوں کی ثقافتی روایات کا بہر حال پاس کرنا چاہیئے۔

رضوان نے حیدر کی بات سنی تو ہنستے ہوئے کہا جنہوں نے اعتراض کرنا تھا اور مجسموں کی ساخت اور تنصیب کو مسئلہ بنانا تھا ان میں سے کچھ کی پہلے ہی اصلاح ہو چکی ہے اور باقی بندروں، بھالوؤں، لگڑ بھگوں، بھیڑیوں، کتوں، بلوں اور ہاتھیوں کی شکل میں اصلاح کے عمل سے گزر رہے ہیں۔

اس لیے ہمیں اس مسئلے پر فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب تک مجسمے بنیں گے اور ان کی تنصیب ہو گی اور نقاب کشائی کا مرحلہ آئے گا ان کی تہذیبِ نفس بھی ہو جائے گی۔

رضوان کی بات سے سب نے اتفاق کیا۔ سمیرا نے کہا کہ وہ جلد ایرانی مجسمہ ساز سے رابطہ کر کے سب مجوزہ لوگوں کے مجسمے بنانے اور انہیں رضوان کی گدھے والی تصویر کے مجسمے کے ساتھ نصب کرنے کا اہتمام کرے گی۔

ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی آ رہی تھی- اس فیصلے کے بعد وہ سب اٹھ کر گھر کے اندر چلے گئے۔ جب کہ جانوروں میں تبدیل کئے گئے سب مولانا اپنے حیوانی جسموں میں محبوس ہسپتال کے باہر ڈکراتے رہے۔

فصل 38

گرمیاں گزریں تو جنوب کی طرف سے آنے والی ہواؤں نے پانی سے بھری چھاگلوں کی طرح اپنے منہ کھول دیے۔ پانی سے سارا پنجاب جل تھل ہو گیا۔

ایسے میں آسمان پر بجلیاں چمکتیں اور بادل گرجتے تو لگتا راجہ پورس کی فوجیں بڑھی چلی آ رہی ہیں۔

موسم کی سختیوں کی تاب نہ لاتے ہوے کئی ملاں جانوروں کی شکل میں جمال پور کے کھیتوں کھلیانوں میں مردہ پائے گئے۔

اتنی بڑی تعداد میں جانوروں کی موت اوران کے مردہ جسموں سے آنے والی سڑاند کی بو سے پریشان ہو کر جمال پور والے رضوان کے پاس آئے کہ انہیں ان جنگلی جانوروں سے نجات دلائی جائے۔ رضوان نے ان سے وعدہ کیا کہ بہت جلد وہ ہسپتال کے بڑے گیٹ کے پاس نصب کئے گئے مجسموں کی نقاب کشائی کرنے جارہا ہے۔ اس موقع پر وہ ان جانوروں کو ان کے انسانی جسم واپس لوٹا دے گا۔

سمیرا اور عذرا مجسموں کی ساخت اور تنصیب کی ذمہ دار تھیں۔ ان کی طرف سے پہلے ہی رضوان کو اس پراجیکٹ کی تکمیل کی رپورٹ مل چکی تھی۔

ایرانی مجسمہ ساز نے کمال ہنر سے رضوان کی گدھے والی تصویر کے مجسمے کے ساتھ شیر و کمہار، نگو، رضوان کے پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر، اس کے میوزک کے استاد اور گورنمنٹ کالج میں اس کے استاد ڈاکٹر نذیر احمد کے مجسمے اس طرح بنائے اور نصب کئے کہ نہ صرف ان کی ساخت اور تنصیب سے رضوان کی ماضی کی ساری زندگی کے سارے اہم اجزا ایک جگہ جمع ہو گئے بلکہ حیدر، مونا، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ کے مجسموں سے اس کا حال اور مستقبل بھی مجسموں کی شکل میں ڈھل گئے۔

اب مسئلہ درپیش تھا مجسموں کی نقاب کشائی کا۔ حیدر چاہتی تھی کہ ساوتھ افریقا سے نیلسن میڈیلا کو دعوت دی جائے اور ان کے ہاتھوں مجسموں کی نقاب کشائی کرائی جائے۔

اس کا کہنا تھا کہ نیلسن مینڈیلا اس دور کے عظیم ترین انسان ہیں۔ انہوں نے ایک عام آدمی، ایک قیدی، ایک سربرہِ مملکت اور ایک جنگ مخالف لیڈر کے طور پر آج کی دنیا میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔

ایک تو ان کے پاکستان آنے کی وجہ سے پاکستان کی دنیا میں نیک نامی ہو گی اور دوسرا ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کی بین الاقوامی ساکھ اور توقیر میں اضافہ ہو گا۔ حیدر نے اپنی تجویز کے ساتھ یہ پیشکش بھی کی کہ اگر رضوان، سمیرا، عذررا، یاسمین اور شائستہ تیار ہوں تو وہ امریکن ایمبیسی کے توسط سے نیلسن منڈیلا کو دعوت بھجوانے اور یہاں لانے کا اہتمام کر سکتی ہے۔

رضوان، سمیرا، عذررا، یاسمین اور شائستہ نے نیلسن منڈیلا سے مجسموں کی نقاب کشائی کا خیال پسند کیا لیکن ان کا کہنا تھا کہ نیلسن منڈیلا کی پاکستان آمد سے پاکستان کی نیک نامی میں ضرور اضافہ ہو گا تاہم ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کی بین الاقوامی سطح پر ساکھ پہلے ہی اتنی مستحکم ہو چکی ہے کہ پوری دنیا میں میڈیکل ریسرچ کا شاید ہی کوئی ادارہ ہو گا جو ان کے ادارے اور یہاں ہونے والی ریسرچ کی کوالٹی اور اہمیت سے آشنا نہ ہو۔

اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس اہم کارنامے کی وجہ سے پاکستان میں نچلی کلاس کے لوگوں کی اہمیت اور افادیت کو اجاگر کیا جائے۔ سمیرا نے کہا کہ جب یو ایس اے میں اس کی رضوان سے فون پر بات ہوئی تھی تو اس نے اپنے عظیم اساتذہ کے علاوہ اپنے باپو کا ذکر بھی کیا تھا۔ میری رائے ہے کہ ان مجسموں کی نقاب کشائی رضوان کے باپو اور ماں سے کروائی جائے جبکہ فنکشن میں صدرِ پاکستان سے لیکر امریکی سفیر تک سب کو دعوت دی جائے۔

سب کو سمیرا کا مجموں کی نقاب کشائی کے حوالے سے یہ خیال اچھا لگا۔ حیدر نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا۔ اس کا بھی کہنا تھا کہ اس کام کے لیے رضوان کے باپو اور امی سے بہتر کوئی نہیں جن کے بیٹے نے سماج کی انتہائی نچلی سطح سے ہونے کے باوجود پوری دنیا میں اپنا نام روشن کیا ہے۔

حیدر کی بات سن کر رضوان کی آنکھیں پُر نم ہو گئیں۔ ایک عام انسان کی طرح اسے اپنے باپ اور ماں سے بے پناہ محبت تھی وہ ان کا انتہائی احترام کرتا تھا۔

خاص طور پر اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ اس کے ماں باپ پاکستانی سماج کے ایک ایسے مظلوم طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن کے لیے نہ صرف روٹی روزی کا سلسلہ چلانا مشکل کام ہوتا ہے بلکہ انہیں معاشی طور پر اس شدید تقسیم کے حامل سماج میں بے شمار دیگر زیادتیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

خود اس کی ولدیت کی حوالے سے اس کے ماں باپ کو سماجی طور پر جو طعنے اور گالیاں سنی پڑتی تھیں اور جس خندہ پیشانی اور بند کانوں کے ساتھ وہ یہ طعنے اور گالیاں برداشت کرتے تھے اس سے انہیں پہنچنے والی اذیت کا بھی اسے خوب اندازہ تھا۔

اسی وجہ سے اس نے جمال پور کے تمام خاندانوں کا میڈیکل ڈیٹا بیس ہسپتال میں جمع کیا تھا۔ اس ڈیٹا بیس کو اکٹھا کر کے ایک تو وہ اپنے لوگوں کو بہتر طبی سہولتیں فراہم کرنا چاہتا تھا دوسرے وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کا حیاتیاتی باپ کون ہے۔

گاؤں کے زیادہ تر لوگ اس کی ماں پر چوہدری نثار کے ساتھ ناجائز تعلقات کا الزام لگاتے تھے اور اسے ان کے ناجائز تعلقات کا ثمر قرار دیتے تھے۔ اس نے چوہدری نثار کے ڈی این کے ساتھ اپنے ڈی این اے کا کئی بار موازنہ کیا لیکن ہر بار منفی نتیجہ برآمد ہوا۔ اس کے اور چوہدری نثار کے ڈی این میں کوئی ایسی مشترک چیز نہیں تھی جو ان دونوں کے درمیان باپ بیٹے کے رشتے کا تعین کرتی۔ اس منفی نتیجے سے وہ مطمئن تھا کہ لوگوں کے چوہدری نثار اور اس کی ماں پر لگائے گئے الزامات غلط تھے۔

ان الزامات کے حیاتیاتی طور پر غلط ثابت ہونے پر جہاں اسے ایک طرح کا ذہنی اطمینان حاصل ہوا وہیں اس کی روح اپنی ماں کی مظلومیت اور اس کے دکھوں کی شدت سے ایک زخمی پرندے کی طرح تڑپ اٹھی۔

رضوان اس سارے کائناتی ڈرامے اور زندگی کے تسلسل کے تناظر میں عورت کو بہت اہمیت دیتا تھا اور اس کی حرمت کا قائل تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عورت زندگی کی امین ہے۔ وہ نہ صرف زندگی کے خوبصورت ترین اجزا کا مرقع ہوتی ہے بلکہ وہ زندگی کی افزائش اور بقا کا اہم ترین فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے۔

اسے جہاں کہیں کوئی دکھی عورت دکھائی دیتی اس کا دل تڑپ اٹھتا۔ اس کا جی چاہتا اس عورت کو دکھ دینے والوں کو نشان عبرت بنادے۔ اسے پوری دنیا میں عورتوں سے ہونے والی زیادتیوں کی خبریں سن اور پڑھ کر بہت قلق ہوتا۔

خاص طور پر پاکستانی سماج میں جس طرح عورت کی تذلیل کی جاتی تھی اس پر اس کا جی بہت جلتا تھا۔

بعض اوقات وہ سوچتا کہ اس کی وائلن کی دھنوں میں سمایا اعجاز دنیا بھر کی عورتوں کی مظلومیت کا کرب تھا جو انسانی شعور کی لہروں کے ذریعے ان کی روحوں کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور پھر ان کے ڈی این ایز میں چھپے غیر متناسب کوڈز نکال کر ان کو از سر نو متوازن کر دیتا ہے۔

سمیرا نے جب جمال پور کے ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کے مجسموں کی رسم نقاب کشائی کے لیے اس کے باپو شیرو کمہار اور اس کی ماں نگو کا نام تجویز کیا تو اس نے ایک شائستگی بھری مسرت کے ساتھ سمیرا سے کہا کہ کیا اسے اس کے ماں باپ کے علاوہ کوئی اور شخص نظر نہیں آتا جو یہ اہم رسم ادا کرے۔

پھر اس نے کہا کہ حیدر، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ کے ماں بھی اتنے ہی عظیم ہیں جنہوں نے اپنی بیٹیوں کی محبت میں پاکستان جیسے ظالم سماج میں انہیں میرے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہونے کی اجازت دی کہ اس سے دنیا کے اس عظیم ہسپتال اور اس سے ملحقہ ریسرچ سنٹر نے جنم لیا۔

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا اگر اسے سمیرا اور اس کی سہیلیوں کی محبت اور دوستی میسر نہ آتی تو شاید وہ کبھی امریکہ نہ جاتا، کبھی جانز ہاپکنز جائن نہ کرتا، کبھی ڈی این ایز پر اس طرح کی ریسرچ نہ کرتا، کبھی اس کی حیدر سے ملاقات نہ ہوتی اور کبھی یہ ہسپتال اور ریسرچ سنٹر معرض وجود میں نہ آتے۔ یہ ساری چیزیں، یہ سارے واقعات اس طرح آپس میں جڑے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک چیز یا واقعہ ادھر ادھر یا غائب ہو جائے تو کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔

سمیرا نے رضوان کی باتیں سنیں تو اطمینان کا سانس لیتے ہوے کہا کہ اس نے کسی کو فراموش نہیں کیا۔ بس وہ اس کی طرف سے تاریخ کے تعین کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ پہلے ہی اپنے، عذرا، یاسمیں اور شائستہ کے والدین کو مجسموں کی رسم نقاب کشائی کی اطلاع دے چکی ہے۔ وہ سب اس اہم فنکشن کا بہت بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔

پھر اس نے حیدر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر تھامسن اور مسز تھامسن سے بھی اس کی بات ہو چکی ہے۔ اس رسم نقاب کشائی کے موقع پر وہ بھی امریکہ سے تشریف لائیں گے اور ان کے ساتھ حیدر کا بھائی راجر اور اس کی وائف بھی آئے گی۔

رضوان کی گود میں بیٹھی مونا نے سمیرا سے ڈاکٹر اور مسز تھامسن کا نام سنا تو اچھل کر سمیرا کی گود میں بیٹھ گئی اور کہنے لگی کہ کب آئیں گے اس کے گرینڈ ما اور گرینڈ پا؟

سمیرا نے مونا کے رخسار پر بوسہ دیتے ہوے کہا کہ جیسے ہی ہم انہیں بتائیں گے کہ ہم کب مجسموں کی نقاب کشائی کرنے جا رہے ہیں وہ اس سے پہلے یہاں پہنچ جائیں گے۔

جب اس بات پر سب کا اتفاق ہو گیا کہ مجسموں کی رسم نقاب کشائی رضوان کا باپو شیرو کمہار اور اس کی ماں نگو کریں گے رضوان نے سمیرا اور عذرا سے کہا کہ وہ جلد سے جلد سب اہم قومی اور بین الاقوامی مہمانوں کو آج سے آٹھ ہفتے بعد کی تاریخ اور دن دے دیں۔ ساتھ ہی اس نے انہیں یہ بھی کہا کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ جمال پور کے سب باسی بھی اس میں شامل ہوں اور اس تاریخی واقعہ کا حصہ بنیں۔

"بالکل۔ کیوں نہیں۔ جمال پور والوں کو ضرور اس کا حصہ بننا چاہیئے۔ آخر یہ سب کچھ ان کا ہے۔"
سمیرا نے اثباتیہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

فصل 39

آٹھ ہفتے اتنی جلدی گزرے کہ ان کے گزرنے کا کسی کو احساس تک نہ ہوا۔ ہر کوئی مجسموں کی نقاب کشائی کے فنکشن کی تیاری میں اس طرح مصروف ہوا کہ کسی کو سر کھجلانے کی فرصت نہ ملی۔

آخر وہ دن آ پہنچا جس کا سب کو انتظار تھا۔ جس کے لیے رضوان، حیدر، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ نے رات دن ایک کر دیئے تھے۔

اس دن جمال پور میں ایک میلے کا سماں تھا۔ بچوں، بڑوں اور بوڑھوں نے صبح سویرے غسل کیا۔ نئے کپڑے پہنے۔ گلاب اور چنبیلی کی خوشبو میں روئی کے چھوٹے چھوٹے گالے تر کر کے اپنے کانوں میں اڑسے اور ہسپتال کے پنڈال کی طرف چل دیئے۔

لڑکیاں اور عورتیں بھلا مردوں سے کہاں پیچھے رہنے والے تھیں۔ انہوں نے بھی مجسموں کی نقاب کشائی کے دن اپنے بہترین لباس زیب تن کئے، کانوں میں جھمکے اور ماتھوں پر ٹکے سجائے، دنداسے سے ہونٹ لال کئے، دوپٹے گلوں میں ڈالے اور اپنے مردوں کے ساتھ پنڈال پہنچ گئیں۔

قومی سطح کے سب لیڈر صدر پاکستان سے لیکر وزیر اطلاعات تک ہر کوئی وہاں موجود تھا۔ سمیرا کے والد کرنل اکرام اپنی وردی میں ملبوس جس پر کئی طرح کے تمغے سجے تھے اس کی والدہ کے ساتھ اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔ ان کے ساتھ عذرا کے والد چیف سیکریٹری سرحد اور اس کی والدہ براجمان تھے۔ ان سے آگے یاسمین کے والدین اور ان کے ساتھ شائستہ کے والدین تشریف فرما تھے۔

وہیں اسٹیج پر امریکہ سے آئے حیدر کے والدین، ڈاکٹر اور مسز تھامسن اپنے بیٹے راجر اور بہو کے ساتھ بیٹھے تھے۔ چوہدری نثار بھی اپنی اہلیہ کے ساتھ اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔

پنڈال میں اگلی صفحوں میں مولانا بندر اپنے ساتھیوں سمیت جلوہ افروز تھے۔ ان کے چہروں کا نور ان کی پاکیزگیِ قلب کی داستان کہہ رہا تھا۔ ان کے درمیان پیر سائیں کی درگاہ کے گدی نشین بیٹھے تھے۔

ان کے پیچھے ایک طرف جمال پور کے بچے، بڑے اور بوڑھے بیٹھے تھے دوسری طرف بالیاں، لڑکیاں اور عورتیں بیٹھی تھیں۔

پنڈال کے پیچھے بارشوں میں زندہ بچ جانے والے بندر، لگڑ بھگے، بھالو، بھیڑیے، کتے، بلے اور ہاتھی کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر جانوروں کی روائتی خشونت کی بجائے عاجزی اور دردمندی کے احساسات تھے۔ وہ ترحم آمیز نظروں سے ہر آنے جانے والے کو دیکھ رہے تھے۔

اسٹیج کے عین عقب میں سب سے نچلے پیڈسٹل پر رضوان کی گدھے والی تصویر پر مبنی مجسمہ نصب تھا اس کے ایک طرف اس کی ماں نگو اور مونا اور گدھے والی جانب شیر و کمہار کا مجسمہ ایستادہ تھا۔

اس کے پیچھے تھوڑا سا اونچا پیڈسٹل تھا وہاں حیدر، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ کے مجسمے تھے۔ ان کے مجسموں کے پیچھے سنٹر میں ایک پیڈسٹل بنا تھا جس پر رضوان کے پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر، میوزک کے استاد، اور گورنمنٹ کالج میں اس کے استاد ڈاکٹر نذیر احمد کے مجسمے نصب تھے۔

مجسموں کو ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کے تعمیراتی ڈیزائین کے ساتھ اس طرح ملایا گیا تھا کہ وہ اس کا حصہ بھی نظر آتے تھے اور جدا بھی دکھائی دیتے تھے۔

ایرانی مجسمہ ساز نے ان مجسموں کی ساخت، تنصیب اور ترتیب سے ایک ایسا لافانی شاہکار تخلیق کیا تھا جو اپنے فنکارانہ حسن کے ساتھ ہزارہا سال قائم رہنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

تمام معزز مہمانوں نے مجسموں اور ان کے انداز تنصیب و ترتیب کے لیے ایرانی مجسمہ ساز کی ازحد تعریف کی۔

خاص طور پر ڈاکٹر اور مسز تھامسن بہت دیر تک مجسموں کے سامنے کھڑے ان کے جمالیاتی پہلوؤں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ پوری دنیا میں گھومے ہیں اور انہوں نے دنیا بھر کے تمام اہم مجسمے دیکھے ہیں لیکن جمال پور میں نصب ان مجسموں کا کوئی جواب نہیں۔

حیدر، سمیرا، عذرا، یاسمین اور شائستہ بھی اسٹیج پر بیٹھی تھیں۔ ننھی مونا اپنی گرینی کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

سمیرا نے مائیک سنبھال رکھا تھا اور وہ لوگوں کو ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کی کہانی سنا رہی تھی۔ اس کہانی میں اس نے اپنی اور اپنے دوستوں کی رضوان سے کے ای کالج میں پہلے دن ہونے والی ملاقات سے لیکر نتھیا گلی میں جانوروں کے کنسرٹ اور پھر اس کے جانز ہاپکنز جانے تک ان سب واقعات کی تفصیل ایسے انوکھے اور دلچسپ انداز میں بیان کی کہ سننے والوں کے چہروں پر کبھی حزن کے بادل چھا جاتے، کبھی مسرت کی دھوپ چمک اٹھتی، اور کبھی امید کی کرنیں چمکنے لگتیں۔

جب سمیرا مائیک پر ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کی کہانی سنا چکی اس وقت رضوان ڈاکٹروں والا سفید کوٹ پہنے ہاتھ میں وائلن پکڑے اپنے باپو شیر و کمہار اور ماں نگو کے ساتھ پنڈال میں وارد ہوا۔ شیر و کمہار سفید رنگ کے کرتے اور دھوتی میں ملبوس تھا۔ اس نے سر پر سفید رنگ کی پنجاب کے محنت کشوں والی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ اس کا چہرہ مسرت کے بے پایاں احساس سے چمک رہا تھا۔ نگو سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔ اس کا سفید دوپٹہ اس کی گردن کے گرد بل کھا کر دونوں کندھوں سے اس کی چھاتیوں پر لٹک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی اور غمزدہ خاموشی کے تاثرات تھے۔

دیکھنے والوں کو اس کے چہرے کی اداسی اور غمزدہ خاموشی نے فوراً اپنی گرفت میں لے لیا۔ شیر و کے چہرے پر کھلتی مسرت ایک مطمئن باپ کے جذبات کی سچی جھلک تھی۔ لیکن نگو کے چہرے پر پھیلی اداسی اور غمزدہ خاموشی ایک ماں کے سچے جذبات نہیں تھے۔ بظاہراً ایسے موقع پر ماں کو باپ سے زیادہ خوش ہونا چاہیئے تھا لیکن یہاں تو صورت حال مکمل طور پر مختلف تھی۔

سمیرا نے رضوان، شیرو، اور نگو کی پنڈال میں آمد کے ساتھ ہی اعلان کیا کہ آج کے اہم ترین مہمان شیر و اور نگو پنڈال میں آ چکے ہیں اب وہ اپنے بیٹے ڈاکٹر رضوان کے ساتھ مجسموں کی نقاب کشائی کریں گے اور پھر آپ کے سامنے اسٹیج پر تشریف فرما ہوں گے۔ رضوان نے آگے بڑھ کر مجسموں سے متعلقہ انفارمیشن پلیٹ پر پڑے پردے کی ڈور اپنے باپو اور ماں کے ہاتھ میں تھمائی اور پھر ان سے کہا کہ وہ اسے کھینچ دیں۔ انہوں نے ڈور کھینچی تو پلیٹ پر پڑا مخملیں پردہ ہٹ گیا اور پلیٹ کے مندرجات نمایاں ہو گئے۔

اسٹیج پر اور پنڈال میں بیٹھے سب مردوں اور عورتوں نے کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں اور بلند آواز سے رضوان، شیر و اور نگو کو مبارک باد دی۔ مجسموں کی نقاب کشائی کے بعد تینوں اسٹیج پر رکھی اپنی مخصوص نشستوں پر آ کر بیٹھ گئے۔

سمیرا نے صدر پاکستان سمیت اسٹیج پر بیٹھے تمام حاضرین سے درخواست کی وہ اس اہم واقعہ کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار کریں۔

سمیرا کی درخواست پر سب نے رضوان، شیر و اور نگو کو اس عظیم کارنامے پر بے پناہ خراج تحسین پیش کیا۔

جب اسٹیج پر بیٹھے معزز مہمان اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے شیرو کا چہرہ مسرت کے جذبات سے موسم گرما کے سورج کی طرح تمتما رہا تھا۔

نگو کے چہرے پر کبھی کبھار مسرت کے جذبات ابھرتے لیکن اس میں درد اور غم کی لہریں واضح طور پر دکھائی دیتیں۔ پھر اچانک اس کی نگاہیں اگلی سیٹوں پر بیٹھے پیر سائیں کے گدی نشین پر ٹک گئیں اور اس کے چہرے سے کبھی کبھار ابھرنے والے مسرت کے جذبات بھی غائب ہو گئے۔

رضوان اپنی ماں کے چہرے پر ابھرتے اور ڈوبتے جذبوں کی کہانی مسلسل پڑھ رہا تھا۔ جب سارے

مہمان اپنے جذبات کا اظہار کر چکے تو سمیرا نے رضوان کو دعوت دی کہ وہ آگے آئے اور اپنے مہمانوں سے مخاطب ہو۔

رضوان بائیں ہاتھ میں وائلن اور دائیں ہاتھ میں باو پکڑے مائیک کے سامنے آیا اور اس نے سارے مجمع پر اچٹتی ہوئی نظریں دوڑائیں اور پھر کہنے لگا:

"جمال پور کے مکینو
تمیں میرا سلام
آج اس مٹی کا ایک بیٹا
ایک ڈاکٹر
ایک وائلنسٹ
تمہارے سامنا کھڑا ہے
میں کون ہوں
کیاہوں
کچھ نہیں جانتا۔
سرف اتنا جانتاہوں
کہ میں اس مٹی کا بیٹاہوں
تم سب بھی
اس مٹی کے بیٹے ہو
سب انسان
مرد اور عورتیں
صرف مٹی کے

بیٹے اور بیٹیاں ہیں
مذہب کیا ہے؟
رسم و رواج کیا ہیں؟
اقدار کیا ہیں؟
میں کچھ نہیں جانتا
صرف اتنا جانتا ہوں کہ مٹی
ہماری شکلوں میں ڈھلتی ہے
اور زندگی کی رو
ہمیں چراغوں کی طرح
روشن کر دیتی ہے
اس کے بعد
ہم مٹی کے بیٹے اور بیٹیاں
ایک دوسرے کے ساتھ
مذہب کے نام پر
رسم و رواج کے نام پر
اقدار کے نام پر
نظریات کے نام پر
کاروبار کے مفادات کے نام پر
سیاست کے نام پر
ریاست کے نام پر

کیا کرتے ہیں
کیسے ایک دوسرے کو
کانٹوں کے تاج
پہناتے ہیں
یا ایک دوسرے کو
خوشیوں کے پھولوں کے
تحفے پیش کرتے ہیں
اس سے ہماری زندگی
جنت بنتی ہے یا جہنم۔"

یہ کہہ کر رضوان نے وائلن کندھے پر سیدھی کی باؤ کو وائلن پر رکھا اور باؤ کو ہلکی سی حرکت دے کر دوبارہ گویا ہوا:

"جمال پور کے مکینو، ڈاکٹر رضوان نے جو کچھ کیا وہ ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کی شکل میں تمہارے سامنے ہے۔ تم سب کی زندگیاں اس ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کی وجہ سے مسلسل بہتر ہو رہی ہیں۔ اور دن بدن مزید بہتر ہوتی جائیں گی۔

لیکن آج اس مٹی کا بیٹا وائلنسٹ رضوان تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ میں نے دنیا میں کئی اہم مواقع پر ہزاروں اور لاکھوں لوگوں کے سامنے وائلن بجائی ہے۔

کبھی لاہور کے لوگوں نے میری وائلن سنی، کبھی نتھیا گلی کے جنگلوں کے جانور اس سے لطف اندوز ہوئے، کبھی نیویارک میں جنگ مخالف ہڑتالیوں کو اس سے قوت ملی، لیکن آج میں صرف اپنی ماں کے لیے وائلن بجانے جا رہا ہوں۔"

وہ یہ گفتگو کر رہا تھا اور ساتھ وائلن پر باؤ کی حرکت تیز ہو رہی تھی۔

"آج میری زندگی کا اہم ترین دن ہے۔ میرا باپو شیر و میرے کام کی اہمیت کو نہ سمجھنے کے باوجود انتہائی خوش ہے۔ خوشی سے اس کا چہرہ موسم گرما کے سورج کی طرح تمتمارہا ہے۔ لیکن میری ماں نگو اپنے دل پر رکھے برسوں کے بوجھ کی وجہ سے اس اہم موقع پر بھی مسکرانے سے قاصر ہے۔

آج میں اپنی وائلن سے اپنے ماں کے دل پر رکھے برسوں کے بوجھ کو دور کرنا چاہتا ہوں۔"

پھر وہ وائلن بجاتے بجاتے اپنی ماں سے مخاطب ہوا:

"اے میری پیاری ماں، جمال پور کے ان مکینوں کے سامنے، میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں اپنے باپو شیر و کمہار کا بیٹا اور محمد و کمہار کا پوتا ہوں۔ ایک ڈاکٹر کے طور پر میں جانتا ہوں کہ میرا وجود میرے باپو شیر و اور تمہارے وجود کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔

لیکن اس بھرے پنڈال میں، جمال پور کے سب باسیوں کے سامنے، تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو تمہارے دامن کی پاکیزگی اور حرمت میرے لیے ایسے ہی ہوتی جیسے اب ہے۔ تم اس زمین پر میرے لیے روح کائنات کا عکس ہو۔ تمہارا وجود میرے لیے مینارہ نور ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس معاشرے میں ایک عورت کے غریب، کمزور اور خوبصورت ہونے کا کیا مطلب ہے۔"

رضوان ابھی یہ باتیں کر رہا تھا کہ اگلی رو میں بیٹھے پیر سائیں کے گدی نشین نے اٹھ کر وہاں سے بھاگنا چاہا۔ پاس بیٹھے مولانا بندر اور ان کے ساتھیوں نے اسے پکڑنا چاہا تو رضوان نے انہیں منع کر دیا۔ پھر اس کے دائیں ہاتھ میں پکڑی باونے وائلن کی تاروں پر تیزی سے حرکت شروع کر دی۔

اسٹیج پر اور پنڈال میں بیٹھے سب لوگ وائلن کی دھنوں کی گرفت میں آ گئے۔ پیر سائیں کا گدی نشیں بھاگتا ہوا آیا اور اسٹیج کے سامنے آ کر رک گیا۔ لوگوں نے دیکھا اس کی جسمانی ہیت بدلنا شروع ہو گئی۔ اسٹیج پر اس کے باپو کے پہلو میں بیٹھی اس کی ماں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ سارے مجمع پر ایک سکتا طاری تھا۔ رضوان کی ماں روتے روتے اٹھی اور کہنے لگی:

"راجو، یہ سب مٹی کے بیٹے ہیں۔ انہیں معاف کر دو۔ یہ نادان اور ناسمجھ ہیں۔ نہیں جانتے کہ یہ جب ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں تو مٹی کو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ اس دکھ اور تکلیف کی وجہ سے آخر کار مٹی کو اپنے ان بیٹے بیٹیوں کو خود اپنے ہی دامن میں پناہ دینا پڑتی ہے۔"

ماں کے حکم پر اس نے اپنی وائلن کی دھنوں کو تبدیل کیا۔ پنڈال کے پیچھے کھڑے سب جانور اپنے اپنے انسانی وجودوں میں واپس لوٹ آئے۔

رضوان نے وائلن بجانا بند کی۔ آگے بڑھ کر اپنی ماں کو پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر اسے اپنے بازوں میں اٹھا کر ہسپتال کے رہائشی علاقے کے طرف چل دیا۔

شیر و کمہار، حیدر، مونا، سمیرا اور اس کی سہیلیاں بھی ہولے ہولے اُس کے پیچھے ہو لیے۔

ختم شد

کچھ مصنف کے بارے میں

خواجہ اشرف 1951 میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ 1971 میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کے بعد پہلے مختصر عرصہ کے لیے اسلام آباد میں پریذیڈنٹ سیکریٹریٹ میں کام کیا۔ پھر فیڈرل پبلک سروس کمشن سے انتخاب کے بعد پنجاب میں محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے اور پنجاب کے مختلف کالجوں میں بطور لیکچرار پڑھاتے رہے۔

لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ دورانِ تعلیم پاکستان کے مختلف اخبارات میں کے ایم اشرف کے نام سے سیاسی، سماجی اور ادبی موضوعات پر مضامین لکھے۔

پاکستان میں وزیر آغا کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی میگزین اوراق اور ہندوستان میں شمس الرحمٰن فاروقی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی میگزین شب خون میں کئی کہانیاں اور انشائیے لکھے۔

جنرل ضیاالحق کے مارشل لاء کے بعد 1981 میں امریکہ چلے گئے۔ امریکہ میں یونیورسٹی آف فنکس سے ایم بی اے کرنے کے بعد کاروباری دنیا سے وابستگی اختیار کی۔

امریکہ منتقلی کے بعد ضیا دور میں مختلف بین الاقوامی فورمز پر پاکستان میں بحالی جمہوریت کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ یہ جدوجہد مشرف دور میں بھی جاری رہی۔ اب بھی پاکستان میں جمہوریت کی نشوونما اور ترویج واشاعت سے خاص دلچسپی ہے۔

ادب میں ترقی پسند رجحانات کی طرف جھکاؤ ہے۔ وہ دو ناولوں 'مٹی کا بیٹا' اور 'نسل سوختہ' اور کہانیوں کے ایک مجموعے 'آئینہ کہانی' کے مصنف ہیں۔

نثری نظموں کا ایک مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ جلد شائع ہو جائے گا۔ تا حال لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔